ادبیات و شخصیات

مرزا جعفر حسین

ادبیّات و شخصیّات

مرزا جعفر حسین

بدّری ناتھ روڈ۔ لکھنو

اترپردیش اردو اکاڈمی کے مالی تعاون واشتراک سے شائع شدہ

ادبیات و شخصیات

اشاعت اول ---------------------- ۱۹۷۸ء

قیمت مجلد ---------------------- پندرہ روپیہ

کاتب ---------------------- مرزا وصی اللہ!

طابع ---------------------- نظامی پریس. وکٹوریہ اسٹریٹ. لکھنؤ

ملنے کا پتہ ---------------------- دانش محل. امین آباد. لکھنؤ

بدری ناتھ روڈ. گولا گنج. لکھنؤ

انتساب !

راقم کو طالب علمی کے زمانے ہی سے مضمون نگاری کا ذوق تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے متعدد اخباروں اور رسالوں میں بے شمار مضامین شائع ہو چکے ہیں اور اب بھی آج کل، نئی دلی، پاسبان، چندی گڑھ، تعمیر ہریانہ۔ چندی گڑھ، اندھرا پردیش، حیدرآباد، دنیا، آدور، لکھنؤ وغیرہم میں شائع ہوتے رہتے ہیں لیکن اس ہرزہ سرائی کو کبھی یک جا منضبط نہیں کر سکا نہ مسودات محفوظ رہ سکے۔ جو کچھ لکھا وہ بجنسہٖ اشاعت کیلئے بھیج دیا اور جو اعزازی شمارے موصول ہوئے وہ نذر احباب ہوتے رہے اس طرف کافی مدت سے بعض احباب کے متواتر مطالبے ہو رہے تھے کہ کوئی مجموعہ کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ مرحوم احتشام ماہلی کو خصوصیت کے ساتھ اس بارے میں بڑی فکر تھی لیکن یہ میری بد قسمتی تھی کہ ان کی حیات میں ایسی کوئی اشاعت ممکن نہیں ہو سکی۔ اب انھیں کی یاد میں چند مضامین متعلقہ جرائد کے شکریہ کے ساتھ ارباب ذوق کی خدمت میں پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔

مرزا جعفر حسین

فہرست مضامین

غالب کی فارسی شاعری

مرزا غالب کی شخصیت اور شاعری کے متعلق اب تک اتنا کہا اور لکھا جا چکا ہے جتنا غالباً کسی دوسرے ادیب یا شاعر کے بارے میں نہ کہا گیا اور نہ لکھا گیا۔ ان لکھنے والوں میں ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنی شکل و صورت غالب کے آئینہ میں اور بعض نے مرزا کی تصویر اپنے آئینہ میں دیکھی ہے لیکن پھر بھی کچھ ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے مرزا کو خود انھیں کے پرتو میں جلوہ فگن دیکھا ہے اور یہ سارا مواد مرزا کے اردو دیوان سے فراہم کیا گیا ہے۔ یوں تو ہمارے پاس ایک ضخیم اردو کا دیوان فراہم ہو گیا ہے مگر لکھنے والوں نے ہی زیادہ تر بلکہ قریب قریب ساری توجہ مختصر اردو دیوان ہی پر محدود رکھی ہے۔ اور اسی توجہ کی بدولت غالب کے شاعرانہ اور شخصی خد و خال ہمارے سامنے ہیں اس لئے کہنا پڑتا ہے کہ باوجود اتنے نقد و تبصرہ کے غالب کی شخصیت ابھی تک پوری طرح ہمارے سامنے نمایاں نہیں ہوئی ہے کیونکہ وہ خود اپنے اس دیوان کی قدر و قیمت کو "بے نیرنگ من است" کا ہم پلہ قرار دے کر یہ فرما گئے ہیں کہ "فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ" افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مرزا غالب کا فارسی کلام اب تک اس توجہ کا مرکز نہیں بن سکا جس کا وہ مستحق تھا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اب تک اس "عندلیب گلستان عجم" کو طوطی ہندوستان ہی ہونے کی فضیلت پر برقرار رکھنے میں قناعت کئے ہیں مرزا کو اپنے زمانہ کی روش کا احساس تھا اور وہ بجا طور پر اندازہ لگا چکے تھے کہ :-

شاہد مضمون کہ اینک شہری جاں و دل است — روستا آوارہ کام و دہن خواہد شدن

وہ شاہد مضمون کی مشاطہ آرائی فارسی طرز بیان سے فرما رہے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کے پیش نظر یہ حقیقت بھی تھی کہ اس ملک میں جس زبان نے شعر و ادب کو سنوارا تھا اور جس کی ابتدا ایک ترک لاچین (امیر خسرو) سے ہوئی تھی اس کا خاتمہ ایک ترک ایبک (غالب) پر ہو گا غالباً یہی احساس

ان کو مجبور کر رہا تھا جو وہ بار بار دکھ بھرے انداز میں ان خیالات کا اعادہ کر دیتے تھے

بود غالب عندلیبے از گلستان عجم　　　تا ز غفلت طوطیٔ ہندوستاں نامیدمش

ان کے اس اظہار خیال میں ہندوستان کی منقصت کا کوئی جذبہ کارفرما نہ تھا کیوں کہ ہم کو ان کے کلام میں ہندوستانی مناظر ہندوستان کے موسم ہندوستان کے دریاؤوں اور یہاں کے تمام ماحول و حالات سے بھرپور موانست کا جذبہ کارفرما ملتا ہے۔ دوسرے شاعروں نے گنگا اور جمنا کے تذکرے کئے ہیں لیکن مرزا کے یہاں اور دریاؤں سے بھی محبت کا پتہ چلتا ہے۔ ایک مقام پر کہا ہے "مرحبا سوہن وجاں بخشی آتش غالب۔ خندہ بر گمرہی خضر و سکندر دارم"۔ سوہن سے غالباً مراد دریائے سون ہے جس پر سے وہ کلکتہ کے سفر میں آتے جاتے ہوئے گزرے تھے۔ یہ سچ ہے کہ وہ اپنے ہم عصروں میں بہت سے لوگوں سے ناخوش تھے اور بہت سے ساتھیوں نے ان کو دکھ پہونچائے تھے۔ اور ہوتے ہوتے وہ انسانوں ہی کی صورت سے بیزار ہو گئے تھے۔ اردو میں بھی انھوں نے کہا تھا کہ "پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد۔ ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں"۔ اس جذبہ کی ترجمانی فارسی میں بھی برابر ملتی ہے لیکن اسی کے ساتھ ہند کی محبت بھی برقرار رہتی ہے فرماتے ہیں ؎

سخن نیست در لطف ایں قطعہ غالب　　　بہشتے بود ہند کادم ندارد

سچ پوچھئے تو اس ملک میں بسنے والے بہت سے صاحبان فکر و نظر کو یہی شکایت رہی ہے اور اب بھی موجود ہے کہ بات کرنے اور دوستی نبھانے کے لئے آدمی نہیں ملتا۔ لیکن اس نایابی کے باوصف ہندوستان ہمیشہ جنت نشان رہا اور اب بھی ہے۔ البتہ فارسی زبان کے ساتھ جو مدتوں سے بے توجہی رہی ہے اور جو اب بڑھ کر اردو کے ساتھ جائز رکھی جا رہی ہے وہ کسی طرح بھی زبان دانی اور سخن فہمی و سخن سنجی کے حق میں فال نیک قرار نہیں پا سکتی۔

فارسی زبان میں مرزا غالب نے گنجینۂ معنی کا ایک ایسا طلسم چھوڑا ہے جس سے لطف اندوز نہ ہونا ہماری بے بضاعتی اور کم نصیبی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ فارسی کلیات ایک ایسا خزانہ ہے جس میں طرح طرح، رنگ برنگ نو بہ نو بو کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ ہر صنف شعر میں مرزا نے طبع آزمائی کی ہے اور ہر منزل کو کمال

تک پہونچایا ہے۔ اس مجموعہ کا تجزیہ واضح کرتا ہے کہ اس میں چھیاسٹھ قطعات ایک مخمس، تین ترکیب بند ایک ترجیع بند، گیارہ مثنویاں، مغنی نامہ، ساقی نامہ، چونسٹھ قصائد تخمیناً تین سو گیں غزلیات اور ایک سو چار رباعیات شامل ہیں۔ قطعات میں پانچ نوحہ جات ہیں جو واقعہ کربلا سے متعلق کہے گئے ہیں۔ مخمس اور ایک ترکیب بند حضرت علیؑ کی منقبت میں ہے مثنویوں میں ہر ایک اپنے مخصوص طرز ادا اور طرح فکر کی مالک ہے۔ مرزا نے مثنویوں کے نام بھی مضامین کی مناسبت سے رکھے ہیں۔ چنانچہ ابتدائی پانچ مثنویوں کے نام سرمہ بینش، درد و داغ، چراغ دیر، رنگ و بو، اور باد مخالف اسم با مسمیٰ ہیں۔ گیارھویں اور آخری مثنوی ناتمام ہے یا ناتمام قرار دی گئی ہے اس کا نام ابر گوہر بار رکھا ہے اور مضامین کے اعتبار سے حمد و نعت و منقبت پر مشتمل ہے۔ حمد ہی میں مرزا نے درگاہ احدیت میں اپنے نامۂ اعمال کے بارے میں صفائی پیش کی ہے اس سلسلہ میں بادہ خواری پر بازپرس ہونے میں جو جواب دہی کی گئی ہے وہ صرف غالبؔ کے ایسے قادر الکلام اور ندرت خیال رکھنے والے شاعر کا حصہ ہو سکتا تھا چند اشعار درج ذیل ہیں

درین خستگی پوزش از من مجوئے بود بندۂ خستہ گستاخ گوئے
دل از غم خوں شد نہفتن چہ سود چو ناگفتہ دانی نہ گفتن چہ سود
ہمانا تو دانی کہ کافر نیم پرستار خورشید و آذر نیم
مگر مے کہ آتش بگورم از وست بہ ہنگامہ پرواز مورم از وست
من اندوہگیں و مے اندوہ ربائے چہ میکردم اے بندہ پرور خدائے
حسابے و رامش و رنگ و بوئے ز جمشید و بہرام و پرویز جوئے
کہ از بادہ تا چہرہ افروختند دل دشمن و چشم بد سوختند
نہ از من کہ از تاب مے گاہ گاہ بدریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ
شبانگہ بمے رہنمونم شدے سحرگہ ملیگار خونم شدے
تمنائے معشوقۂ بادہ نوش تقاضائے بیہودۂ مے فروش

اس تمام مثنوی میں جو ناتمام ہونے کے باوصف بہت لمبی چوڑی ہے ایک نادر المثال خصوصیت

وہ ربط مضامین ہے جو حمد و نعت و منقبت کے درمیان شاعر نے پیدا کیا ہے۔ مقام حمد میں اپنے گناہوں کی معافی پیش کرتے کرتے کہتا ہے کہ "البتہ ایں رند ناپارسا۔ کج اندیشہ گبر مسلماں نما۔ پرستار فرخندہ منشور تست۔ ہوادار فرزانہ دستور تست" اور اس کے بعد ہی اس فرخندہ منشور کی وضاحت میں نعت رسول شروع ہو جاتی ہے نعت ہی میں معراج کا بیان پوری وضاحت کے ساتھ ہوتا ہے اور شب معراج کی صبح ہونے پر۔

سحر گہ کہ وقت سجودش رسید ز ہمنام یزداں درودش رسید

شب از بادۂ قدس ساغر گرفت صبوحی ز دیدار حیدر گرفت

اور اس کے بعد منقبت کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے :-

ہزار آفریں بر من و دین من کہ منعم پرستیت آئین من

قصائد کا مجموعہ خیال آفرینی اور بلاغت کلام میں آپ اپنی مثال ہے۔ اس مجموعہ میں پہلا قصیدہ حمد باری تعالیٰ میں ہے کچھ قصیدے نعت، منقبت اور دوسرے بزرگان دین کی شان میں ہیں لیکن بہتات ایسے قصیدوں کی ہے جو بادشاہ وقت حاکم زمانہ اور صاحبان دولت و ثروت کی مدح میں لکھے گئے ہیں زبان و ادب کی خوبیوں نے کردار کی ان گہرائیوں پر پردے ڈال دیئے ہیں جو ان قصائد کے پس پشت اب بھی جھلکتے نظر آتے ہیں۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک بہت بلند کردار رکھنے والے کو حالات روزگار نے اتنا کچل دیا تھا کہ وہ دوسروں کی سردربار مدح کرنے ہی کو اپنی کفالت اور رفع حاجات کا وسیلہ بنانے پر مجبور ہو گیا تھا ان میں بہت سے قصیدے انگریز حاکموں کی مدح میں بھی ہیں ان کا مطالعہ کر کے غیرت کے ماتھے پر عرق آجاتا ہے اور شرافت کی آنکھیں آبدیدہ ہو جاتی ہیں۔ جن لوگوں کے پیش نظر تاریخ کے وہ اوراق ہیں جن میں جہانگیر اور شاہجہاں کی ادب نوازی اور باکمال لوگوں پر گرم گستری کی داستانیں زریں حروف میں جھلک رہی ہیں ان کی آنکھیں ان قصائد کو پڑھ کر خون کے آنسو بہانے پر مجبور ہو جاتی ہیں اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ۔

آں کو عطوفت باخدا ہرگز نہ کردے التجا نالاں بہ پیش ہر کسے از جور افلاک ستمگر

مرزا کا یہ شعر ان کے حسب حال ہی نہیں بلکہ اس زمانے کی ان مجبوریوں کا جو باکمال لوگوں پر دفعتاً نازل ہو گئی تھیں ایک عبرتناک مرثیہ ہے

کلیات غالب میں قصائد کے بعد غزلیات آتی ہیں۔ غزل اس زمانے میں وہ واحد صنف سخن تھی جس میں زندگی کے ہر شعبہ کی عکاسی ہوتی تھی اور تمام باکمال شعراء اپنے فنی کمالات کا مظاہرہ اسی صنف میں کرتے تھے مرزا غالب نے بھی اپنی اردو غزلیات کے سہارے ہر دلعزیزی اور عدیم المثال مقبولیت حاصل کی ہے لیکن ان کے فارسی غزلیات میں فصاحت، بلاغت، حسن و عشق کی داستانیں لیلےٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کے قصے خضر و سکندر کی داستانیں، تصوف و حکمت، اخلاقیات و مابعد الطبیعیات، جینے کے سلیقے، مرنے کی ادائیں غرضیکہ انسانی زندگی کی ساری حکایتیں انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ ملتی ہیں۔ قصائد کے مجموعے میں جو غالب ارباب جاہ و جلال کی تہرا و جبرا مدح سرائی کرتے نظر آتے ہیں وہی غزل میں یہ سناتے ہیں کہ "انظار فروزاد اہا بدشمن ارزانی ۔ من سپار اگر داغ سینہ تابے ہست" یا یہ کہ "خارہا در رہ سودا زدگان خواہد ریخت ۔ ورنہ در کوہ و بیاباں بچہ کار است بہار۔ یہی نہیں بلکہ وہ خار چینی کا مشغلہ آنے والوں کی سہولت و آرام کے لئے اختیار کرتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ

خارہا از اثر گرمی رفتارم سوخت منتے بر قدم راہ روانست مرا

یا اسی مضمون کو اس سے بہتر طریقہ پر یوں کہا ہے۔

آغشتہ ایم ہر سر خارے بخون دل قانون باغبانی صحرا نوشتہ ایم!

غم میں لذت اور تکلیف میں آرام حاصل کرنے کی اس سے بہتر تلقین ناممکن ہے کہ

سبکہ زیست بدریوزہ طرب رفتن خوشا دلے کہ باندوہ محتشم گردد

مرزا کے کلام اور ان کے مزاج کی یہ ایک حیرت خیز حقیقت ہے کہ وہ ہر عالم اور ہر حالت میں رجائیت کو اپنا شعار بنائے رکھتے تھے اور قنوطیت کو قریب نہیں آنے دیتے تھے ان کا یہی گراں قدر پیغام محنت کش عوام اور مفلس و نادار طبقہ کو سہارا دیتا ہے فرماتے ہیں:۔

فرصت از کف مدہ و وقت غنیمت پندار نیست گر صبح بہاری شب ماہی دریاب

یا اسی طرح کہہ گئے ہیں کہ

از مژہ ہر موئے چشمہ خون باز کشادم — آرائشِ بستر بہ شفق می کنم امشب

لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور خضر و سکندر کی کہانیاں ہر شاعر کے یہاں ملتی ہیں۔ مرزا غالب نے فارسی کلام میں خضر کو نئے انداز میں یاد کیا ہے فرماتے ہیں

تا خود از بہر نثار کیست می میرم ز رشک — خضر و چندیں کوشش عمر دراز آوردنش

دوسری جگہ پر خضر کی روپوشی کو راحت جاوید حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ مرزا بہت دکھ رسیدہ انسان تھے اور دنیا بھر سے غیر متعلق اور علیحدہ زندگی بسر کرنے کو سکون دماغ کا وسیلہ بنانے کے خواہشمند رہے چنانچہ کہتے ہیں

راحت جاوید ترک اختلاط مردم ست — چوں خضر باید ز چشم خلق پنہاں زیستن

مرزا غالب فقہ کی تعریف میں مرد شریعت نہیں تھے لیکن تصوف و تکشف میں فرد دستگاہ تھی بادہ خوار نہ ہوتے تو ممکن ہے کہ ولی ہوتے لیکن زہد کے بدلے بے ریائی تھی اور مرد خراب بھی ایسے تھے جیسے مردانِ باصفا پیدا نہیں ہو سکے ایک طرف ان کو اس بات پر قلق تھا کہ

بر ننگ ما نگیم رحم کہ یک عمر گناہ — ہم تاراج سبکدستی بخشودن رفت

تو دوسری طرف یہ کہہ اٹھتے تھے کہ

ممکن کو نہ مرا ہم دل بتقوی مائل است اما... ز ننگ زاہد اقدام بہ کافر ماجرائیہا

حسن و عشق کے معاملات ہر غزل گو شاعر نے اپنے مخصوص انداز فکر میں پیش کئے ہیں اور اب بھی کئے جاتے ہیں لیکن مرزا کی ندرت تخئیل اپنی آپ مثال تھی۔ اردو ہو یا فارسی دونوں زبانوں میں انھوں نے اپنے محبوب کی شوخی و چابک دستی کی تعریف میں جو تصویریں پیش کی ہیں وہ دوسروں کے یہاں مبتذل ہو جاتیں لیکن مرزا کے یہاں ایسا ابتذال بھی شوخی و چابک دستی کی تعریف تک محدود رہتا ہے اور اس میں وہ لذت ہے جو کسی دوسرے کے کلام میں نہیں ملتی فرماتے ہیں۔

جاں میدہم از رشک بشمشیر چہ حاجت — سرپنجہ بہ دامن زن و دامن بہ کمر بہ

دوسرے مصرع میں معشوق کی بے تحاشا بھیانک تصویر پہلے مصرع کی لطافت و بے ساختگی کی بدولت پاکیزہ سے پاکیزہ تر ہو جاتی ہے اس کے علاوہ معشوق سے تخاطب کا انداز جو مرزا کو حاصل تھا وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا اس سلسلہ میں بھی ایک شعر بہت سی لطافتوں کا حامل ہے۔

چہ عیش از وعدہ چوں باور عنوانم نمی آید — بنوعے گفت می آیم کہ میدانم نمی آید

اسی طرح محبت کے تقاضوں کی ترجمانی بھی اس شعر سے بہتر کہیں اور ممکن نہیں۔

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد — ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

عاشق کی نیازمندی اور معشوق کی بے نیازی ہمیشہ ضرب المثل رہی ہے اور ان کیفیات کو شاعروں نے مختلف انداز میں بیان کیا ہے لیکن کہتے ہیں کہ "غالب کا ہے انداز بیاں اور" وہ عاشق کی نیازمندی اس طرح بیان کرتے ہیں کہ

نیازمندی حسرت کشاں نمیدانی — نگاہ من شو و دزیدہ دیدنم بنگر

اس ایک شعر میں عاشق کی تمام حسرتیں اپنی پوری برنائی کے ساتھ سامنے آجاتی ہے اسی کے ساتھ بے ساختہ یہ شعر بھی زبان پر آجاتا ہے جو عاشق کی آخری حسرت کی تصویر کشی کرتا ہے ؛

خیز و در ماتم ما سر فرو شوے ترشیم — وقت مشاطگی حسن خداداد آمد

عشق و محبت کے سلسلے میں مرزا غالب کو جذبہ رشک کی ترجمانی کرنے میں وہ کمال حاصل تھا جو کسی دوسرے شاعر کو کسی دوسری زبان میں کبھی حاصل نہیں ہوا اردو غزلیات میں رشک سے متعلق بے مثل اشعار موجود ہیں جن میں بہت سے زبان زد خلائق ہیں فارسی میں بھی ایسے اشعار کی بہتات ہے لیکن فارسی میں ایک ایسی مخصوص تخلیق مرزا کے دماغ کی ملتی ہے جس کا جواب غالباً کہیں اور کسی شاعری میں نہیں ملے گا اور وہ ہے جذبہ رشک جو معشوق کے دل میں عاشق کے لئے پیدا ہوتا ہے یہ جذبہ کسی بھی سطح سے تعلق نہیں رکھتا۔ مرزا کے یہاں ابتذال ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ جذبہ لطیف بھی ہے اور بلند بھی۔ قابل احترام بھی اور لائق پرستش بھی اس لئے کہ محبت اپنی جگہ پر خود ایک دین ہے جس کے ارکان مذہب و شریعت کی بنیادوں سے علیحدہ قائم ہوتے ہیں۔ مرزا محبوب کے جذبہ رشک کی ترجمانی

کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی اسے مادیت و جسمانیت کی آغشتگی سے محروم نہیں کرتے فرماتے ہیں

نخوت نگر کہ می خلد اندر دلش ز رشک حرفے کہ در پرستش معبود می رود

مرزا کے کلام کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ اپنی جودت طبع اور ندرت خیال کے ماتحت اگر وہ کسی خاص موضوع پر طبع آزمائی کرتے تھے تو اسی موضوع کو بار بار کہتے تھے جب تک ان کے فکر و خیال کو آسودگی نہیں ہوجاتی تھی۔ ایسی بکثرت مثالیں ان کے کلام میں موجود ہیں لیکن اس مقام پر ایک خیال کو دوسری طرح سے کہنے کی صرف ایک مثال پیش کردینا کافی ہوگا۔ کہتے ہیں

زندہ زار شیوہ را طاعت حق گراں نبود لیک صنم بسجدہ در ناصیہ مشترک نخواست

غالب کے پیش نظر تمام اساتذہ کا کلام تھا۔ اور انھوں نے سب کا دقیق مطالعہ کر لیا تھا جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے مقتدر شعراء کی بہترین غزلوں کی قریب قریب تمام ممتاز زمینوں میں سب ردیف و قوافی کو سامنے رکھ کر طبع آزمائی کی تھی۔ عرفی کا ایک مقطع میں انھوں نے اس طرح ذکر کیا ہے کہ یہ قافیہ غالب چو نیست پرس ز عرفی گر من فرہنگ بودے چہ غم ستے" اسی طرح عرفی کی مایۂ ناز غزل پر جس کی ردیف آتش ست ہے طبع آزمائی کرتے ہوئے مقطع کہا ہے کہ گشتہ ام غالب طرف باشرب عرفی کی گلفت۔ روے دریا سلسبیل و اقو دریا آتش ست " اس ردیف و قافیہ میں عرفی کے علاوہ ظہوری اور بیدل کی بھی غزلیں موجود ہیں لیکن عرفی کی غزل اپنا مثل و نظیر نہیں رکھتی اور تقریباً زباں زد ہے۔

اس مقام پر یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ عرفی کے بہترین غزلوں میں اس غزل کا شمار ہے لیکن غالب کی اس غزل کو عرفی "بہ طرح عرفی" کہا جاسکتا ہے۔ ان کے فکر و ذوق کی ایجاد نہیں تھی۔

عرفی سے زیادہ ظہوری کی طرح مرزا کی طبیعت بھی دقیقہ سنج تھی اور دونوں ندرت خیال پیدا کرنے کے دلدادہ تھے۔ مرزا دوسرے اساتذہ کے مقابلہ میں ظہوری کا احترام بھی زیادہ کرتے تھے۔ کم سے کم آٹھ مقطعوں میں ظہوری کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا جن میں سے تین مقطع یہ ہیں " بہ نظم و نثر مولانا ظہوری زندہ ام غالب۔ رگ جاں کردہ ام شیرازہ اوراق کتابش را (۲) غالب از جوش دم عارف ستم گبوش یاد۔ پردہ ساز ظہوری را گلی افشاں کردہ ایم (۳) ہمزبانم با ظہوری مطلع کو تاز شوق۔ با جرس در نالہ آواز

بہاواز انگنم"۔ لیکن پھر بھی مرزا نے ظہوری کی زمینوں میں نسبتاً کم غزلیں کہی ہیں اور کم سے کم تین غزلیں تو ایسی ملتی ہیں جن میں مرزا نے ظہوری سے علیحدہ ہو کر طبع آزمائی کی ہے۔ مثلاً ظہوری کے یہاں دو غزلیں ایسی ہیں جن کے ردیف و قوافی "آستانش را" اور "رانگانش را" ہیں ان غزلوں کے بعض اشعار یہ ہیں:۔

شب از مژگان تر رفتم غبار آستانش را — پشیمانم کہ کارے یاد دادم پاسبانش را

نگزدی بتیوئے کاش پیش سخت جانِ خود — کہ دیدے باوجود ناتوانیہا توانش را

بجاہ عشق با سرمایۂ دارم سر سودا — کہ صد جان ست قیمت یک نگاہ رانگانش را

مرزا نے ان قوافی سے اجتناب کیا اور "تابش را نالیش را" کے قوافی و ردیف میں غزل کہی حالانکہ مقطع میں ظہوری کو یاد کیا ہے اور اس غزل پر ظہوری کا رنگ بھی چھایا ہوا ہے۔ کہتے ہیں۔

ندانم چیہ برق فتنہ خواہد ریخت بر ہوشم — تصور کردہ ام بگسستن بند نقابش را

سوار توسن ناز ست و بر خاکم گزر دارد — بیال اے آرزو چندانکہ دریابی رکابش را

خیالش صید دام پیچ و تاب شوق بود انا — من از مستی غلط کردم بشوخی اضطرابش را

اس غزل کے علاوہ دو غزلیں ایسی ہیں جن میں ایک میں ردیف اور دوسری میں بحر بدل کر مرزا نے طبع آزمائی کی ہے۔ ان غزلوں کا موازنہ بیحد پر لطف ہے ظہوری فرماتے ہیں

از دم تیغ نگاہ تن بہ تپیدن دہم — سر بہ حیرت کشم دیدہ بہ بریدن دہم

بند نقابے کشم تیغ و ترنج آورم — یوسف و یعقوب را کف بہ بریدن دہم

گو شر داماں آہ ماند نہ کوہ ضعف — اشک سبک گام را پائے دویدن دہم

تو بہ پرہیز را کردہ شکستن درست — مخفر ناموس را زیب دریدن دہم

آمدہ نزدیک لب حرف کسے دور نیست — کہ بن ہر موئے را گوش شنیدن دہم

مرزا غالب نے "دہیم" کی ردیف میں غزل کہی ہے جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں

سوخت جگر تا کجا رنج چکیدن دہیم — رنگ شو اے خون گرم تا بہ پریدن دہیم

جلوہ غلط کردہ اند رخم کشا تا ز مہر — ذرہ و پروانہ را مژدہ دیدن و ہیم

سبزۂ ما در عدم تشنۂ برق بلاست | در رہ سیل بہار شرح دمیدن دہیم
شیوۂ تسلیم ما بودہ تواضع طلب | در خم محراب تیغ تن بخمیدن دہیم
خیز کہ راز درون در جگر نے دہیم | نالۂ خود را ز خویش داد شنیدن دہیم

دوسری غزل میں بحریں بدلی ہوئی ہیں۔ ظہوری کی بحر چھوٹی اور غالب نے بڑی بحر میں طبع آزمائی کی ہے ظہوری کہتے ہیں۔

غم نشد عشرتے از خوار پئے | گشت آساں بود گر دشوار پئے
از روئے یار پئے دارم زیار | کاش می آمد ز من اغیار پئے
بیم علاجم در خوش آمد ہائے غیر | عشق دارد نیز دنیا دار پئے

مرزا غالب فرماتے ہیں۔

کافرم گر از تو باور آمدم غمخوار پئے | آزمند انتقام گردہ ذوق خوار پئے
شاد باش اے غم ز بیم مرگ ایمن ساختی | گشت صرف زندگانی بود گر دشوار پئے
با خرد گفتم چہ باشد مرگ بعد از زندگی | گفت بے خواب گرانے از پس بیدار پئے

نظیری کا کلام حسن و عشق کی منزلوں کا بہترین ترجمان ہے ظہوری کی طرح نظیری کے یہاں دقیقہ سنجی نہیں لیکن معاملہ بندی میں نظیری اپنی آپ مثال تھا اس کے کلام میں جو لذت، حلاوت اور چاشنی ہے وہ دوسروں کے یہاں نہیں ملتی مرزا اس نعمت کے بھی دلدادہ تھے یہی وجہ تھی کہ انھوں نے نظیری کا تذکرہ ظہوری کی طرح اگر بہ اہتمام نہیں کیا تو قدردانی اور مرتبہ شناسی کو بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا مرزا کے آٹھ مقطعوں میں چار اس لئے خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں کیونکہ ان کے دوسرے مصرعے نظیری ہی سے حاصل کردہ ہیں۔ فرماتے ہیں۔

ز فیض نطق خویشم با نظیری ہم زباں غالب | چراغ را کہ دودے ہست در سر زود در گیرد
بعرض عذر نظیری وکیل غالب بس | اگر تو نشنوی از نالہ ہائے زار چہ حظ
غالب شنیدہ ام ز نظیری کہ گفتہ است | نالم ز چرخ گر نہ بر افغاں خورم دریغ

جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب　　خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

ان چاروں مقطعوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ غالب نظیری کے پرستار تھے اور ان کے مد مقابل ہوتے ہوئے بھی سمجھتے تھے کہ وہ خواجہ نظیری کا جواب لکھ سکتے ہیں اور لکھ رہے ہیں۔

مرزا غالب نے بکثرت غزلیں نظیری کے جواب میں لکھی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ مرزا کی بعض غزلیں نظیری کے مقابلہ میں پھیکی ہیں جن میں خصوصیت کے ساتھ اس کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ جس کے قوافی و ردیف میں "زمانے را آزردہ جانے را" لیکن پھر بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ اگر حسن و عشق کی داستان سرائی میں نظیری کا پلہ بھاری ہے تو مرزا کی غزل بھی بلندی تخیل میں اپنا آپ جواب ہے۔ اسی طرح کئی غزلیں ایسی بھی ہیں جہاں نظیری کے مقابلے میں مرزا کا پلہ بھاری نظر آتا ہے مثال کے طور پر

نمک نخواست گزک نخواست　　　　استخواں برخیزے چکان برخیز

یا اسی طرح کئی دوسری غزلوں کو مرزا کے دیوان سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ ایک مختصر مضمون میں عرفی، ظہوری، نظیری، اور غالب کے ہم طرح غزلیات کا موازنہ ناممکن ہے۔ بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ بعض طرحوں میں ان تمام اساتذہ نے پوری قوت کے ساتھ طبع آزمائی کی ہو۔ اس کے علاوہ ہر موازنہ کرنے والے کا مذاق بھی اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔ ان تمام حالات کے پیش نظر چند غزلیات کا حوالہ دینا کافی ہوگا جو ان تمام اساتذہ کے یہاں بحر، ردیف اور قوافی کے لحاظ سے ہم طرح ہیں۔ ان کا مطالعہ خود اپنی جگہ پر ادبی ذوق کی تسکین کے لئے کافی ہے۔

(۱) استغفار ما، پندار ما، کے ردیف و قوافی میں عرفی، نظیری، ظہوری اور غالب کی ہم طرح غزلیں ہیں۔

(۲) "جلوہ گاہ کیست، گناہ کیست" کے ردیف و قوافی میں عرفی، نظیری، اور غالب کی ہم طرح غزلیں ہیں

(۳) "قاتل ست، محمل ست" کے ردیف و قوافی ہیں۔ نظیری، بیدل، اور غالب کی غزلیں ہیں۔ نظیری کی غزل اپنا جواب نہیں رکھتی۔

(۴) مانند ست، ارزومند ست" اس طرح میں عبدالرحیم خانخاناں کی غزل شہرۂ آفاق ہے۔ مرزا نے بھی

بہت اچھی غزل کہی ہے اور ان کے علاوہ نظیری اور ظہوری کی بھی غزلیں موجود ہیں

(۵) آشنا خفتست، تنہا خفتست، اس ردیف و قوافی میں نظیری اور غالب کی غزلیں ہیں لیکن نظیری کے اس شعر کا جواب نہیں ملتا۔

شب ابلہ از روز عید نمی گزرد کہ آشنا بہ تمنائے آشنا ... خفتست

(۶) زسیل افتادست، ساحل افتادست، اس رنگین طرح میں عرفی، نظیری اور ظہوری بیدل اور غالب سب ہی نے پوری طاقت صرف کردی ہے۔ ان غزلوں کا مطالعہ ان پانچوں اساتذہ کے علیحدہ علیحدہ افتادِ مزاج کو واضح کرتا ہے۔

(۷) ادبیست نسبیست عرفی، نظیری اور غالب کی ہم طرح غزلیں ہیں لیکن عرفی کا یہ شعر لاجواب ہے

قبول خاطر معشوق شرط دیدارست بحکم شوق تماشا مکن کہ بے ادبیست

(۸) سبوکنند بار فوکنند، کے ردیف و قوافی میں عرفی ظہوری نظیری اور غالب سب نے اپنا اپنا زور قلم صرف کردیا ہے۔

(۹) اب شستہ ایم، تخواب شستہ ایم، کے ردیف و قوافی میں عرفی نظیری، ظہوری اور غالب سب ہی کی ہم طرح غزلیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی ردیف کیساتھ ہر ایک نے بلند پروازی کی ہر امکانی کوشش کی ہے۔ سیما نوشتہ ایم، پا نوشتہ ایم، نظیری، بیدل اور مرزا غالب ان تینوں کی بہت عمدہ غزلیں ہیں جن کے بعض اشعار درج ذیل ہیں۔

قاصد بہوش باش کہ بہر یک جواب تلخ عرض ہزار گونہ تمنا نوشتہ .. ایم

روئے نکو معالجہ عمر کوتہ ہست این نسخہ از علاج مسیحا نوشتہ ایم

ہر گہ کہ کردہ ایم رواں کشتی امید طوفاں بہ بادِ شور بہ دریا نوشتہ ایم

تحقیق حال ما زنگہ میتواں نمود حرفے زحال خویش بہ سیما نوشتہ ایم

نظیری

دیگر ز نقش نامۂ اعمال ما مپرس نظارہ بلوح تماشا نوشتہ ایم

در مکتب نیاز چہ حرف و کدام صوت — چوں نامہ سجدہ ایست کہ ہر جا نوشتہ ایم
بیدل مآلِ سرکشی اعتبار ما — پیش از فنا ز نقش کفِ پا نوشتہ ایم

بیدلؔ

عنوان راز نامۂ اندوہ سادہ بود — سطر شکست رنگ بہ سیما نوشتہ ایم
دارد درخت بخون تماشا خطے ز حسن — روشن سواد ایں ورق نا نوشتہ ایم
رنگ شکستہ عرض سپاس بلائے تست — پنہاں سپردۂ غم و پیدا نوشتہ ایم
کو بیت ز نقش جبہ ما یک قلم بدست — لختے سپاس ہمدمی پا نوشتہ ایم
آغشتہ ایم ہر سر خارے بخون دل — قانون باغبانی صحرا نوشتہ ایم — غالبؔ

متذکرہ بالا غزلیات کے علاوہ متعدد غزلیں نظیریؔ اور غالبؔ کے یہاں ہم طرح ملتی ہیں جن میں سے بعض جگہ تو نظیریؔ تو ... بعض مقامات پر غالبؔ کا پلہ بہت بھاری نظر آتا ہے۔

غالبؔ نے ابتداءً مرزا بیدلؔ کی پیروی اپنا مسلک بنایا تھا۔ چنانچہ بیدلؔ کا رنگ ان کی ابتدائی اردو شاعری پر بھی چھایا ہوا تھا۔ فارسی میں بھی بیدلؔ سے متاثر تھے۔ اس سلسلہ میں غالبؔ اور بیدلؔ کے کلام سے کچھ ہم طرح اشعار پیش کر دینا کافی ہوگا۔

نکن ناز و دا چندیں دے بستاں جانے نم — دماغ نازکی من برنمی تابد تقاضا را
خیالش را بساطے ہر با انداز می جستم — پسندیدم بہ مستی مخمل خواب زلیخا را
بہارانست و خاک از جلوۂ گل اتلاف دارد — برگ نشتر زن از موج خرام ناز صحرا را — غالبؔ

نزاکت ہاست در آغوش مینا خانۂ حیرت — مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگ تماشا را
بہر موج تبسم دا کردم نگہ وقف خطا کردم — نمی دانم چہ پیش آید من غفلت تقاضا را
ز عیش رست اگر چون شیشہ ئے قلقل ابہ معظم — شکست دل صدائے بنیاد رنگ تماشا را — بیدلؔ

دوسری مثال ملاحظہ ہو:۔

نشد روزے کہ سازم طرہ اجزائے گریباں را   بہ بزمِ چاکہا چوں شانہ ماندہ از نارسائیہا
چہ خوش باشد دو شاہد را بہ بحث ناز پیچیدن   نگہ در نکتہ زائیہا نفس در سرمہ سائیہا
سخن کوتہ مرا ہم دل بہ تقویٰ مائل ست اما   زننگ زاہد افتادم بکافر ماجرائیہا   غالب

اثر گم کردہ آہنگم مپرس از عندلیب من   دریں گلشن نفس می سوزم از آتش نوائیہا
کہ یارب مباد افسردہ نیرنگ خود داری   شرارم سنگ شد از کلفت صبر آزمائیہا
غبار انگیز شہرت نیست وضع خاکسار من   خروشے داشتم گم کردہ ام در سرسائیہا   بیدل

ایک اور مثال درج ذیل ہے :-

عالم آئینہ راز ست چہ پیدا چہ نہاں   تاب اندیشہ نداری بہ نگاہے دریاب
گر بہ معنی نہ رسی جلوۂ صورت چہ کم ست   خم زلف و شکن طرف کلاہے دریاب
داغِ ناکامی حسرت بود آئینۂ وصل   شب روشن طلبی روز سیاہے دریاب   غالب

فال تسلیم زن و شوکت شاہے دریاب   گردنے بشکن و معراج کلاہے دریاب
چہ وجود و چہ عدم لبت کشا و مثرہ است   چوں شرر ہر دو جہاں را بہ نگاہے دریاب
یوسفی کن اگر اسباب مسیحائی نیست!   بہ فلک گر نہ رسد بے بن چاہے دریاب   بیدل

آہستہ آہستہ مرزا پر بیدل کا رنگ گھٹتا گیا اور وہ مزاج ابھرتا گیا جو مرزا کا اپنا طرۂ امتیاز تھا۔ بالآخر اسی رنگ کو ہم غالب کا رنگ کہنے لگے۔ یہ رنگ غزلیات اور قصائد دونوں میں پوری آب و تاب کے ساتھ ضوفگن ہے۔ غزلیات میں نظیری اور ظہوری کے کلام مرزا کی ابتدائی رہنمائی کے باعث ہوئے لیکن قصائد میں صرف عرفی سے اکتساب فیض کیا تھا۔

عرفی بہ حیثیت قصیدہ گو کے بھی ممتاز تھا۔ اور اس کے قصیدے باوجودیکہ ان میں تغزل کوٹ کوٹ کے بھرا ہے قصائد کی صنف میں اعلاترین درجہ رکھتے ہیں لیکن مرزا نے قصیدہ گوئی میں بھی عرفی

سے ٹکرلی ہے۔ بہت سے قصیدے دونوں اساتذہ کے ہم طرح ہیں جن میں دو قصیدوں کے مطلع حسب ذیل ہیں:۔

صبحدم چوں در دمد صور شیون زائے من — آسماں صحن قیامت گردد از غوغائے من — عرفی

زاں نمی ترسم کہ گردد قعرِ دوزخ جائے من — وائے گر باشد ہمیں امروز من فردائے من — غالب

اقبال کرم می گزد ارباب ہمم را — ہمت نخورد نیشتر لا و نعم را — عرفی

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را — خواہم کہ دگر بتکدہ سازند حرم را — غالب

ان دونوں مطلعوں کا موازنہ عرفی اور غالب کے علیحدہ علیحدہ طرزِ فکر اور شوخیِ ادا کی بہترین مثال ہے جہاں تک تغزل بلندیِ فکر اور ندرتِ خیال کا تعلق ہے۔ مرزا پوری طاقت کے ساتھ عرفی سے ٹکر لیتے ہیں لیکن کچھ ایسے منازل بھی دقیقہ سنجی میں آتے ہیں جہاں غزل کے میدان میں ظہوری اور قصیدہ گوئی میں عرفی کا پلہ غالب سے بڑھ جاتا ہے مثال کے طور پر ظہوری کی ایک غزل کے حسب ذیل اشعار

مے نشد راہ حرم خور در ابر پرواز افگنم — با جرس در نالہ آوازے بر آواز افگنم

در تلاش محرمی طبع صبا باید گرفت — پردہ شاید از جمال شاہد راز افگنم

معنی دارد صفیر طائرِ صبح خواں — خواب غفلت تا بکے گوشے بر آواز افگنم

دل بہ پیکاں نسبتے دارد بیا تا خویش را — بر سرِ راہ نگاہے ناوک انداز افگنم

اور عرفی کے ایک قصیدے کے مندرجہ ذیل اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں۔

ز ترتیب نظام آفرینش چوں نہ آگہ — حوادث راز تاثیر نجوم آسماں بینی

تو گل از باغ می جوئی من از گلہائے جحیم — من آتش از دخانِ بیم تو از آتش دخاں بینی

مرو در عرصۂ دانش کز آسیب تنک فہماں — یقیں را در پناہ پردہ داران گماں بینی

در آید پردہ بینش کہ مدہوشانِ حیرت را — فروغ دیدہ ستر عورت دوشیزگاں بینی

حقیقت امر یہ ہے کہ ظہوری کی غزل کے مقابلہ میں مرزا کی غزل اور عرفی کے اس قصیدے کے مقابلہ میں مرزا کا اسی بحر و قوافی میں قصیدہ بہت پست ہے مرزا کو غالباً اس کا خود بھی احساس

تھا اس لئے انھوں نے اپنی دنیائے خیال ہی اس قصیدہ میں بدل دی تھی۔ عرفی کی طرح مسائل تصوف اور اصول فلسفہ کو اپنانے کے بجائے انھوں نے اپنے اس بحر و قوافی والے قصیدے کو ایک مخصوص واقعہ کی ترجمانی کے لئے منتخب کر لیا تھا۔ کربلائے معلیٰ سے بادشاہ اودھ کے لئے ضریح مبارک بھیجی گئی تھی اور اس کے استقبال کے لئے بادشاہ مع تمام شاہزادگان، رؤساء اور عمائدین کے شہر کے باہر تک استقبال کے لئے گئے تھے۔ اس موقع پر مرزا نے جو قصیدہ تصنیف کیا اس کے لئے اسی بحر و قوافی کو پسند کیا اس قصیدے کا مطلع یہ ہے۔ جو اپنے رنگ میں بہترین ہے اس لئے عرفی کے قصیدے کا احترام کرتے ہوئے بھی ہم کو مرزا کی مضمون آفرینی پر داد دینا پڑتی ہے

بیا در کربلا تا آں ستم کش کارواں بینی　　کہ در دے آدم آل عبا را ساریاں بینی

اسی طرح عرفی کے طرحوں میں متعدد قصیدے غالب کے کلیات میں موجود ہیں جن میں بعض قصائد عرفی کے ہم پلہ نہیں ہیں لیکن پھر بھی بڑی قدر و منزلت کے مالک ہیں

مختصر یہ کہ مرزا کے فارسی کلام میں جس میں شاعری کے تمام اصناف شامل ہیں استادی کی تمام شان موجود ہے جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انھوں نے استادان فن کے کلام کا غائر مطالعہ کیا تھا اور اس سے استفادہ کیا تھا جس کے ثبوت میں ان کا وہ بیان جو انہوں نے فارسی کلیات کی تقریظ میں لکھا ہے کافی ہے

لیکن پھر بھی کہنا پڑتا ہے "یمن فرہ پرورش اموختگی" کے سہارے غالب نہیں ہے۔ ان کو سہارا ضرور ملا لیکن ان کے فطری رجحانات اور خداداد صلاحیتیں ان کی تکمیل میں کارگر ہوئیں یہی وجہ ہے کہ وہ نہ شیخ علی حزیں بن سکے، نہ طالب آملی عرفی شیرازی ظہوری اور نظیری سے بھی ان کی روش علیحدہ ہی رہی۔ ان سب سے استفادہ کے بعد بھی وہ غالب رہے اور ان کی انفرادیت اپنی جگہ مسلم الثبوت ہے۔

رشک ظہوری اور غالب

عام طور سے لوگ رشک و حسد کے الفاظ ہم معنی بولتے ہیں، اُن جذبات و کیفیات کو جنکا اظہار ان الفاظ کے ذریعے سے ہوتا ہے، ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً رشک اور حسد دو علیحدہ علیحدہ کیفیات ہیں جن کے محرکات بھی متضاد ہوتے ہیں۔ ان دونوں جذبات کا حرکات و سکنات پر نظر کرتے ہوئے بسا اوقات ایک ہی طرح سے اظہار ہوتا ہے لیکن اندرونی احساسات ہر حال میں مختلف ہی ہوتے ہیں۔ حسد بدباطنی کی پیداوار ہے لیکن رشک اپنے دامن میں محبت، خلوص اور پاکیزگی کی وسعتیں سمیٹ لیتا ہے۔ جذبۂ رشک اس وقت ابھرتا ہے جب محبت میں باشعور دارفتگی اور شیفتگی کروٹیں بدلنے لگتی ہے۔ منازل عشق جتنے جتنے بلند ہوتے جاتے ہیں اسی تناسب سے رشک میں بھی شدت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ عاشق خود اپنے سے رشک کرنے لگتا ہے اور یہ پکار اٹھتا ہے کہ "مرتے ہیں مگر ان کی تمنا نہیں کرتے"۔ یہ کیفیت خود وارد کردہ نہیں ہوتی بلکہ دل کی گہرائیوں سے ابھرتی ہے، لاکھوں مجبوریوں کو ساتھ لے کر ابھرتی ہے۔ کیوں کہ عاشق قہراً خود اپنے اوپر رشک کرنے لگتا ہے اور بے بسی میں ان جذبات کا حامل ہو جاتا ہے کہ "میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے"۔ ظاہر ہے کہ یہ منزل حسد کی نہیں ہو سکتی، رشک ہی کی ہے جس پر صرف ایسے شاعر فائز ہوتے ہیں جنھوں نے انسانی کردار کا عمیق مطالعہ کیا ہے اور جو دقیقہ سنج اور نکتہ رس ہوں۔ ایسے شعراء اپنے کلام میں حسد کا شائبہ بھی نہیں آنے دیتے اور ان کے یہاں نشست الفاظ اور طرز ادا میں لطافت ہی ٹپکتی ہے

ہر شاعر عشق کا دم بھرتا ہے اس لئے کہ شاعری بغیر عشق و محبت کے بے معنی اور بے سود ہے۔ اور چونکہ عشق کے ساتھ جذبہ رشک کا ابھرنا فطری کیفیت ہے۔ اس لئے ہر شاعر کے یہاں رشک سے

متعلق خواہ وہ کتنے ہی پست کیوں نہ ہوں اشعار ملتے ہیں لیکن اچھوتے اور نادر مضامین غیب سے ہی خیال میں آتے ہیں اس لئے ہر شاعر کے یہاں مضامین رشک میں تنوع، بلندی اور لطافت کی رنگینیاں نہیں ہیں۔ واردات عشق کا بیان کرنے والا کوئی دوسرا اعظیم شاعر، میر تقی میر کے برابر اردو زبان میں پیدا نہیں ہوا۔ میر کے کلام میں جو سوز و گداز، شورش و کیفیت اور سلاست و معنویت ملتی ہے اس کی مثال اردو کی عشقیہ شاعری میں کہیں اور نہیں پائی جاتی۔ پھر بھی میر کے یہاں جذبہ رشک ہر پہلو سے اجاگر نہیں ہوا اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ رشک کے بلند ترین مدارج کا میر کے یہاں فقدان ہے۔ جس کی غالباً یہ وجہ ہے کہ انھوں نے وادی محبت میں آہ اور کراہ کے ساتھ قدم رکھا تھا۔ وہ لذت غم میں اتنا ڈوب گئے کہ وجدانیت کی طرف راغب ہونا ان کے دل کو گوارا نہ ہوا اور قنوطیت ان کی دقیقہ سنجی پر غالب رہی۔ اردو کے دوسرے شعراء نے بھی رشک سے متعلق مضامین کہے ہیں لیکن اول تو ان کے یہاں ایسے اشعار کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ دوسرے ان سب کا رشک رسمی اور "غیر" "رقیب" اور "عدو" تک محدود ہے۔ ان قیود کے حدود سے باہر اگر کچھ اشعار ملتے بھی ہیں تو ان میں لطافتِ بیان اور حسنِ ادا کا شائبہ نہیں ہوتا۔ فارسی شعراء کے کلام میں بھی یہی صورتِ حال نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں اردو شعراء کے مقابلہ میں جذبہ رشک کی ترجمانی ضرور زیادہ ہے اور بعض اساتذہ کے یہاں لطافت کے جوہر بھی نظر آتے ہیں مگر پھر بھی ہر نہج اور ہر نوع میں ظہوری اور غالب کا ایا کوئی تیسرا اس میدان کا راہرو نظر نہیں آتا۔

فارسی میں نظیری حسن و عشق کی واردات بیان کرنے میں بہترین شاعر تھا۔ حسن و عشق کی داستانیں اس سے بہتر موثر اور لطیف انداز میں کسی نے نہیں سنائیں۔ اس کے کلام میں لطافت، شدت احساس، اثر، معنویت اور منازل عشق میں بادیہ پیمائی کی تمام لذتیں ملتی ہیں لیکن رشک کے ایسے فطری جذبہ کی اس کی تخیل میں بہت کم جگہ ہے اور اگر ہے بھی تو نہ بلند پایہ معنویت ہے اور نہ تنوع۔ نظیری کے دیوان کے صفحات پر صفحات الٹ ڈالیے، دور دور تک اس جذبہ کی ترجمانی نہیں ملے گی اور اگر کچھ اشعار مل بھی جاتے ہیں تو ان میں زیادہ تعداد ایسے مضامین کی ہے جن میں مسحور کر لینے

والی کوئی کشش نہیں ہے۔ نظیری کے یہاں اس طرزِ تمثیل کی مایوس کن کمی ہم کو یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ اس کے لیے جلیل القدر شاعر نے اس طرف کیوں توجہ نہیں کی ؟ اس سوال کے متعدد جوابات سمجھ میں آتے ہیں ایک تو یہ کہ رشک کے مضمون کو نظم کرنے کے لئے ایک مخصوص افتادِ طبیعت اور دقیقہ سنجی و نازک خیالی کی ضرورت ہے۔ وارداتِ قلبیہ کو نظم کرنا ایک بات ہے مگر انھیں واردات کا کسی مخصوص زاویۂ نگاہ سے مطالعہ کرکے اور اس میں مضمون آفرینی شامل کرکے شعر کہنا بالکل دوسری بات ہے دوسرے یہ کہ کوئی خاص مضمون کسی مخصوص شاعر کے لئے اتنا پسندیدہ بن سکتا ہے کہ وہ طرح طرح سے اس پر طبع آزمائی کرکے اپنے لئے اس خیال و رجحان کو مختص کر لیتا ہے۔ اس اصول کے تحت ظہوری اور غالب کو رشک کے سلسلے میں عدیم المثال شاعروں کی صفِ اول ہی میں جگہ حاصل ہے۔ ایک تیسری بات یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جس کیفیت کو دوسرے اساتذہ نے منزلِ تمثیل میں نظم کیا اسی کو ان شعرا نے اپنے مخصوص زاویۂ فکر و نظر کے ماتحت جذبہ رشک کی واردات بنا کے پیش کیا۔ چنانچہ حافظ کا مشہور شعر ہے ؎

در نمازم خمِ ابروے تو چوں یاد آمد — حالتے رفت کہ محراب بہ فریاد آمد

ظہوری منزلِ رشک میں کہتا ہے۔

چہ پشتی کردہ محراب حرم تر قبلہ دردم — نمیدانم کجا دیدہ است آں محراب ابرو را

تمثیل اور رشک ایک علیحدہ بحث ہے اس مقام پر جذبۂ رشک کی ترجمانی کرنے کے سلسلے میں ظہوری کے بعض وہ اشعار درج ذیل کئے جاتے ہیں جن کا مطالعہ شاعر کے کمالِ فن کو واضح کرتا ہے :۔

برائے خلد تاب رشک خواہد تا فتن دوزخ — ازیں زیور کہ ایزد از جمالت دادہ دنیا را

بخون گرد رشک غیر رنگین تیغ غیرت را — بانصاف آشنائی باد یارب مروت را

ایکہ بر خود تر دردِ رشک پیچیدن نداشت — حلقہا از نالہ در گوش داکردیم و رفت

از برائے رشک غیرت در نگہ پیچیدہ بود — غیرت باد ا ظہوری غیر را دیدن نداشت

شرمندۂ فسردہ دیہائے خویش باش
رشک ست رشک بر جگر داغدار صبح

سہل باشد رشک بال افشانی آزادی بلبل
بخت مرغانیکہ در راحت پر اندازان کنند

دل را ز تاب رشک شود آب رنگ و بو
در باغ از و اگر سخن رنگ و بو کنند

بیوجانیم در تن گرچہ ہر صبح از صبا آید
گذر شکم کہ ہمراہ صبا بویش چرا آید...

ماہ رشک شکستہ دارد..
کہ کلہ گوشہ بر شکست سپرش

سخت دشوار ست جان از رشک دادن الالہ ما
گہہ ہم ز ہجر بیدادم کہ آساں تر کشم

در خلوت تخیل چوں ابر دیدہ بارد
از تاب رشک سوزد نظارۂ حبابم

زنم لاف ز رشک ایں و آں گر دیدہ ام فارغ
ندارم ہم خودش باور گر گوید دگیرے دارم

حلالم خون دل در جام کردن۔
حرامم گر ز رشک جم بمیرم

ز برق رشک بسوزد سرائے خواب دل
چراغ مجلس افسانۂ نور طور مکن

تا مسیحا از رشک خود بہ بستر افگنم
چشم دارم بر سنشے از نرگس بیمار او

یہ اشعار نمونتاً پیش کئے گئے ہیں ظہوری کے یہاں رشک سے متعلق طرح طرح کے مضامین بکثرت ملتے ہیں
یہی چند اشعار ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ جذبۂ رشک کی ترجمانی اس نغز گو شاعر نے کس کس طرح کی ہے
ایک رنگ و (بو ہی) کھو کر رنگ رنگ سے اظہار رشک کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وسعت نظر کی اتنی اور ایسی
مثالیں جب دوسروں کے یہاں فارسی میں نہیں ہیں تو اردو اس دقیقہ سنجی کی کہاں متحمل ہو سکتی تھی
البتہ مرزا غالب ہی ایک ایسے نکتہ رس شاعر ہیں جنھوں نے اس میدان فکر میں بھی نازک خیالی دقیقہ
سنجی اور معنی آفرینی سے اردو کے دامن کو مالا مال کر دیا۔ 'رقیب' 'عدو' اور 'غیر' کے مقابلے میں رشک کا اظہار
پھر بھی سہل ہے۔ یار تیغ بکف 'غیر' کی طرف جائے تو کشتۂ ستم پر غیرت طاری ہو جانا آسان ہے لیکن "بلائے جاں
ہے ادا تیری اک جہاں کے لئے" سوچ کر یہ "گر بلا ہیں ہیں بھی" مبتلا کیسے آفت رشک" رہنا بڑی بلند منزل ہے۔ جہاں
ہر ایک نہیں پہنچ سکتا۔ یا اسی طرح "مدعی کا ہمسفر" دیکھ کر یہ جذبہ ابھرنا کہ "وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے
ہے مجھ سے" صرف مرزا کی جدت آفرینی اور ندرت خیال کے لئے مخصوص ہے۔ اسی طرح 'عدو' کو معشوق سے ہم

سخن دیکھ کر عاشق پر جذبۂ رشک طاری ہو سکتا ہے مگر اس جذبہ میں "خوف بدآموزیِ عدو" کا زائل ہوجانا
تفکر کی وہ سطح ہے جہاں محبت بہت بلند نظر آتی ہے اور عاشق کا کردار اونچا ہو جاتا ہے۔ زنّیوں کا کیا ذکر
مرزا نے رشک کو اس بلندی پر محسوس کیا تھا جب معشوق کے "ہاتھ میں تلوار" یا اس کے تن نازک کو
"آغوشِ خمِ حلقۂ زنّار" میں آتے دیکھ کر ان کا مرجانے کو دل چاہتا تھا یعنی یہ کہ بے جان چیزوں سے
معشوق کا لگاؤ بھی عشقِ حقیقی میں جذبۂ رشک ابھارتا ہے۔ اس ندرتِ خیال پر بھی رشک آجاتا ہے
محل نہ ہوگا کہ مرزا اپنے محبوب کا مکان ڈھونڈنے نکلتے ہیں تو اس کا نام شدتِ رشک میں نہیں لیتے، یا یہ
کہ منہ سے نہیں نکلتا اور اس کے بجائے ہر ایک سے یہ پوچھتے پھرتے ہیں کہ "جاؤں کدھر کو میں"؟
معشوق اگر باغ میں بے حجابانہ کرنے لگتا ہے تو ان کو نکہتِ گل سے بھی حیا آنے لگتی ہے ان کے اس
خیال کا جو اردو میں ادا کیا گیا ہے پوری طاقت و اعتماد کے ساتھ ظہوریؔ کے اس مایۂ ناز شعر سے موازنہ
کیا جا سکتا ہے ؎

بہو جانم در تن گرچہ ہر صبح از صبا آید — کشد رشکم کہ ہمراہِ صبا بوئیش چرا آید

یا اسی طرح معشوق کے تبسم ہائے پنہاں سے متاثر ہو کر یہ کہہ جانا صرف مرزاؔ ہی کے بس کی بات تھی

یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجئے — یا پردۂ تبسمِ پنہاں اٹھائیے

ظاہر ہے کہ ایسے تمام مضامین اور خیالات ایک ایسی فکرِ بلند کی نشاندہی کرتے ہیں جو مبدا فیاض
نے مرزا کو مرحمت فرمائی تھی۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا، رقیب، عدو اور غیر کے مقابلے میں رشک پیدا ہونا عام بات ہے
اور اس کا الفاظ میں ادا کر دینا سہل ہے لیکن مرزاؔ عام بات کو بھی سیدھے سادے طریقے پر کہنے کے قائل نہ تھے
یہی وجہ تھی کہ ان کی دقیقہ سنجی نے جذبۂ رشک کے اظہار میں ندرت شامل کر دی جس کی بدولت ان کا یہ
جذبہ کائنات پر چھا گیا۔ اسی کے ساتھ خیالات میں پاکیزگی اور طرزِ ادا میں حسن رفعت اور بلندی ملحوظ
رہی۔ ان کی اس فنی عظمت کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کے لئے وہی چند اشعار کافی ہیں جو رشک سے متعلق
ان کے اردو دیوان میں موجود ہیں لیکن ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ مرزاؔ کے فن کو اصلی خد و خال میں دیکھنے کے
لئے ان کے فارسی کلام کا مطالعہ ضروری ہے۔ وہ "طوطیِ ہندوستان" ضرور تھے لیکن "عندلیبِ از گلستانِ

عجم ظہوری ہی پر ان کو ناز تھا۔ حقیقت امر تو یہ ہے کہ ان کا اردو کلام بھی اسی لئے دقیع اور بلند پایہ ہے کہ انھوں نے فارسی افکار اور تراکیب کو اپنا کر اردو زبان میں اپنے مخصوص طرز پر پیش کیا ہے۔ ان کا سارا اردو دیوان اسی صنعت گری کا بہترین شاہکار ہے۔ لہٰذا ان کے فارسی غزلیات سے چند اشعار ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنا چاہئے کہ مرزا کو رشک کا مضمون ظہوری ہی کی طرح بے حد مرغوب و مطبوع تھا۔ انھوں نے ظہوری کی تاسی کر کے مضامین رشک میں خامہ فرسائی کی اور ان مضامین میں اپنی عالی ہمتی اور دقت نظر سے تنوع اور رنگینی پیدا کر کے ایسے ایسے اشعار کہے ہیں جن کو ہم پورے اطمینان کے ساتھ ظہوری کے کلام کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں بعض بعض مقامات پر مرزا ہی کا پلہ بھاری نظر آتا ہے

بد اُفتادم اما زمن نخواہی ای بی رحم — کہ رشکم در جحیم افگند خیل آرام گاہان را
ز بوالہوس داوری بردم بدیوان لیک نہ نمی — کہ سعی رشکم از خاطر برد ناخوشنودیہا را

چوں بہ قاصد بسپرم پیغام را — رشک نگذارد کہ گویم نام .. را
با من بخواب ناز و من از رشک بدگماں — تا عرصۂ خیال عدو جلوہ گاہ کیست

رشک آیدم بہ روشنیِ دیدہ ہائے خلق — دانستہ ام کہ از اثر گرد راہ کیست
ز رشک است اینکہ در عشق آرزوے مردنم باشد — تو جانِ عالمی حیف است گر جاں در تنم باشد

کم دوستے ز رشک است اینکہ غمخواری نمی خواہم — کہ ترسم یا بد انذار ہر کہ از عالم خبر گیرد

بیروں مبادا ز خانہ بہ ہنگام نیم روز — رشک آیدم کہ سایہ بہ پابوس می رود
از رشک گرد آنچہ بہ من روزگار کرد — در خستگی نشاط مرا دید خوار کرد

چو رہ بقصد نشاں بر کماں بجنباند — تپد ز رشک دلم تا نشاں بجنباند
جاں دہم از رشک شمشیر چہ حاجت — سر پنجہ بدامن زن و دامن بکمر بر
تا خود از بہر نثار کیست می میرم ز رشک — نقد و چندیں کوشش و در راز آوردنش
میرم ز رشک گر ہمہ نوبت بمن رسد — کامیزش شمال و صبا بود و است شرط

متذکرۂ بالا دونوں انتخاب کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ ظہوری اور غالب کے یہاں جذبۂ رشک میں بڑی ہم آہنگی ہے اور ان دونوں شعرا نے اس مضمون میں بڑی بڑی جدت آفرینیاں کی ہیں۔ دونوں اساتذہ نے انسانی فطرت کو دقیق نظر سے دیکھا تھا اور انسانی جذبات کی گہرائیوں میں اچھی طرح پیر کر حقیقتوں کو سمجھا تھا۔ نفسیات و حسیات میں پوری مہارت حاصل کر کے اس نتیجہ تک پہونچے تھے کہ انسانی کردار میں رشک کو اہم حیثیت حاصل ہے۔ عاشقی کی منزل ہو یا دنیاوی تعلقات کی، فطری مناظر سے دلچسپی ہو یا قانونِ قدرت سے روحانی برکتیں ہوں یا مادی صلاحیتیں، ہر موقع ہر محل اور ہر شعبۂ حیات میں کسی نہ کسی نہج اور نوع سے جذبۂ رشک ابھرتا ہے بشرطیکہ شاعر یا مفکر حساس ہو اور ایک مخصوص طور پر سوچنے کا عادی ہو گیا ہو۔ حقیقی شاعر ایسے حالات کی ترجمانی کرتا ہے اور جو نہ کرے اس کے یہاں اس بیش بہا جوہر کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ غالب کے یہاں اس دولتِ بے بہا کا کثیر ذخیرہ ہے انھوں نے تمام اصنافِ سخن میں اور ہر موقع و محل پر جذبۂ رشک کا مظاہرہ کیا ہے اور ہر مظاہرہ اپنی آپ مثال ہے۔ ایسے نمونے نہ صرف غزلیات بلکہ قصائد میں بھی ملتے ہیں۔ بزرگانِ دین کی مدح میں ملتے ہیں اور واقعہ کربلا کے سلسلے میں گریہ و زاری میں بھی جذبۂ رشک اجاگر ہوتا ہے۔ "گریستن" کی ردیف میں ایک قصیدہ امام حسین علیہ السلام کی مدح میں کہا ہے۔ اس قصیدہ کے دو اشعار ایسے ہیں جن میں جذبۂ رشک کی ترجمانی انتہائی انوکھے لیکن پُر درد انداز میں کی ہے۔ فرماتے ہیں:

رشک آیدم بر ابر کہ در حادثہ اوست — بر خاکِ کربلائے معلا گریستن
با خاکیان بجنگم ز افلاکیان برشک — خواہم بر آستانِ تو تنہا گریستن

ایک دوسرے قصیدے میں جو حضرت علیؑ کی منقبت میں ہے مرزا نے جذبۂ رشک کا اظہار اتنے بلند اور حسین پیرایہ میں کیا ہے جس کی مثال کسی زبان کے ادب میں ملنا بہت مشکل ہے۔ فرماتے ہیں

خواہم ز فرطِ خویش کُرد در مجمعِ خواص — مہرِ ترا بجوشش بدزدم ز خویشتن

"دزدیدن" یعنی چرانا ایک قبیح فعل ہے اور ایک مجمع میں اس فعلِ قبیح کا ارتکاب مذموم بلکہ بعید

مذموم ہے لیکن مرزا نے فعل قبیح کو مستحسن ہی نہیں بنایا بلکہ "اُمیدِ تو" اس میں ارتکاب کرکے مستحسن سے زیادہ مستحسن بنا دیا اس لئے کہ جس جذبے کے تحت "دزدیدن" کی کار فرمائی ہوئی ہے وہ "مہرِ تو" (ممدوح کی محبت) ہے۔

قصائد کے علاوہ مرزا نے ایک ترکیب بند بھی منقبت میں کہا ہے جو نو بندوں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے بند میں تشبیب کے اشعار بھی مدحیہ ہیں۔ انھیں میں ایک شعر ایسا ہے جو جذبۂ رشک کی خالص عاشقانہ انداز میں ترجمانی کرتا ہے۔ کہتے ہیں۔ ؎

در رہ یام ز رشک پائے رہ پیمائے خود خون شد در دل ز زخمے کز سرِ خارے رسد

غرض قصائد ہوں یا غزلیات مرزا نے انسانی جذبات کی ہر جگہ بہترین مصوری کی ہے۔ واردات عشقیہ میں رشک کے مضامین نظم کر لینا زیادہ دشوار نہیں تھا لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں میں جہاں شاعرانہ ذہنیت کی جگہ غیر معمولی سنجیدگی کو حاصل ہوتی ہے، یا ایسے مقامات پر جہاں جذبات سے بلند ہو کر خالص تفکر اور تعقل کی وادیوں میں بادیہ پیما ہونا پڑتا ہے، رشک کے جذبہ کا نباہنا بڑا مشکل کام ہے۔ اس منزل میں مرزا کا مرتبہ ظہوری کے مقابلے میں کچھ بلند ہی نظر آتا ہے۔

جذبۂ رشک کا اگر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اس جذبہ میں خالص عاشقانہ شان ہے اور عاشق میں شدتِ عشق ہی جذبہ کو ابھارنے کی باعث ہوتی ہے کیونکہ ہر عاشق اپنے کو بہترین چاہنے والا سمجھتا ہے۔ پھر بھی اس کو ہر لحظہ غیروں اور رقیبوں کا سامنا رہتا ہے معشوق اپنے کو حسین ترین فرد سمجھتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ جانِ جہاں ہے اور اس کا کوئی مد مقابل نہیں ہے اس لئے اس کے رشک کرنے کا کوئی موقع و محل پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ مگر مرزا غالب نے معشوق کو خالص انسانی کردار میں دیکھا اور انسانی جذبات کا حامل پایا لہٰذا وہاں بھی جذبۂ رشک ڈھونڈ کے فراہم کر لیا۔ اس جذبۂ رشک کی معشوق میں ترجمانی جتنی بلند پردازی سے مرزا نے کی ہے وہ صرف انھیں کے لئے مخصوص ہے۔ وہی اس بات کو سوچ سکتے تھے کہ معشوق کو اگر کسی ہستی سے رشک ہو سکتا ہے تو وہ صرف معبود کی ذات ہو سکتی ہے۔ فرماتے ہیں

نخوت نگر کہ می خلد از روشِ زر رشک حرفے کہ در پرستشِ معبود می رود

مرزا ایک ہی مضمون کو طرح طرح سے نظم کرتے تھے۔ اسی جذبہ کی دوسری طرح ترجمانی ایک دوسرے انداز سے بھی کی ہے ؎

زنہار از شیوہ را طاعت حق گراں نبود   لیک صنم بہ سجدہ ناصیہ مشترک نخواست

کہنا پڑتا ہے رشک کو الفاظ میں بیان کرنا اور اس جذبہ کی خاطر خواہ عکاسی کرنا صرف ظہوری اور غالب کا حق تھا جس کو یہ دونوں اساتذہ بہتر سے بہتر طریقے پر ادا کرتے رہے۔ ان دونوں شاعروں نے جذبۂ رشک کو نہ صرف اپنایا بلکہ اس کی بھرپور قدردانی کی اور اس کو طرح طرح سے نظم کیا ان دونوں اساتذہ نے رشک کو اتنی اہمیت دی کہ وہ اگر فعل غیر مستحسن قرار دیا جائے تب بھی ان کے یہاں بہترین خصوصیات کا حامل بن گیا ہے۔ مرزا نے ظہوری کی تاسی ضرور کی تھی لیکن طبع آزمائی میں ان کی انفرادیت، نکتہ رسی اور دقیقہ سنجی نے چار چاند لگا دیئے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ان کا نشید شوق فن کے درجے تک پہونچ گیا لیکن پھر بھی ظہوری کی تاسی کا برابر احترام کرتے رہے گمان غالب ہے کہ ظہوری ہی کو یاد کر کے مرزا نے یہ فریاد کی تھی۔ ؎

آنکہ صور نالہ از شور نفس موزوں دمید   کاش دیدے ایں نشید شوق فن خواہد شدن

غالب کی جودتِ طبع

حقیقی شاعر کے کلام میں منجملہ دیگر خوبیوں کے تاثیر اور معنی ہم لوازمات ہوتے ہیں۔ تاثیر نہ ہو تو کلام قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ کیوں کہ بات وہی ہے جو کہنے والے کے دل سے نکلے اور سننے والے کے دل میں اتر جائے۔ یہ خوبی اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ بات کرنے والے کو اپنے خیال کا اظہار کرنے کے لئے مناسب و موزوں الفاظ پر قابو ہو اور اس کو ان الفاظ کے استعمال کرنے کا سلیقہ بھی ہو۔ اسی لئے شاعر کو مرصع ساز سے نسبت دی گئی ہے اور بندش الفاظ کو نگینے جڑنے کا مرادف قرار دیا گیا ہے۔ جس طرح ایک مرصع ساز ہنرمندی کے ساتھ نگینے جڑ کے اپنے زیور کو حسین و جاذبِ نظر بناتا ہے اسی طرح شاعر کو بھی اپنا خیال نظم کرنے کے لئے بندش الفاظ کی خوبی مدنظر رکھنا پڑتی ہے اس حسنِ ادا کے لئے خیال کی بلندی بھی لازم ہے ورنہ بات کہنے اور سننے کے قابل نہیں ہوگی خیال کی بلندی کی معینہ تعریف ممکن نہیں ہے کیوں کہ خیال کی وسعتوں کا احاطہ کرنا محال ہے البتہ اتنا کہنا پڑتا ہے کہ جتنا خیال بلند ہوگا اتنا ہی شاعر کا کلام وقیع ہوگا اور جتنی جودتِ طبع شاعر میں زیادہ ہوگی اتنا ہی اس کا خیال بلند و پاکیزہ ہوگا۔ مرزا غالب کا کلام ہر اعتبار سے بلند ہے اور اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ہم کو ان کے یہاں زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق ترجمانی ملتی ہے اور اس ندرت کے ساتھ کہ ان کا ایک مختصر سا دیوان معنی و تاثیر کے لحاظ سے ہم کو شعر و ادب کا ایک بحرِ بیکراں نظر آتا ہے۔

مرزا کے کلام میں ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ اگر کسی مقام پر بندش الفاظ سست یا نامانوس ہوتی ہے تو تخیل کی بلندی اس عیب یا نقص کی پردہ پوشی کر دیتی ہے۔ ہماری نظر اس کمزوری پر

نہیں پڑتی یا ہم اس کو قابل توجہ ہی نہیں سمجھتے لیکن جہاں ان کا کلام پُرتاثیر ہے وہاں جاذبیت ہم کو اتنا مسحور کر لیتی ہے کہ ہماری نظر میں خیال کی گہرائیوں تک پہونچنے کی سکت ہی باقی نہیں رہتی

مرزا کبھی اپنے طرز ادا سے کبھی اپنی تخیل کی بلندی سے اور زیادہ تر ان دونوں خوبیوں سے سخن فہموں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں ان کے اردو کلام میں یہ خوبیاں اس لئے نمایاں ہیں کہ انھوں نے فارسی ترکیبوں اور اضافتوں سے بڑی ہوشمندی کے ساتھ کام لیا ہے جس کی بدولت وہ بڑے سے بڑا مفہوم کم سے کم عبارت میں ادا کرتے ہیں فارسی زبان پر ان کو قدرت تھی، اس لئے ان اضافتوں اور ترکیبوں کے برمحل استعمال سے ان کے اردو کلام میں چار چاند لگ گئے ان کے زمانے میں ان کے کلام کے سمجھنے والے یقیناً بہت کم تھے لیکن پھر بھی یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ جو سمجھا اور جو نہ سمجھا سب ہی نے ان کے کلام کی تعریف کی دور حاضر میں غالب کے کلام کی شرحیں اور تفاسیر بکثرت ہمارے پاس موجود ہیں اس لئے ان کا کلام سمجھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہونا کچھ بعید از قیاس نہیں ہو سکتا لیکن ان کا فارسی کلام، جس پر خود ان کو ناز تھا اور جو حقیقتاً ایک عدیم المثال ادبی اور فنی شاہکار ہے اب تک بلکہ اب اور زیادہ قدر شناسی کا محتاج ہے۔

مرزا کو اپنی اعلیٰ فارسی قابلیت اردو میں استعمال کر کے اور فارسی میں بلند پایہ مشق سخن کی بدولت اپنی جودت طبع کے لئے دو وسیع میدان حاصل تھے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ ان دونوں میدانوں ورنہ کسی ایک میدان میں اپنے ذہن رسا کے لئے آسودگی ضرور حاصل کر لیتے تھے اگر کوئی خیال ان کے حسب مراد ایک زبان میں ادا نہ ہوتا تو وہ اس کمی کو دوسری زبان میں پورا کر لیتے تھے اساتذہ اور فنکار ایک ہی خیال کو ایک بار سے زیادہ نظم کرتے ہیں اور اس تکرار سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے نزدیک پہلی مشق خود انھیں کے معیار کے مطابق نامکمل تھی جس کی تکمیل دوسری بار ہو جاتی ہے بعض شعراء اپنی پہلی مشق کو قلمزد کر کے دوسرا بہتر نمونہ ہی بازار سخن میں پیش کرتے ہیں لیکن بہت سے مجموعے ایسے بھی ملتے ہیں جن میں تمام رطب ویابس دیکھ کر ہم کو اپنی نظر انتخاب کام میں لانا

پڑتی ہے بہرحال غالب کے یہاں اس قطع وبرید کی گنجائش نہیں اس کے برعکس ایک ہی خیال کو دو زبانوں میں پڑھ کر ان کے ہر دو طرز ادا میں مقابلتاً شوخی و شیرینی میں کمی ذہینی کا مزہ ملتا ہے اور ان کی ندرت طبع کا بھی حیرت انگیز مطالعہ حاصل ہوتا ہے ایسی مثالیں بے شمار ہیں لہذا چند اردو اور فارسی ہم خیال اشعار کو مثالاً پیش کر دینا کافی ہوگا

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہر انسان گنہگار بندہ ہے اور جیتے جی گناہوں سے نجات اس لئے ممکن نہیں کہ اس کے خمیر میں معصیت شامل ہے اور ہر گناہ میں اس کو لذت ملتی ہے اس لذت کا وہ حریص ہے طبعیتاً وہ ہر اس چیز کا حریص ہوتا ہے جو اس کے لئے ممنوع ہے ماحول و اسباب میں گرفتاری بھی خطاکاری کی محرک رہتی ہے یہاں تک کہ مستوریوں میں بھی گناہوں سے فراغ ممکن نہیں ہوتا ان حالات میں انسان کی بدبختی پر جتنا بھی تاسف کیا جائے وہ کم ہوگا کہ ایک طرف تو وہ اپنے ضمیر میں گناہ اور ارتکاب گناہ کی اتنی خواہشات لے کر آیا ہے کہ مرتے مرتے ہزاروں خواہش دل میں رہ جاتی ہیں تو دوسری طرف اس کو اپنے گناہوں کا بارگاہ صمدیت میں حساب بھی دینا پڑتا ہے ظاہر ہے کہ جب خدا کے حضور فرد قرارداد جرم انسان پر لگائی جائے تو اس کو اپنی صفائی میں کچھ نہ کچھ کہنا ضروری ہوتا ہے یہ صفائی مرزا بھی پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

دندر انا روز کہ پرسش رود از ہر چہ گزشت کاش با ما سخن از حسرت ما نیز کنند

پہلے شعر میں جذبہ عبودیت کے ساتھ شوخی گفتار شامل ہے ورنہ "حساب اے خدا نہ مانگ" کا محل نہیں تھا۔ دوسرے شعر میں "ناکردہ گناہوں" اور "ان کردہ گناہوں" کے فقرات فصاحت سے گرے ہوئے ہیں لیکن ان کا یہ نقص تخیل کی بلندی میں چھپ جاتا ہے یا کم سے کم اس نقص میں زیادہ اہمیت محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ تیسرا شعر "طرز ادا" تخیل کی بلندی اور گداز روانی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ کہنا پڑتا ہے کہ یہی شعر مرزا کے جودت طبع کی اصلی تخلیق ہے۔

مرزا کے ابتدائی اردو کلام میں بیدل کی تقلید واضح ہے جس کے سبب سے مغلق الفاظ اور نامانوس ترکیبات ان کے مفہوم و مطالب کو سمجھنے میں بھی دشواریاں پیدا کر دیتے ہیں لیکن فارسی میں خود اپنے رنگ کے وہ ہمیشہ مالک رہے۔ ان دونوں زبانوں کے اشعار میں مفہوم کی یک رنگی کے باوصف طرز ادا کا تقابل ایک دلچسپ مطالعہ ہے حسب ذیل اشعار میں پہلا شعر بیدل کی ہو بہو عکاسی ہے

ہوائے سیر گل آئینۂ بے مہری قاتل — کہ انداز بخوں غلطیدن بسمل پسند آیا

انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا — اٹھے تھے سیر گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

اگر ہوائے تماشائے گلستاں داری — بیا و عالم در خون تپیدنم بنگر

تیسرا شعر چھوٹی بحر میں ہے اور اس میں سادگی، صفائی اور تاثیر پہلے دونوں شعروں سے کہیں زیادہ ہے۔

بعض ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جہاں ابتدائی دور سخن میں جیسا کہ ظاہر ہوتا ہے۔ بیدل کی تقلید نہیں کی اور سیدھی سادی اردو میں مرزا نے طبع آزمائی فرمائی تھی لیکن پھر بھی وہ لطف نہیں پیدا ہو سکا جو بے ساختگی کی وجہ سے ان کے فارسی کلام میں ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے — خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقت سخن — جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

بجان غالب تاب گفتاری گماں داری ہنوز — سخت بیدردی کہ می پرسی ز ما احوال ما

"بجان غالب" نے تیسرے شعر میں جان ڈال دی ہے جو پہلے دونوں شعروں میں مفقود ہے۔ "ہے ہے" میں گداز پیدا کرنے کی کوشش ضرور کی گئی لیکن مطلب حاصل نہیں ہو سکا۔

پھر بھی یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ مرزا کی طرز ادا ہر مقام پہ فارسی میں اردو سے بہتر تھی ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جہاں ایک ہی خیال دونوں زبانوں میں ادا کیا ہے لیکن اردو میں زیادہ لطف ہے مثال کے طور پر حسب ذیل اشعار پیش کر دینا کافی ہوگا۔

سخن کوتہ مرا ہم دل بہ تقوی مائل ست اما — ز ننگ زاہد افتادم بہ کافر ماجرائیہا

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی!

بیگناہم پیر دیر از من مرنج من بہ مستی بستہ ام احرام را

رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

مرت گردم بزن تیغ دگرے بر دل تنگ دلم تنگ ست کار از زخم پیکاں بر نمی آید

نہیں ذریعۂ راحت جراحت پیکاں وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہئے

تینوں مندرجہ بالا فارسی اشعار میں اپنے دل پر گزرنے والی کیفیت کے اسباب و وجوہ بیان کرکے منطق و فلسفہ کا حق ضرور ادا کر دیا ہے لیکن شعریت کا کمال اردو اشعار ہی میں ہے جنت کے بارے میں مرزا نے طرح طرح سے خیال آرائی کی ہے لیکن کبھی اور کسی مقام پر جنت کو زندگی اور تعلقات زندگی پر ترجیح نہیں دی کیوں کہ مادی دنیا میں رہ کر باعمل زندگی بسر کرنا ان کا نصب العین تھا اسی لئے جنت کو دیکھ کر ان کو معشوق کا گھر یاد آجاتا ہے یا یہ کہ دنیا میں جو بے کیف اور پُر درد زندگی گزاری ہے اس کی تلافی جنت میں ان کو حاصل نہیں ہوتی ملاحظہ ہو

جنت نہ کند چارۂ افسردگیٔ دل تعمیر بہ اندازۂ ویرانیٔ ما نیست

دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

نہادہ ام بہ خلد جا رحم کجاست اے خدا

آب و ہوائے این فضا کوئے کہ یاد می دہد..!

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی گھر ترا خلد میں گر یاد آیا...!

شعراء نے بعض تاریخی شخصیتوں کو اپنا موضوع سخن بنایا ہے ان میں آدم، نوح، خضر، یعقوب یوسف، موسی، اور عیسیٰ ہر شاعر کے ہیرو ہیں حضرت یعقوب کا اپنے حسین اور محبوب فرزند حضرت یوسف کی جدائی میں رو رو کے اپنی آنکھوں کی بصارت کھو دینا ایک ایسا المیہ ہے جس پر اردو اور فارسی شعراء نے بہت کچھ طبع آزمائی کی ہے مرزا نے بھی دونوں زبانوں میں اس واقعہ کو نظم کیا ہے حسب ذیل اشعار کا تقابل دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

گشتہ در انتظار تو پدیدۂ پیر رہ سپید   دررہ شوق ہم رہی دیدہ زمردمک نخواست

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی   سپیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر   لیکن آنکھیں روزن دیوار زنداں ہو گئیں

فارسی شعر میں بلا کی ندرت خیال ہے لیکن اردو میں دونوں اشعار کا قریب قریب ایک ہی طرز ہے حالانکہ پہلا یعنی دہلی شعر بہر حال بہتر ہے

معشوق کے سایہ دیوار مکان میں بیٹھنے کی اگر عاشق کو اجازت مل جائے تو اس کو اپنی خوش قسمتی پر جتنا بھی ناز ہو وہ کم ہے۔ بجا طور پر وہ اپنے کو فرماں روائے ملک عظیم اور بادشاہ ہفت اقلیم تصور کر سکتا ہے اس جذبے کی ترجمانی مرزا کرتے ہیں اردو کے شعر میں "ہندستان" کے لفظ سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن فارسی شعر کا پہلا مصرعہ انداز محبت کی بیحد لطیف ترجمانی ہے

بیٹھا ہے جو کہ سایہ دیوار یار میں   فرماں روائے کشور ہندوستان ہے

بدیں نیاز کہ باتست نازمی رسدم   گدا بہ سایۂ دیوار پادشاہ خفت ست

یہ حقیقت ہے کہ انسان کے جذبۂ لطف و انبساط میں کسی مخصوص درجہ حرارت کا تعین کر دینا ممکن نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ایک مے خوار اپنے شغل مے گساری میں اعتدال پسندی سے کام نہیں لیتا۔ اس کی ہوسناکی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ شیشہ و پیمانہ تو در کنار خم کے خم منہ سے لگا دیئے جائیں تب بھی اس کی سیری نہیں ہوتی یہ کیفیت بہر حال عام ہے اور اس کا نظم کر دینا بھی سہل ہے لیکن مرزا کی جدت طبع ان کے اردو شعر میں وجہ شامل کرکے اور فارسی شعر میں برجستگی کا اظہار کرکے بے پناہ لطف اور لذت پیدا کر دیتی ہے۔

ہے دور قدح وجہ پریشانیٔ صہبا   یک بار لگا دو خم مے میرے لبوں سے

مے بر انداز چراغ آمدہ ساقی برخیز   شیشہ خود بشکن بر سر پیمانہ ما

شعر پڑھتے جائیے اور "بشکن بر سر پیمانہ ما" پر سر دھنتے رہیئے

"نقش و نگار طاق نسیاں" ایک ایسا پر معنی اور حسین فقرہ ہے جس کو مرزا ہی کے مذاق و

مزاج کی تخلیق کہنا غلط نہ ہوگا انھوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں اس فقرہ کو نظم کیا ہے اور ہر جگہ انتہائی موثر طرز میں بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں

یاد تھیں ہمکو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

رنگہا بر جو رشد فراہم مصرف دیگر نداشت خلد را نقش و نگار طاق نسیاں کردہ ایم

اردو میں "رنگا رنگ"، اور فارسی میں "رنگہا"، کہنا ہی عین فصاحت ہے لیکن اردو میں بزم آرائیاں" اور فارسی میں "خلد"، کو نقش و نگار طاق نسیاں کے لئے مخصوص کرنا مرزا ہی کا حصہ ہے

غالب کی ندرت خیال اُس وقت معراج کمال پر ہوتی ہے جب وہ نظارۂ معشوق کا تذکرہ یا اپنے جذبۂ رشک کی ترجمانی کرتے ہیں۔ معشوق کو دیکھ لینا ان کے لئے آسان نہیں۔ کبھی ان کو خود اپنے اوپر رشک آجاتا ہے۔ کبھی نظارہ "نقاب عارض یار"، بن جاتا ہے۔ کبھی خود ان ہی کی نگاہ معشوق کے چہرہ پر بکھر جاتی ہے اور نظارہ محال ہو جاتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام کیفیات بیحد نازک و لطیف ہیں جن کی الفاظ میں عکاسی صرف مرزا ہی کی جودت طبع کا کام ہے۔ جذبات بھی لطیف ہیں اور ترجمانی بھی اپنا جواب نہیں رکھتی۔

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے ..!

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

چہ خیزد گر نقابے از میانہ خاست کو تسکین کہ می بینم نقاب عارض یار است دیدن ہم

جب عاشق کے لئے نظارہ ہی "نقاب عارض یار"، بن جائے تو اس میں اتنی جرأت کہاں ہو سکتی ہے کہ وہ معشوق کے حضور اپنے شوق دیدار کی گذارش بھی کر سکے۔ وہ خوب سمجھتا ہے کہ عارض یار بے نقاب ہو گئے تو انجام کیا ہوگا۔ اپنے فنا ہو جانے کا ڈر نہیں البتہ اشتیاق دید کو کلیجے سے لگائے رکھنے کا لطف دیدار کے بعد مٹ جاتا ہے۔ کیوں کہ دیدار کی تاب عاشق کو کہاں!

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

اختلاطِ شبنم و خورشید تابان دیده ام　　جرأتے باید کہ عرضِ شوقِ دیدارش کنم

پہلے شعر میں اس کا احساس ہے کہ ایک عنایت کی نظر ہوئی اور ہم فنا ہو گئے لیکن دوسرے شعر میں اس پر تاسف ہے کہ شوقِ دیدار گذارش کرنے کی جرأت نہیں ہے ہر حال میں شوقِ دیدار کے برقرار رہنے ہی میں عجیب لذت ہے

رشک سے متعلق مضمون آفرینی میں مرزا کا کوئی ہمسر نہیں ہوا ظہوری نے رشک کو طرح طرح سے اور بہت خوب نظم کیا ہے۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ بعض مقامات پر غالب کا پلہ ظہوری پر بھی بھاری ہے مرزا کے رشک کا یہ عالم ہے کہ معشوق کو خدا کے سپرد کرنا بھی ان کو گوارہ نہیں ہوتا اور ہر اس چیز پر جو معشوق سے ملحق یا متعلق ہو جیسے زنار، تلوار وغیرہ مرزا رشک کرتے ہیں یہاں تک کہ وصال میں بھی خیال رقیب آتا ہے اور وہ اذیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ رشک سے متعلق اشعار کی ان کے اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے کلام میں بہتات ہے لیکن تقابل کے پیش نظر ان کی جودت طبع کی مثالوں میں صرف چند اشعار پیش کر دینا کافی ہوگا

با من بخواب ناز و من از رشک بدگماں　　تا عرصۂ خیال عدو جلوہ گاہ کیست

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے　　ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

جاں می دہم از رشک بہ شمشیر چہ حاجت　　بنجر بدامن زن و دامن بہ کمر ... بر!

آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے　　مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھکر

از ذوقِ میان تو شدن سر بسر آغوش　　بے مہر فن ماست بہ زنار میاموز

مرجاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تنِ نازک　　آغوش خم حلقۂ زنار میں آدے

تلوار اور زنار سے متعلق تقابل کے اشعار اپنا جواب نہیں رکھتے اور ایک مبصر کے لئے یہ فیصلہ کرنا آسان

نہیں ہے کہ کس زبان کا شعر دوسری زبان کے شعر سے زیادہ لطیف، چست اور کامیاب ہے۔

مرزا کے کردار میں بلند حوصلگی اور رجائیت کے جوہر تابندہ اور درخشندہ تھے۔ وہ ہجوم اندوہ میں اپنے کو "محتشم" قرار دیتے تھے اور امتحان گاہ محبت میں جان دینے کے بعد بھی معشوق سے یہ کہنے کے قائل تھے کہ "امتحان اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی"، ظاہر ہے کہ منزل عرفان میں ان کی حوصلہ مندی کی پرواز کہاں تک ہو سکتی تھی انھیں کے لئے یہ کہنا زیب دیتا تھا کہ۔

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر　　دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھکر

فارسی میں اسی خیال کو بھرپور وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے ملاحظہ ہو۔

چرا به سنگ گیاہ بچپے زبانہ طور　　زراہ دیدہ بہ دل در رود زجانم خیز

جودت طبع کی اس سے بہتر مثال ناممکن ہے،

غالب کے مزاج کی رجائیت کا تذکرہ بھی بالاجمال ضروری ہے۔ وہ مصائب و آلام کا خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کرتے تھے انہوں نے طرح طرح کی دوستوں اور عزیزوں کے ہاتھوں تکلیفیں جھیلیں حوادث روزگار نے ان کو بہت ستایا لیکن وہ ہر تباہی و بربادی میں اپنی جان ناشاد کے لئے تسلی و تشفی کی راہیں تلاش کر لینے کے خوگر رہے چنانچہ کہتے ہیں۔

از بہار رفتہ در مں رنگ و بو دام ہنوز　　در غمت خاطر فریب جان ناشاد ہنوز

ہے ناز مفلسان زر از دست رفتہ پر　　ہوں گل فروش شوخی داغ کہن ہنوز

خاطر فریبی ہو یا شوخی داغ کہن کی گل فروشی اُن کی غرض تسلی و تشفی حاصل کرنا تھی لیکن غم و الام میں مبتلا رہ کر قنوطیت کو کبھی پاس آنے نہیں دیا۔

مرزا کے اردو اور فارسی کلام سے ایک ہی رنگ اور ایک ہی خیال کے اشعار کا تقابل فرض چند مذکرہ بالا اشعار پر ختم نہیں ہوتا ان کا اردو دیوان جو ہمارے پاس موجود ہے بیحد مختصر ہے اور فارسی دیوان مقابلتاً ضخیم ہے جس کی وجہ سے اردو کے ایک ایک شعر کا فارسی کے دو دو یا اس سے بھی زیادہ اشعار میں جواب مل جاتا ہے۔ ان تمام اشعار کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ مرزا کو ایک ہی

مثال میں طرح طرح کے پہلو اور متعدد گوشے نکال لینے کا زبردست سلیقہ تھا اور یہی سلیقہ ایک بلند پایہ شاعر کے لئے معراجِ کمال ہے۔ جو صرف اسی طرح ممکن ہے کہ شاعر کو نہ صرف زبان و خیال بلکہ گہرائی خیال اور وسعت بیان پر بھی پورا پورا قابو ہو اور وہ اپنے اس قابو کو برمحل اور مناسب طریقہ سے استعمال بھی کر سکتا ہو مرزا کی جودت طبع اور فکر رسا ان تمام خوبیوں کی حامل تھی۔

میخواری اور

مرزا غالب !

شراب پینا کسی مذہب میں مستحسن نہیں ہے جہاں جہاں بادہ خواری کی اجازت ہے وہاں بھی اس کے استعمال میں مواقع اور مقدار کی حدبندیاں ہیں اور اس کا دور دبری عادت سمجھا جاتا ہے۔ اسلام نے خصوصیت کے ساتھ خمر سے اجتناب کا حکم دیا ہے مذہبی مسلمانوں نے شراب کو ہمیشہ نجس اور پینے کو حرام جانا ہے۔ یہ سچ ہے کہ باوجود حرمت کے بعض مسلمان اس عادت بد میں ہمیشہ مبتلا رہے لیکن ایسے لوگ بھی پرانے زمانے میں عموماً چھپ کے اور چھپا کے پیتے تھے شاہان دہلی اور شاہان اودھ میں جو حکمران اس شغل کے خوگر تھے وہ ایسے مواقع پر ارباب تقویٰ اور اہل شریعت سے اپنی محفل کو خالی رکھنے کے پابند رہے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب مرزا غالب نے میخواری کی۔ وہ بالاعلان شراب پیتے تھے۔ اور ببانگ دہل پیتے تھے۔ ان کے تعلقات بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں ہی سے نہیں تھے۔ بلکہ بڑے بڑے متقی، پرہیزگار، فقیہہ، مفتی، واعظ اور بعض بیحد برگزیدہ ہستیوں سے بھی ان کے روابط تھے اور ان سب کو مرزا کی شراب خوری کا علم تھا۔ پھر بھی اس کا پتہ نہیں چلتا کہ کسی نے ان کی منقصت کی ہو یا ان کی صحبت سے اجتناب کیا ہو اس کے برعکس ان کے مے کشی کے وقت بھی پابند شریعت شخصیتیں پہنچ جاتی ہیں۔ دھوکے میں بھرا ہوا جام اٹھا لیتی ہیں اور اس غلط فہمی پر ان کی معذرت کا جواب دیا جاتا ہے۔ کہ "دھوکے ہی میں مغفرت ہو گئی" ان کی شراب خواری کیوں گوارا کی گئی اس کے جواب میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ فن میں کمال اور منتہائے کمال کے بعد شخصی عیوب نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ مرزا نے جس طرح اپنے ایک "نشید شوق" کو فن بنا کر شاعری میں کمال حاصل کیا تھا اسی طرح

اسی طرح اپنی مے خواری کو بھی فن کی منزلت تک بلند کر دیا تھا

مرزا کے کلام اور ان کی سیرت کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ ان کے رجحانات، احساسات، اور عقائد مے خواری میں بھی بلندی رہے عالم سرشاری میں بھی وہ کبھی متبذل نہیں ہوئے اور انہوں نے اپنی بادۂ شراب کو دوسرے شاعروں کی شراب طہور کے ہم وزن بنا دیا تھا۔ وہ "مشاہدۂ حق کی گفتگو" میں بھی قائل تھے کہ "بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر" "شراب میں غش" کو ساقی کوثر کے باب میں "سوءِ ظن" سمجھتے تھے شراب کو حرام اور پینے کو گناہ سمجھنے کے باوصف قبر میں منہ سے "بادۂ دوشینہ" کی بو آتے رہنے کی خواہش تھی اور دم نکلتے وقت بھی ساغر و مینا کے آنکھوں کے سامنے دھرے رکھنے کی اس لئے تمنا تھی کہ "گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے"، یہ اور اسی قسم کے دوسرے خیالات کی ترجمانی جو ان کے اردو کے مختصر دیوان میں بکثرت موجود ہے شراب سے ان کی غیر معمولی دلبستگی کو ثابت کرتی ہے لیکن غالبؔ نے شراب نوشی کو کس طرح اور کس حد تک فن بنا دیا تھا اس کو سمجھنے اور پرکھنے کے لئے ان کے فارسی کلام کا مطالعہ ضروری ہے ان کی پسندیدہ شراب، شراب کے لئے ان کی ہوسناکی، شراب خواری میں ان کی نفاست، شراب کے اوصاف و مراتب شراب کی اچھائیاں اور برائیاں ان سب کے تذکرے ان کے فارسی کلام میں مل جاتے ہیں۔ قصائد ہوں یا غزلیات ہر صنف سخن میں شراب کا ذکر ہے

اس گراں قدر ذخیرۂ معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا کی مے خواری صرف اس لئے نہیں تھی کہ وہ یک گونہ بے خودی کے سہارے غم روزگار سے غافل ہو سکیں اور مستی میں سکون حاصل کریں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی مے گساری میں یہ خواہش بھی ایک محرک رہی ہو لیکن ان کے پیش نظر جو حقائق تھے ان میں دقیقہ سنجی کے لئے شعریت کے ساتھ شراب کی گرمی بھی لازمی جزو تھی اور مے ناب سے ان کا ظاہری و باطنی کچھ ایسا ربط قائم ہو گیا تھا جس کی وجہ سے مے خواری ان کے ذہنی ارتقاد کے لئے بڑا سہارا تھی۔ اس ضمن میں حسب ذیل اشعار توجہ طلب ہیں

از گدا زیک جہاں ہستی صبوحی کردہ ایم　　　آفتاب صبح محشر ساغر سرشار ما

نشاطِ لذتِ آزار را نازم کہ در مستی — ہلاکِ فتنہ دارد ذوقِ مرگِ ناگہانی را

غالب امشب ہمہ از دیدہ چکیدن دارد — خونِ دل بود مگر بادۂ دوشینۂ ما

بے خودی کردہ سبکدوشِ فراغ دارم — کوہِ اندوہ رگِ خوابِ گران ست مرا

حصارِ عافیتے گر ہوس کنی غالب — چو ما بحلقۂ رندانِ خاکسار بیا

دیدیم کہ مستیٔ اسرار ندارد — رفتیم و بہ پیمانہ فشردیم جگر ہم

مرزا اپنے غم کے ساتھ ساتھ دوسروں کے غم سے بھی متاثر تھے اور ان کی مے گساری اس لئے بھی کہ غم کی حالت میں روزگار سے تھوڑی دیر کے لئے چھٹکارا حاصل کرکے دوسری طرف بھی متوجہ ہو سکیں۔ اس خواہش میں کوئی تمنا فرار کی نہیں تھی ورنہ یہ نہ کہا ہوتا کہ "کوہ اندوہ رگِ خواب گران ست مرا" یا یہ کہ "خون دل بود مگر بادۂ دوشینۂ ما"، ان کا اصل منشا یہ تھا کہ وہ مادی علائق سے وقتی طور پر اس لئے فراغت حاصل کریں تاکہ مدہوشی میں مستی اسرار سے لطف اندوز ہو سکیں وہ ہوش میں آنے کے لئے شراب پیتے تھے بے ہوشی سے ان کو لگاؤ نہیں تھا۔ وہ جس بے خودی کے قائل تھے وہ حقیقتاً عین خودی تھی اس لئے ان کی پسندیدہ ترین شراب تیز و تند ہوتی تھی۔ کہتے ہیں

زظرفِ غالبِ آشفتہ گر نہ آگاہ — بیازما بطلے تند ہوش دہنگش را

ای مئیم باید کہ چوں ریزم بجام — ز وزے در گردش آرد جام را

بخشش خداوندی گر فراخ ظرفت — ہم بہوش بیشی دہیم مے تونگر کن

غالب ایسی شراب سے اپنے ظرف کی آزمائش چاہتے تھے جو انتہائی تند اور پر زور ہو اپنے دماغ کی صلاحیتوں پر اتنا اعتماد تھا کہ اس کے بارے میں بہک جانے کا خیال بھی نہیں آ سکتا تھا۔ البتہ زورِ مے کے اثر سے جام میں گردش آ جاتی ہے پھر ایسی تیز و تند شراب کے لئے وہ تونگری کی بھی خواستگاری کرتے ہیں بخشش خداوندی سے استدعا ہے کہ زیادہ سے زیادہ شراب ملے اور پینے کے بعد ہوش میں بیشی ہوتی رہے۔ جتنی زیادہ تیز و تند شراب ہو اور اس کی جتنی زیادہ سے زیادہ مقدار ہو اتنی ہی ہوشمندی بھی بڑھتی جائے۔ ان کی یہی خواہش اور یہی تمنا ان کی مے خواری کو دوسروں کی مے گساری سے علیحدہ کرتی ہے اور ممتاز بنا

دیتی ہے۔

اردو شعراء کے یہاں کم اور فارسی شعراء کے یہاں شراب کی تعریف زیادہ ہے اس کی غالباً یہ وجہ ہے کہ ایرانی شعراء نے حقیقت پرستی اور اردو شاعروں کی اکثریت نے رسم پرستی سے کام لیا ہے یہاں تک کہ میر تقی میر کے ایسے متقی پرہیز گار اور نماز گزار شاعر نے بھی" بادہ کشوں کے جھرمٹ ہیں شیشے پر پیمانے پر" کہہ کر شراب خواری کی ایک حسین اور دل کش تصویر پیش کی ہے۔ ایرانی شعراء میں حافظ کا درجہ بہت بلند ہے۔ شارحین نے ان کی شراب کو شراب معرفت سے تعبیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش اس لئے برمحل نظر آتی ہے کہ حافظ نیز دوسرے فارسی شعراء کا کلام تصوف میں ڈوبا ہوا تھا۔ مرزا غالب کے یہاں بھی تصوف کی چاشنی بہت ہے ان کا صرف یہی ایک شعر ؎

ہستی اثر دراو عالم ہمہ اثر دایست | لاجرم ہر ذرہ را آں فرہ دریا مستے

ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہ نہ صرف صوفی منش تھے بلکہ مدارج تصوف میں بلند مرتبہ پر فائز تھے۔ باوجود ان کے بادہ خوار ہونے کے دل یہی چاہتا ہے کہ ہم ان کو ولی مان لیں۔ ان کے شارحین نے بھی ان کی شراب کو شراب معرفت میں ڈبو دیا ہوتا مگر انہوں نے خود اپنی شراب کو مادی شراب ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کر دی۔ میخواری کے سلسلے میں اپنے اوپر طاری ہونے والی سچی کیفیت بیان کرتے ہیں اور خراب قسم کی شراب کی منقصت بھی کرتے ہیں۔ وہ اچھی پی لی، خراب پی لی" کے قائل نہیں تھے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

غالب من و خدا کہ سر انجام برشگال | غیر از شراب و انبہ دیرف آب و قند نیست

شراب قندی ہندوستاں دماغم سوخت | زشیرہ خانہ کشمیرم آورند شراب

غالب شراب قندی بندم کباب کرد | زیں بعد بادہ ہائے گوارا کشیدہ باد

موسم برشگال کے تاثرات لطف اندوز ہونے کے لئے خدا سے داد خواہی کرتے ہیں اور مناظر قدرت کے حسن و جمال سے سرتیں کچھ لینے کے لئے ان لوازمات کا تذکرہ کرتے ہیں جو ان کے لئے ضروری تھیں میخواری کے جواز میں وہ فصل برشگال کی کیفیتوں کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ اسی خیال کو ایک دوسرے شعر

میں یوں کہا ہے کہ۔

فدائے شیوۂ رحمت کہ در لباس بہار بہ عذر خواہی رندان بادہ نوش آمد

انھیں اشعار سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ابتداءً وہ دلّی ہی کی کشیدہ شراب قند یعنی شیرہ کی شراب پیتے تھے وہ ناپسند ہوئی تو شیرہ خانۂ کشمیر کی طرف رخ کیا۔ وہاں بھی دل کباب ہوا تو بادہائے گوارا کشیدہ کی جستجو کی۔ ان کی بعض تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ وہ آخر عمر میں کلیرٹ، شام پین، جن کاک ٹیل وغیرہ استعمال کرنے لگے تھے اس زمانے میں بھی غالباً یہی بہتر شرابیں رہی ہوں گی۔

اس خالص مادّی شراب کے ساتھ جو ناخوشگوار حالات مربوط ہیں وہ بھی ان کو پسندیدہ تھے شراب طہور میں یہ تلخیاں کہاں ہیں اس لئے وہ پکار اٹھتے ہیں ؎ "در بادہ طہور غم محتسب کجا۔ وہ عیش خلد لذت بیم زوال کو" وہ خاموشی و تنہائی میں سرشاری اور سرشاریوں میں آسودگی پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ان کو میخواری کے ساتھ محتسب کا مواخذہ اور سرشاریوں میں بیم زوال کا کھٹکا بھی مرغوب تھا۔ اسی لئے یہ کہنا یقیناً صحیح ہے کہ وہ میخواری میں مصائب والام سے فرار و فراغت حاصل کرنے کے علاوہ کچھ اور بھی چاہتے تھے۔ اور اس ضرورت کو ان کی نکتہ رس، دقیق طبیعت فراہم کر دیتی تھی لہذا ان کو ہمیشہ زیادہ سے زیادہ شراب اور ساتھ ہی ساتھ زیادہ سے زیادہ ہوش کی خواہش رہی یہ ہو سکتا ہے کہ حسب ذیل شعر مبالغہ ہو لیکن اگر لفظی معنوں پر توجہ نہ کی جائے تو مرزا کی حوصلہ مندی کا یہی تقاضا تھا ؎

کفیل ہوش خودم وقت مے بہ بزم حبیب بشرط آنکہ زیک قلزم افزون ندہد

ایک دوسرے انداز میں اپنی عالی ظرفی کو شوخی و طرّاری کے ساتھ جوان کے کلام کا ایک ادر گراں قدر جوہر تھا بیان کرتے ہوئے ساقی سے مطالبہ کرتے ہیں ؎

مے باندازۂ تمام آمدہ ساقی برخیز شیشہ خود بفگن بر سر پیمانۂ ما

ایک دوسرے مقام پر کہتے ہیں

ہائے پرکاری ساقی کہ بہ ارباب نظر مے باندازہ و پیمانہ باندازہ دہد

اس شعر میں" ارباب نظر، شعریت، فصاحت اور معنویت کی جان ہے رندان کرام یا اسی قسم کا کوئی دوسرا لفظ نہ استعمال کرنا ہی ظاہر کرتا ہے کہ مرزا کی بصیرت افروز نظر میں شراب کی قدر و منزلت کیا تھی۔ اور ان کے نزدیک اس کا مصرف کیا ہونا چاہیے تھا۔

فارسی کے مستند اساتذہ نے میخواری کے لئے بعض لوازمات بھی ضروری قرار دیے تھے۔ خیام مادی دنیا اور مادیت سے بہت قریب تھا۔ اس لئے اس کو" مغز گندم نانے"، "زگوسفندے رانے وزمے دو منے" کے علاوہ "من و تو نشستہ در ویرانے" کی بھی تمنا تھی حافظ عرفانیات و روحانیات کی دنیا کے آدمی تھے۔ پھر بھی انہوں نے " دو یار زیرک و از بادہ کہن دو منے" کے ساتھ ساتھ "فراغتے و کتابے وگوشہ چمنے"، کی آرزو کر کے لوازمات میخواری میں وسعتیں پیدا کر دی تھیں ان دو جلیل القدر اساتذہ کے لوازمات میخواری کے مقابلے میں ہم اپنے ہندی نژاد اور مرزا ایدو ستار سے آراستہ شاعر کے جذبات کا تجزیہ کرتے ہیں تو وہ یہ کہتا ہے ؎

زبہر بادہ ہوا خواہ باد و باراںند   زرع و کشت نشناسند جز بہ تنگی باغ

یہ اولوالعزم اور بلند نظر شاعر اس بات کا قائل تھا کہ جب زمین پر فیضان الٰہی کی بدولت شراب کی ایسی نعمت نصیب ہو تو آسمان سے بھی رحمت پروردگار کا نزول ہوتے رہنا ہی مکمل فرحناکی اور شادمانی کا ضامن ہو سکتا ہے۔ وہ شراب کو ابر و باد کے ساتھ توام رکھنے میں کیف و لذت کا ذریعہ سمجھتا تھا یہی وجہ تھی کہ حالات کے تحت شراب چھٹتی تھی تب بھی روز ابر و شب ماہتاب میں دل نہیں مانتا تھا اور وہ کسی نہ کسی طرح سرشاریوں میں فطرت سے ہم آغوش ہو کر وجدان اور سرور حاصل کر لیتا تھا۔

مرزا کو شراب سے اتنی شدت کے ساتھ وابستگی تھی کہ وہ عندالضرورت شراب قرض خریدتے۔ خریدنے کے لئے روپیہ قرض لیتے اور اپنے بے تکلف دوستوں سے جن میں مرزا تفتہ کا نام نامی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ فرمائشیں بھی کیا کرتے تھے اس لئے ان کی میگساری یقیناً ہر روز کا وردہی ہوگی۔ پھر بھی ان کے اردو کلام میں بعض اشعار ایسے ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی شراب

کبھی کبھی قہراً چھوٹ جاتی تھی اور کبھی کبھی وہ خود چھوڑ بیٹھتے تھے۔ ملاحظہ ہو ؎

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

یہ دونوں اشعار توجہ طلب ہیں ہو سکتا ہے کہ دوسرا شعر زندگی کے آخری دور میں کہا ہو جب دماغ و دل کی گرمیاں ٹھنڈی پڑ چکی ہوں اور انحطاط و خستگی نے سرشاریوں کے ذوق کو بھلا دیا ہو لیکن پہلا شعر یقیناً افلاس کی پیدا کردہ مایوسی کی آواز ہے۔ ان حالات میں ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مرزا جب بھی اور جب تک پی سکے پیتے رہے لیکن میخواری کے لئے وہ انہیں مولدوں اوقات کی بھی سے پابندی کرتے تھے جو آج کی مہذب اور شائستہ سوسائٹی میں بھی رائج ہیں یعنی یہ کہ وہ بعد غروب آفتاب پیمانہ بکف طلوع ہوتے تھے اور کبھی کبھی دوپہر کو بھی یہ شغل ہو جاتا تھا۔ یہ بات ہر حال قابلِ لحاظ ہے کہ دوپہر کو جس شراب کا تذکرہ ملتا ہے وہ "کلور" کہی گئی ہے جس کو ہم فرانسیسی وائن کلیرٹ سمجھنے پر اس لئے مجبور ہیں کہ مرزا اس شراب کے چھوٹے چھوٹے گلاس بلا کسی آمیزش کے چھال کے پی لیتے تھے شام کے وقت پینے والی شرابوں میں آمیزش ہوتی ہے جس کے لئے غالب کی نفاست طبع نے عرق گلاب تند و آتش کو پسند کر رکھا تھا عرق گلاب خوشبو بخشتا، شراب کی تندی میں اضافہ کرتا اور شراب کے نقصانات کو بھی معتدل کرتا تھا یہی آمیزش ان کو بہت مرغوب تھی کہتے ہیں ؎

آسودہ باد خاطر غالب کہ خوئے اوست
آمیختن بیادۂ صافی گلاب را

ایرانی اساتذہ نے اور اردو شاعروں نے بھی فارسی کی تقلید کرتے ہوئے اوقاتِ مے نوشی کے سلسلہ میں روزِ ابر و شبِ ماہتاب کے علاوہ "صبوحی" یعنی علی الصباح کی مے نوشی کو بہت سراہا ہے۔ حافظ کہتے ہیں ؎ "صبح است ساقیا قدحے پر شراب کن" اور ایک مقتدر اردو شاعر اپنی مثنوی میں فرماتے ہیں "صبوحی صبحدم اپنا وظیفہ" لیکن مرزا صرف۔ راتوں کو غرقِ مے ناب کر دینے کے قائل تھے اور جب بادہ دوشینہ کی سرمستیوں سے محروم ہوتے تو یہ کہہ کر آنسو بہا لیتے تھے کہ ؎

"اٹھے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی"۔ ان کے فارسی کلام میں موجود ہے چند اشعار ایسے

ملتے ہیں جن میں "صبوحی" کا لفظ یا صبح کو شراب پینے کا ذکر ہو مثلاً

ازگداز یک جہاں ہستی صبوحی کردہ ایم
آفتاب صبح محشر ساغر سرشار ما

صبح است خوش بود قدح بر شرر آزد
یاقوت بادہ بر قوہٴ آفتاب زد

نشوی رحبہ گار رنداں بصبوحی کاین قوم
نفس باد سحر غالیہ سا نیز کنند

پہلے شعر میں یقیناً وہ صبوحی نہیں ہے جس کا مے نوشی سے براہ راست تعلق ہو یا یہ کہ اس کی تمانیت فارسی اساتذہ کی "صبوحی" سے ہو اور باقی دونوں شعروں میں مرزا غالب کی قادر الکلامی اور نادر الخیالی ہی نظر آتی ہے جو بادہ پرست رات کو محفل شراب کی گرمی اس طرح محسوس کرے کہ "چناں گرم ست بزم از جلوہ ساقی کہ پنداری بگداز جوہر نظارہ درجام است رنداں را" اور جو اداشناس ساقی کو مخاطب کرکے یہ کہہ سکتا ہو "ادائے بہ ساغر گردنت نازم زہے ساقی۔ بیفشاں جرعہ بر خاک و زمن بگزر کہ مدہوشم" اس کو رات بھر کی سرشاری اور مدہوشی کے بعد صبوحی کی طرف رغبت ہو ہی نہیں سکتی وہ صبح کو لذت خواب سحری کے مزے لوٹ سکتا ہے اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ غالب کی میخواری میں صبوحی کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔

زاہدوں، عابدوں، اور محتسب کی ادیبوں اور شاعروں نے ٹوپیاں اور کلاہیں خوب خوب اچھالی ہیں اور ان کو نشانہ بنایا ہے شعراء فطرت کے ترجمان اور حقیقت پرست ہوتے ہیں اس لئے زاہدوں اور عابدوں کی ریاکاری سے جو اُن کی عادت ثانیہ رہی ہے ہمیشہ گریز رہا اور ان کی اس خصلت کو انھوں نے مذموم سمجھا مرزا کے بھی یہی رجحانات تھے لیکن ان کے طرز ادا میں ایک انوکھا پن ہے جس کو ہم ان کی انفرادیت ہی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ دوسرے شعراء اپنی نظر کے سامنے مکر و ریا کے عیوب رکھ کر ریاکاروں کی منقصت کرتے ہیں۔ مرزا غالب اپنی شخصیت بحیثیت ساغر بکف مقابلہ پر اتر آتے ہیں کبھی یہ کہتے ہیں کہ

سخن کوتہ مرا ہم دل بہ تقوی مائل ست اما
ز ننگ زاہد افتادم بکافر ماجرائیہا

کبھی ان کی حقیقت بین نظر عابدوں کے لباس کے اندر اُس مکر و فریب کا جائزہ لیتی ہے جو تقوی کے ظاہری خول میں چھپا ہوتا ہے اور اس پر مرزا کا دل بے چین ہو جاتا ہے اور وہ پکار اٹھتے ہیں۔

دلم ز سجۂ و سجادہ و ردا لرزد — کہ دزد مرحلہ بیدار و پارسا خفت است

یہاں تک تو شاید بعض دوسرے اساتذہ بھی سوچ لیتے اور کہہ جاتے لیکن مرزا کو جام شراب میں عرفان و وجدان کے جوہر نظر آتے ہیں اس لئے وہ زاہدوں اور عابدوں کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ شراب کا ایسا جوہر ناب ان کو پیش کیا جا سکے۔ وہ اتنے ریاکار ہیں کہ سجدۂ حق ادا کرنے پر بھی ان کی پیشانیاں نورانی نہ ہو سکیں ؎

مے بزہاد مکن عرض کہ این جوہر ناب — پیش این قوم بشورابۂ زمزم نرسد

نگشت از سجدۂ حق جبہ زہاد نورانی — چنان کافروخت تاب بادہ رخ بادہ خواران را

جو فضیلت مآب شورابۂ زمزم کہہ سکتا ہے وہ اپنی شراب کو نہ صرف پاک بلکہ پاک کر دینے والی چیز کہنے کا بھی حق رکھتا ہے اس لئے کہ اس کا کردار ریاکاری سے پاک و صاف ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مے خواری ریاکاری کو دھو دیتی ہے۔

آلودۂ ریا نتوان بود غالبا — پاک ست خرقہ کز مے نشست و شو کنند

اساتذہ نے میخواری کے ساتھ جامہ احرام اور کعبہ کو شامل رکھنا ضروری قرار دیا ہے صوفی منش شاعروں کے یہاں بھی جامہ احرام پر شراب کے دھبے پڑے ہیں لیکن ان کے پاس شراب معرفت تھی۔ مرزا مادی شراب کے دلدادہ تھے اسی لئے ان کا طرز بیان کچھ اور ہی ہے ؎

بگنا ہم بیرزد ہیمہ از من مرنج — من بہ مستی بستہ ام احرام را

کبست در کعبہ کہ رطلے ز نبیدم بخشد — ور گروگان طلبد جامۂ احرام مے است

بہ صحن میکدہ سرمست می توان گردید — بہ کنج صومعہ وقف نماز باید بود

سرمستی اور کار گزاری کے علیحدہ علیحدہ مقامات بیان کر کے مرزا نے میخواری کے باوصف اپنی ہوشیاری کی مثال بھی پیش کی ہے۔

رندی و میخواری کا منفی پہلو زہد و تقویٰ سے بیزاری ہے اور مثبت دقو ... ... شاہد بازی ہے چنانچہ ہمارے تمام شعراء نے شاہد و شراب کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے یوں تو شراب کی تعریف

میں "حسن را پروردگارے، عشق را پیغمبرے" بھی کہا گیا ہے لیکن ہمارے موضوع کی وضاحت کے لیے دو اساتذہ کے یہ اشعار کافی ہیں۔

چو دو گلِ رخسار دو دز آتش مے برفروخت ۔۔۔ شمع شبستان گداخت تنگ گلستاں شکست ۔ عرفی

فروغ گل نبود چاک پیرہن بکشا ۔۔۔ شمیم گل نوز دا آستین فشاں برخیز ۔ نظیری

ان دونوں اشعار سے یہ کیفیت نظر کے سامنے آتی ہے کہ معشوقہ بادہ نوش ہم پیالہ ہے عرفی اس کے چہرے کی کیفیت اور اس کے اثرات نظر کرتا ہے ـــــ نظیری کے دل کو تسکین نہیں ہے، وہ اپنی فرحناکی کے لئے کچھ فرمائشیں کر رہا ہے لیکن دونوں جگہ معشوقہ کی موجودگی اور شرکت میں بادہ خواری مسلم ہے مرزا بھی اس شرکت میگساری کی قدر کرتے ہیں اور ایسے موقع کے لئے کہتے ہیں ؎

بادوست ہر کہ بادہ بخلوت خورد مدام ۔۔۔ داند کہ حور و کوثر و دار السلام چیست

لیکن اس شعر میں مزہ نہیں ہے کیونکہ آپ بیتی نہیں ہے ان کے کلام میں معشوقہ بادہ نوش کی تمنا ضرور ہے مگر اس تمنا کے برآنے کا کہیں ذکر نہیں ملتا اور نہ عرفی و نظیری کی طرح تخیل اور دماغی صلاحیتوں کو اس طرز فکر کی طرف آمادہ کرنے کی کوئی کامیاب مثال ملتی ہے۔ بلکہ اس کے برعکس تمنائے معشوقہ بادہ نوش کی محرومی ہی پر انھوں نے آنسو بہائے ہیں۔ پھر بھی میخواری و شاہد بازی کے موضوع پر حسب ذیل اشعار اپنا جواب نہیں رکھتے :۔

نازم فروغ بادہ ز عکس جمال دوست ۔۔۔ گوئی فشردہ اند بجام آفتاب را

آلبش دم بباد داو ہر دم از تمیز ۔۔۔ نوشدہ ے ز جام فرو ریزد آب را

گل از نزادش شبنم بر تست چشمک زن ۔۔۔ ز رخت خواب بہائے مے چکاں برخیز

رحمت حق باہر مدام کہ داند مست مست ۔۔۔ بر سر نعشم بہ تقریب نماز آور دنش

خراب بادۂ دوشینہ سرت گردم ۔۔۔ ادائے لغزش پائے کہ داشتی داری

دم ہیچوئی واد رشک می میرم کہ در مستی ۔۔۔ چرا زان گوشۂ ابرو اشارت کامیابستے

چہ پرسی کز لب وقت قدح نوشی چہ میخواہم — ہمیں بوسیدنی چوں مست تر گردی مکیدن ہم

وہ شوخ طبیعت جس کے ہاتھ پاؤں معشوق کے اس سوال کہ بھول جائیں کہ "ذرا میرے پاؤں داب تو دے"، اور وہ تیز مزاج جو تفنن طبع میں پیش دستی" کی جسارت بھی کر لیتا ہے، اس کی زبان سے قدح نوشی کے وقت "مکیدن"، کی خواہش کا اظہار زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ہم اس کو مرزا کی افتادِ طبیعت ہی کہہ سکتے ہیں۔ اس ایک شعر کے علاوہ باقی دوسرے یا اسی قبیل کے تمام اشعار مرزا کے طرزِ فکر، طرز ادا ان کے کمالِ فکر کے بہترین نمونے ہیں یہ حقیقت بہر حال برقرار رہتی ہے کہ ان کی میخواری کو ایسے محرکات سے جن میں جنسی تحریک بھی شامل ہے۔ کوئی سروکار نہیں تھا لہذٰا یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ ان کی میخواری تمام جنسی علائق سے دور تھی اور وہ اسی رجحان کے دلدادہ تھے،

مرزا کے اس مخصوص طرزِ میخواری برائے میخواری میں بھی ان کا انفرادی رجحان کار فرما تھا۔ ہم ان کے اس شوق کو کسی طرح بھی "عادتِ خمر" تک محدود نہیں کر سکتے کیوں کہ عادتِ خمر عیب ہے مگر ان کے نزدیک رندی اور شراب دونوں کی ایک عظیم منزلت تھی۔ کہتے ہیں ؎

شیوۂ رندان بے ہمہ و اخرام از من مپرس — ایں قدر دانم کہ دشوار ست آساں زیستن

شراب کے بارے میں جو کچھ انہوں نے کہا ہے اس کی بہت سی مثالیں اوپر آچکی ہیں۔ چند اشعار اور ملاحظہ فرمائیے ؎

بادۂ مشکبوئے ما بید و کنار کشت ما — کوثر و سلسبیل ما طوبئے ما بہشت ما

شبم تاریک و منزل دور و نقش جادہ ناپیدا — ہلاکم جلوۂ برقِ شراب گاہ گاہے را

مستیِ دل دیدہ را محرمِ اسرار گرد — بیخودی بپردہ دار پردہ در افتادہ است

نشاطِ جم طلب از آسمان نہ شوکتِ جم — قدح مباش ز یاقوت بادہ گر عنبی است

ریحان دمد از مینا رامش چکد از قلقل — آن در رہ چشم افگن۔۔ ایں از پئے گوش آور

وہ شراب جو جام وسبو کے سہارے کام و دہن تک پہنچی ہے۔ مرزا اس کو چشم و گوش سے پیتے ہیں مستیِ دل سے دیدۂ بصیرت کو محرمِ اسرار کرتے ہیں شب تاریک میں دور منزل کا راستہ اسی کے

کے سہارے تلاش کرتے ہیں، قدحِ یاقوت کو ٹھکرا کر بادۂ عنب سے نشاط بہم حاصل کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ تعیشِ دماغی، تفننِ طبع، تفریحِ مزاج، مکروہات سے فراغ، تجسسِ حقائق وغیرہ وغیرہ ان سب کے حصول کا واحد ذریعہ شراب ہے۔ دوسرے اساتذہ کے یہاں خمرِ کیف اور شرابِ معرفت کے گراں قدر اور انتہائی لطیف و خوشگوار تذکرے ہیں لیکن غالب کی شراب کہیں اور نہیں ملتی۔

شراب کی ان تمام خصوصیات و کرامات کو تسلیم کرتے ہوئے مرزا نے اس کے استعمال کے حدود بھی معین کیے ہیں اور بعض حالات میں میخواری کو حرام بھی قرار دیا ہے شراب کے بارے میں ان کا یہ فیصلہ حرفِ آخر کہا جاسکتا ہے۔

پیمانہ بر آں مند حرام است کہ غالب　　　در بیخودی اندازۂ گفتار نداند

میخواری کو گناہ جانتے اور میخوار ہونے پر اپنے کو آدھا مسلمان کہتے ہوئے بھی نہیں شرماتے لیکن اس گناہ کی سزا کے بارے میں یہ ضرور کہا ہے کہ

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے　　　آخر گنہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

اس ذیل میں یاد آرہا ہے کہ وہی غالب جو "می نوش گنہ بر من اگر بادہ حرام است" کا آوازہ بلند کرتے تھے، اپنی مے نوشی کو معصیت تسلیم کرتے ہوئے داورِ محشر کے روبرو خود اپنی وکالت اس طرح کرتے ہیں

همانا تو دانی کہ کافر نیم　　　پرستارِ خورشید و آذر نیم

مگر مے کہ آتش بگورم ازوست　　　ہنگامہ پرداز موروم ازوست

من اندوہگیں و مے اندوہ ربائے　　　چہ می کردم اے بندہ پرور خدائے

حساب مے و رامش و رنگ و بوئے　　　ز جمشید و بہرام و پرویز جوئے

کہ از بادہ تا چہرہ افروختند　　　دلِ دشمن و چشم بد سوختند

نہ از من کہ از تابِ مے گاہ گاہ　　　بدریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ

شبانگہ بہ مے رہنمونم شدی　　　سحر گہ طلبگارِ خونم شدی

انھیں چند اشعار سے مرزاؔ کی پوری عذر خواہی کا تصور سامنے آجاتا ہے ظاہر ہے کہ ایسے مصیبت زدہ، عالی دماغ، عالی ہمت، حقیقت شناس اور حقیقت پرست مفکر و شاعر کی بادہ خواری گناہ ہی سہی لیکن عذاب شدید کا مستوجب قرار نہیں پائے۔ خدا کا رحم اس کے غضب پر غالب آسکتا ہے مرزا یہ کہنے میں یقیناً حق بجانب ہیں ؎

بادہ اگر بود حرام بذلہ خلافِ شرع نیست دل نہی بر خوب ما طعنہ مزن بہ بخت ما

بلندی کردار اور مرزا غالبؔ

کہا جاتا ہے کہ شاعر کا کلام اس کے کردار کا آئینہ دار ہوتا ہے اس اصول کے تحت اگر ہم مرزا غالب کے کردار کا ان کی اردو اور فارسی غزلیات میں مطالعہ کریں تو ہم کو مرزا کی شخصیت بہت بلند اور ان کا کردار اعلیٰ نظر آئے گا لیکن بادی النظر میں ان کے فارسی قصائد پڑھنے کے بعد وہی کردار بہت مختلف نظر آتا ہے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا خلعت اور جاگیر کے بے حد دلدادہ تھے اور اس کے حصول کی جد وجہد میں وہ اپنے وقار کو پست کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ اس اعتراض کے پیدا کرنے میں وہ سترہ قصائد مؤید بن جاتے ہیں، جو اُن کے فارسی کلیات میں قصائد نمبران ۲۹ لغایت ۴۵ کے تحت درج ہیں جن میں دو قصیدے ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں اور باقی گورنروں، لیفٹنٹ گورنروں اور بعض دوسرے اعلیٰ انگریز عہدہ داروں کی تعریف میں ہیں۔

ہمارے سامنے اگر مرزا کے کلام کا یہی مجموعہ ہوتا تو شاید اس اعتراض پر غور کرنے کے لئے ہم سنجیدگی سے آمادہ ہو جاتے لیکن ان کا فارسی کلام جس کے مقابلے میں قصائد کسی شمار میں نہیں آسکتے اس اعتراض کے سارے وزن کو گرا دیتا ہے۔ مرزا کی غزل کا صرف ایک شعر اس اعتراض کا شافی مکمل جواب بن جائے گا۔

آں کو بخلوت با خدا ہرگز نہ کردے التجا   نالاں بہ پیش ہر کسے از جور افلاکش نگر

مرزا کے قصائد کی مجموعی تعداد چونسٹھ (۶۴) ہے جن میں بارہ حمد و نعت و منقبت پر مشتمل ہیں قصائد نمبران ۱۳ لغایتہ اٹھائیس میں شاہان دلّی اور اودھ کی مدح سرائی کی گئی ہے اور نمبران ۴۶ لغایتہ ۶۴ میں راجگان، روساء اور عمائدین کی تعریفیں ہیں اس تمام مجموعے پر سرسری نظر ڈالنے سے ایک بات تو یہ سامنے آتی ہے کہ اُس دور میں بادشاہوں اور حاکموں

کی تعریف کرنا معتبر شعراء کا فریضہ تھا۔ دوسرے یہ کہ قصائد ہی کے ذریعے سے اپنے حاجات پیش کیے
جاتے تھے۔ چنانچہ قصیدہ نمبر ۳۵ میں جو چارلس مٹکاف کو پیش کیا گیا تھا۔ مرزا نے اپنی تکالیف و
مصائب کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ کرکے دادخواہی چاہی تھی۔ یہ صورت حال اس قصیدے سے بھی واضح
ہے کہ عرض مدعا کرنے میں بھی مرزا نے اپنی آن بان برقرار رکھی تھی۔ اس لئے انکی قصیدہ گوئی میں مدحت
سرائی، اور بادشاہوں، حاکموں اور ریسیوں ... درباردداری کے خلاف نکتہ چینی مناسب نہیں معلوم
ہوتی۔ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کو پیش نظر رکھا جائے تو ان کے کردار کے متعلق خراب رائے قائم
کرنے کے لئے اور بھی کوئی جواز نہیں ملتا۔ بلکہ یہ تسلیم کرلینا پڑتا ہے کہ اس قسم کے قصائد لکھ کر پیش کرنا مرزا
کے فرائض منصبی میں داخل تھا کیوں کہ زیادہ تعداد ایسے قصیدوں کی ہے جو کسی نہ کسی مخصوص موقع سے متعلق
ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ قصیدے فرمائش کرکے ہی لکھوائے گئے ہوں۔

اس زمانے کے حالات ہر شخص کے پیش نظر تھے۔ دلّی اور اودھ کی سلطنتیں مٹ رہی تھیں۔ ہر حساس
کی نظروں کے سامنے خطرات تھے۔

مرزا کی آنکھوں نے تو یہ بھی دیکھا تھا کہ دلّی کا چوک "مقتل" اور ہر گھر "نمونۂ زندان" بن گیا تھا۔
اور "ہر سلحشور انگلستان" کا "فعال مایریٰد" ہو رہا تھا۔ ان تمام احساسات و مشاہدات کے بعد انگریزی
افسروں اور حکام کی شان میں قصیدے کسی قلبی لگاؤ کی بنا پر نہیں کہے جاسکتے تھے۔ حقیقت
امر یہ ہے کہ مرزا کی زندگی بیحد عسرت اور تنگدستی میں گزری جس سے وہ بہت تنگ رہتے تھے ان کا یہ
قول تھا کہ۔

"جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا ۔۔۔ وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو"

یہی عسرت و تنگدستی ان کو مجبور کرتی تھی کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے حالات قصیدوں کے ذریعہ
پیش کرکے نہ صرف دادخواہی بلکہ حق طلبی بھی کرتے رہیں۔

قصائد کا مطالعہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ شاہان دلّی اور اودھ کی شان میں جو کچھ انھوں نے کہا ہے
وہ دوسرے قصائد سے مختلف ہے۔ ان بادشاہوں کی تعریف میں خلوص، محبت اور احترام کے

جذبات جھلکتے ہیں۔ لیکن یہ بات دوسری جگہ نہیں ملتی اور دوسرے قصائد میں اپنا حالِ زار بیان کرنے میں بھی اپنا وقار ملحوظ رکھا ہے۔

ایسے قصائد کو نظر انداز کر دیا جائے تو ان کے کردار کا اصل خد و خال ان کی غزلوں بالخصوص فارسی غزلوں میں واضح ہو جاتا ہے جن میں وہ اپنا حالِ زار مزے لے کر بیان کرتے اور غم میں لذت بھی محسوس کرتے ہیں۔ چند شعر ایسے پیش کئے جاتے ہیں جو یقیناً ان کے حالات کا جاں گداز مرثیہ ہیں یہی اشعار یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ ان کے رجحانات غم کے سلسلے میں کیا تھے۔

روئے سیاہ خویش ز خود ہم نہفتہ ایم — شمع خموش کلبۂ تار خودیم ما

گشتہ در تاریکیٔ روزم نہاں — کو چراغے تا بجویم شام را

درازیٔ شب و بیداریٔ من ایں ہمہ نیست — ز بختِ من خبر آرید تا کجا خفتست

مادِ خاکِ رہ گزر بر فرقِ عریاں ریختن — گل کسے جوید کہ او را گوشۂ دستار ہست

عمرم بہ تیرگی بسر آوردہ ام کہ مرگ — شادم بہ روشنائیٔ شمعِ مزار کرد

از درختانِ خزاں دیدہ نباشم کایںہا — ناز بر تازگیٔ برگ و نوا نیز کنند

ہیچ میدانی کہ غالب چوں بسر بردم کہ ہم — سنگ طبعِ بلبل و شغلِ سمندر داشتم

متذکرہ بالا اشعار کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ ان کو اپنی زبوں حالی پر جو ہمیشہ ان کے شاملِ حال رہی، افسوس رہا اور وہ اس سے متاثر ہوتے تھے لیکن ان کو روشنی کی جستجو میں شمعِ مزار سے ہی شادمانی کا جذبہ پیدا ہوتا تھا، اپنے حالِ زار سے مشتعل ہو کر اپنے سے اپنا منہ چھپانے، تباہی و بربادی میں فرقِ عریاں پر خاکِ رہ گزر اڑانے، درختانِ خزاں دیدہ سے بھی زیادہ بے برگ و نوا ہونے اور طبعِ بلبل رکھتے ہوئے بھی شغلِ سمندر کی گرمیاں جھیلنے کے باوصف یہ مرزا ہی کا کلیجا تھا کہ وہ پکار پکار کر کہتے ہیں کہ "ز بختِ من خبر آرید تا کجا خفتست" کہنا پڑتا ہے کہ باوجود ہجومِ آلام و مصائب کے ان میں رجائیت کوٹ کوٹ کے بھری تھی اور وہ ایک بہت مضبوط کردار کے مالک تھے۔

ہر عظیم شاعر زندگی کا غائر مطالعہ کرتا ہے اور انسانی جذبات و احساسات کی گہرائیوں میں

اُثر کرتا متاثر ہوتا اور اپنے تاثرات الفاظ میں پیش کرتا ہے اسی الفاظ میں ترجمانی کا نام شاعری ہے جو فن کے درجہ تک بلند ہو جاتی ہے۔ مرزا نے اس فن میں بدرجہ اتم مہارت حاصل کر لی تھی۔ وہ زندگی کو وبالِ جان بھی سمجھے، غموں کو بھی آزما دیکھا، اس کے باوجود جینے کی تمنا کی اور انھوں نے زندگی سے مسرتوں کو نچوڑ لینے کی بھی کوشش کی۔ یہی وجہ تھی کہ بہت نکلنے پر بھی اُن کے ارمان کم نکلے اور ان کو ایسی خواہش کا اظہار کرنا پڑا۔

اندراں روز کہ پرسش رود از ہرچہ گذشت
کاش با ما سخن از حسرت ما نیز کنند

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی داد ملے ایک ایسی تمنا تھی جو ان کا آسرا بنی رہی اور وہ جنت کے تعیش کو بھی دنیاوی تکالیف کا بدل نہیں قرار دے سکے۔ کہتے ہیں:

"جنت نکند چارۂ افسردگیِ دل
تعمیر باندازۂ ویرانیِ ما نیست"

اسی خیال کو اردو میں یوں کہا ہے۔

"دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ باندازۂ خمار نہیں ... ہے"

ان کے یہ مصائب محض غربت اور تنگدستی کا نتیجہ نہیں تھے۔ ان کو "اوضاعِ ابنائے زماں" سے بھی یہ شکایت تھی کہ۔

"بدی کی اس نے، جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی"

اس احسان فراموشی، ناانصافی اور تنطلم کی وجہ سے وہ ایسے "مردم گزیدہ" ہو گئے تھے کہ آئینہ سے ڈرنے لگے تھے ایسے رجحانات رکھنے والے کو دنیا اور علائق دنیا سے بیزار ہونا چاہیئے۔ لیکن مرزا جب دنیا کی برائی کرتے ہیں تو اس میں بھی رغبت کا شائبہ نظر آتا ہے۔ چشم بصیرت سے دنیا کو دیکھتے ہیں، بیکسی اور مجبوری حساس دل میں اذیت پیدا کرتی ہے لیکن طبیعت میں رجائیت دنیا سے تعلق رکھنے پر ڈھونڈھ کے راستے نکال دیتی ہے "طرز تپاک اہل دنیا دیکھ کر" ان کا دل جل جاتا ہے لیکن دل لگی کے لئے بہانے تلاش کر لیتا ہے۔

زگل فروشی نتانم کہ اہل بازار است
تپاک گرمیِ رفتارِ باغبانم سوخت

اے سبزۂ سرہ از جور پاچہ نالی — در پیش روزگاراں گل خوں بہا ندارد

ہر شاعر دنیا کا شعار کج ادائی اور بے وفائی قرار دیتا ہے مرزا بھی دنیا کا رونا روتے ہیں لیکن چونکہ شکایت اپنوں سے کی جاتی ہے اس لئے وہ باغباں کے شاکی ہیں اور سبزۂ سرہ کو اس کی پائمالی پر تسکین دینے کے لئے گل کے ہر دم خون بہا ہونے کا سانحہ پیش کرتے ہیں لیکن ان تمام احساسات غم کے باوصف وہ زندگی کی قدر بھی کرتے ہیں غم کو غم سمجھتے ہوئے اس میں لذت تلاش کرتے ہیں اس کو دفع کرنے کی خواہش بھی ہے اور یہ خواہش نہ بھی پوری ہو تو تجسس اور جستجو ہی میں لذت محسوس کرتے ہیں۔

داغ ناکامی حسرت بود آئینہ وصل — شب روشن طلبی رد زسیاہی دریاب

فرصت از کف مدہ و وقت غنیمت پندار — نیست گر صبح بہاری شب ماہی دریاب

از ہر بن مو چشمۂ خوں باز کشاد...م — آرائش بستر زشفق می کنم امشب

بینوائی بین کہ گر در کلبہ ام باشد چراغ — بخت را نازم کہ با من دولت بیدار نیست

خوش ست آنکہ با خویشتن جز غم ندارد — ولے خوشتر ست آنکہ ایں ہم ندارد

غم کے فلسفے کو مرزا نے یوں سمجھا ہے کہ زندگی ہی کا دوسرا نام غم ہے "قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں" لہٰذا "مرنے سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں" یہ صورت حال ہے تو انسان کا فریضہ ہے کہ وہ غم کا خوگر ہو جائے کیوں کہ رنج کا خوگر ہو جانے سے غم کی تکلیف مٹ جاتی ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ساری مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں لیکن پھر بھی مرزا کی علوئے ہمت غم سے خوگر ہو جانے پر قناعت نہیں کرتی وہ اس وادی کے بادیہ پیما تھے جہاں موت بھی آخری منزل نہیں قرار پاتی تھی۔ فرماتے ہیں :

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی — امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

اس عالی ہمتی کو تصور میں لانا بھی دشوار ہے۔ اسی کے ساتھ ان کا فلسفۂ حیات یہ تھا کہ غم میں حلاوت پیدا کرنا چاہئے اور اس سے اتنی لذت حاصل کرنا چاہئے کہ مسرتوں کی ضرورت

نہ تھے وہ تلاشِ طرب کو معیوب قرار دیتے ہیں اور اس کو پست چیز سمجھ کر تلاشِ مسرت کو ننگ سمجھتے ہیں۔

سبکریست بدریوزۂ طرب رفتن   خوشا دلے کہ باندوہ محتشم گردد

اندوہ سے جو دل محتشم بن سکے وہ یقیناً بے حد گراں قدر ہے اور ایسا دل رکھنے والا انسان یقیناً ایک بڑے کردار کا مالک قرار پاتا ہے۔ مرزا نے اسی کردار کا مظاہرہ دنیا اور علائق دنیا کے سلسلے میں کیا اور ان کے یہی تیور حسن و عشق کی داستانوں میں بھی نظر آتے ہیں۔ گو کہ ان کے مزاج میں بلا کی شوخی بھری تھی۔ معشوق پاؤں دبانے کو کہے تو ان کے ہاتھ پاؤں خوشی کے مارے پھول جاتے تھے۔ کبھی وہ خود ایسی پیش دستی کر دیتے ہیں کہ معشوق دھول دھپا کرنے پر اتر آتا ہے۔ کبھی یہ خواہش ہوتی ہے کہ معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہئے" اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ

می ربایم بوسہ و عرض ندامت می کنم   اختراعے چند در آدابِ صحبت می کنم

لیکن ایسی تمام حرکات بظاہر والہانہ نظر آتی ہیں کیوں کہ کیفیت بھی انسان کی ہر لحظہ بدلتی ہوئی طبیعت میں پیدا ہو سکتی ہے لیکن مرزا کا اصل کردار ان کے دوسرے ہی جذبات میں جھلکتا ہے جن کی ترجمانی ان اشعار میں ملتی ہے۔

نظر فروز ادا ہا بدشمن ارزانی   بمن سپار اگر داغِ سینہ تابے ہست

پا بر بساط دلبری عام مکن ادائے لطف   یا ز نگاہ خشمگیں مژدۂ امتیاز دہ

یہی وہ منزل ہے جہاں مرزا کی انفرادیت اپنی بھرپور طاقت کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ وہ مژدۂ امتیاز کے لئے نگاہِ خشمگیں اور نظر فروز اداہا کے مقابلے میں داغِ سینہ تاب کے متمنی ہیں درد کا خوگر ہو جانے کے بعد اسی طرح درد میں لذت حاصل ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہنے میں یقیناً حق بجانب ہیں۔۔۔۔

بجز سوزندہ اخگر گل نہ گنجد در گریبانم   بد آموز عتابم بر نتابم مہربانی را

کردار کے سلسلے میں کفر و اسلام کی بحث بھی آجاتی ہے اس موضوع پر طرح طرح سے برابر کہا جاتا رہا ہے اور بسا اوقات رسمی طور پر یا تفنن طبع کے لئے کفر کو سراہا دیا جاتا ہے لیکن عرفی کی طرح

جس نے یہ کہا تھا کہ "

من کجا کشمکش رد و قبول از کجا　　نیک رفتم کہ نہ کافر نہ مسلماں رفتم

مرزا بھی زندگی بھر اسی مسلک پر گامزن رہے وہ کہتے ہیں ؎

"خوش بود فارغ ز بند کفر و ایماں زیستن　　حیف کافر مردن و آوخ مسلماں زیستن"

مرزا نے اگر ایک طرف یہ کہا ہے کہ "

زاہد از ما خوشۂ تاکے بہ گستاخی مخواہ　　از جام نشاط دگر کس بجدہ صنم را

تو دوسری طرف یہ بھی کہا ہے :-

سخن کوتہ مرا ہم دل بتقوی مائل ست اما　　زنگ زاہد افتادم بکافر ماجرا سیاہ

دلم بسبحہ و سجادہ و ردا لرزد　　کہ دزم علہ بیدار و پارسا خفتست

اس تمام شاعرانہ طرز تکلم کے باوجود مرزا نے یہ ٹھوس حقیقت پیش کی ہے کہ بنی نوع انسان انسان کی برادری مذہب و ملت کی بنیاد پر تقسیم نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے کفر و دین کی تفریق غلط ہے۔ اس بارے میں انھوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں پوری طاقت کے ساتھ اپنے خیالات کی وضاحت کی ہے۔ بعض فارسی اشعار درج ذیل ہیں :-

کفر و دین چیست جز آلائش پندار وجود　　پاک شو پاک کہ ہم کفر تو دین تو شود

بہ صحن میکدہ سرمست می تواں گردید　　بہ کنج صومعہ وقف نماز باید ..... بود

جز سخن کفرے و ایمانے کجاست　　خود سخن در کفر و ایماں می رود

گر مسلمائیکے بیں ز ہمنشست آنکہ او　　اختلاف در میان ظلمت و نور افگند

مرزا دنیا اور دین دونوں کو "در دیک ساغر غفلت" قرار دے کر یہ تلقین کرتے ہیں کہ "دم ہم جلوۂ یکتائی معشوق نہیں"۔ اسلام کا طرۂ امتیاز بھی "یکے ہیں" قرار دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے" اور یہ ہو تو جائز ہے کہ " مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو" ان کا سارا زور وفاداری، خوش اعتقادی، صداقت اور نیکو کاری پر ہے اور انہیں خصائل کو وہ کردار

کی بلندی سمجھتے تھے افتراق واختلاف ختم کر کے خدمتِ خلق ان کا ایمان تھا۔

خدمتِ خلق کو وہ حقیقی طاعت سمجھتے تھے اور بے لاگ طاعت پر ان کا عقیدہ تھا۔ صواب وگناہ کا تخیل بھی انھیں عقائد کے تحت کارفرما تھا۔ ملاؤں اور زاہدوں کی طرح وہ جنت کے لالچ اور دوزخ کے خوف سے مغلوب نہیں تھے۔ جنت کے ذکر کو یہ کہہ کر ٹال دیتے تھے "کہ دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے"۔ "حیات بعدِ ممات کے بارے میں اتنا ہی کافی تھا کہ "خواب گرانے از پس بیدارئے"۔ داعظوں کی پاک زندگی کا اس طرح تجزیہ کیا تھا کہ "بر تنک مائیگم رحم کر یک عمر گناہ۔ ہم تبارلج سبکدستی بخشودن رفت" لیکن مقدس زندگی بسر کرنے کا معیار ان کی نظر میں یہ تھا۔

آنکہ خواہد در مقام دادن بقائے نام خویش خونِ دشمن بیج تر از خون فرزندش بود

بر دگوئے خرمی از ہر دو عالم ہر کہ یافت در بیاباں مردن و در قصر ایوان زیستن

راسخ العقیدگی میں وہ قول وفعل دونوں میں ہم رنگی اور مطابقت چاہتے تھے۔

با خرد گفتم نشان اہل معنی باز گوئے گفت گفتارے کہ باکر دار پیوندش بود

مرزا غالب کا مسلک تصوف تھا۔ ان کے تمام فرمودات وارشادات صوفیائے کرام کے عقائد کے مطابق تھے۔ ذات واجب الوجود کی وحدت کے قائل تھے، نور الٰہی کا پرتو ہر شے میں موجود ہونے پر اتفاق تھا ہی نوع انساں کی برادری نا قابلِ تقسیم سمجھتے تھے۔ خدمتِ خلق کا جذبہ ایمان تھا اور پھر رندِ مشرب بھی تھے۔ بادہ خواری شعار تھا۔ لیکن اس شغل میں بھی کردار بلند رہا۔ فرماتے ہیں۔

بادہ براں نہ حرام ست کہ غالب در بیخودی انداز ۂ گفتار ندانند

یہی وجہ تھی کہ ان کے سوانح حیات میں مے گساری کے سلسلہ میں کوئی مبتذل واقعہ نہیں ہے۔ انھوں نے بادہ وساغر میں بھی مشاہدۂ حق کی جستجو کی اور سرخوشی میں حقیقتوں سے قریب اور ریاکاری سے دور ہوتے چلے گئے۔ ان کے سارے کلام کا مطالعہ خواہ اردو ہو یا فارسی ظاہر کرتا ہے کہ انھوں نے جس جس معاملے، موضوع، واقعے یا حادثے کے بارے میں جو کچھ محسوس کیا اس کی ترجمانی صحیح جذبات و احساسات کے تحت کی ہے لیکن یہ بھی محسوس کرتے رہے کہ حقائق و معارف کے بارے میں ان کے دل

میں جو کچھ ہے وہ نہ کہا گیا ہے۔ اور نہ کہا جا سکتا ہے۔

آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است
بردار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت

مرزا کی نظر میں بیکار ہونے کے باوجود انسان عظمتوں کا حامل اور احترام کا مستحق ہے حقیقت امر یہ ہے کہ انسان ہی خدا کی بہترین تخلیق ہے ہر شاعر نے بزرگ و برگزیدہ انسان کی تعریف میں گیت گائے ہیں میر تقی میر فرماتے ہیں۔

"مت سہل ہمیں سمجھو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں"

انھوں نے انسان کا رول کو دیکھا اور اس کی قدر و منزلت میں یہ فرمایا کہ جب آسمان برسوں چکر لگا لیتا ہے تب پردۂ خاک سے انسان نکلتے ہیں۔ مرزا غالب نے فعّال انسان کی قدردانی کی جو دنیا میں آکر کام کرتا ہے۔ دھومیں مچاتا اور ہنگامے برپا کرتا ہے۔ انھوں نے دنیا کو میدان عمل قرار دیا جہاں سب انسان اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں جن میں اچھے بھی ہیں اور برے بھی۔ نیک بھی ہیں اور بد بھی۔ ہر ایک اپنے اپنے طرز پر کچھ نہ کچھ کام کر رہا ہے۔ اس طرح مرزا کے دامن خیال میں ساری دنیا کی وسعت سمٹ کر آجاتی ہے اور وہ پکار اٹھتے ہیں۔

زما گرم است ایں ہنگامہ بنگر شور ہستی را
قیامت می دمد از پردۂ خاکے کہ انساں شد

اس تجزیہ سے صرف یہ ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ مرزا ایک بلند کردار انسان تھے اور ان کی قدر شناسی انسانی فریضہ ہے۔

خواجہ خضر اور مرزا غالب

خواجہ خضر کی شخصیت حقیقی ہے یا تمثیلی ؛ اس سوال کو زیر نظر موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ یہ مان لینا پڑتا ہے کہ شعر و ادب میں اُن کو ایک رہبر کامل کی منزلت حاصل ہے، اور یہ عقیدہ راسخ ہے کہ وہ زندۂ جاوید ہیں اور دنیا کی نظروں سے روپوش رہ کر بیابانوں اور صحراؤں میں گم کردہ راہ مسافروں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ عمر جاودانی کی فضیلت دو اور بزرگوں یعنی ادریس اور عیسیٰ کے بارے میں بھی تسلیم کی گئی ہے لیکن رہبری کا شرف صرف جناب خضر سے مخصوص ہے جس کے سبب سے ان کی ذات میں جاذبیت اور ایک ایسی رومانیت پیدا ہوگئی ہے کہ وہ ہماری شاعری میں ایک گراں قدر موضوعِ سخن بن گئے ہیں فارسی اساتذہ نے بہت زیادہ اور اردو شعراء نے بھی ان کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے۔ انھیں اساتذہ میں مرزا غالب بھی شامل ہیں لیکن "کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور"

مرزا غالب اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ ان کو اپنے مختصر اردو دیوان کی بدولت معراج شہرت حاصل ہوئی اور اب تک اُن کا یہی چھوٹا سا مجموعہ ہمارے مذاق سخن کو آسودگی فراہم کرتا ہے لیکن ان کو خود اپنے فارسی کلام پر اتنا ناز تھا کہ کہہ گئے ہیں :-

"فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من ست"

اس لئے انصاف کا تقاضا ہے کہ جب ہم کسی مخصوص موضوع سے متعلق غالب کے فکر و فن کا مطالعہ

کریں تو ان کے فارسی اشعار کو بھی پیش نظر رکھیں۔ خواجہ خضر کا ذکر اردو سے زیادہ ان کے فارسی اشعار میں ملتا ہے جن میں مرزا کا کردار بھی درخشندہ ہے جیسا کہ سطور ذیل سے واضح ہو جائے گا۔

خضر کی سب سے بڑی اور اہم فضیلت یہ ہے کہ وہ صحراؤں اور بیابانوں میں بھٹکے ہوئے مسافروں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اور ایک بے پناہ شعور اور لامتناہی تجربات کے مالک ہیں لہٰذا فطری طور پر راہ کے ہر متلاشی کو ان سے ہدایت حاصل کرنا چاہیئے۔ مرزا بھی ان کو بزرگ مانتے اور ان کی جلالتِ قدر کا احترام کرتے ہیں لیکن جب سفر میں خضر سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ بے نیازانہ انداز میں ان کی پیروی کرنا ضروری نہیں سمجھتے اور اپنی راہ خود ہی تلاش کر لینا ان کو مناسب معلوم ہوتا ہے اس طرزِ عمل میں کسی راہبر یا ہم سفر کی منقصت مقصود نہیں ہے بلکہ خود اعتمادی کا وہ جوہرِ رخشندہ ہے جو مرزا کا طرۂ امتیاز تھا، ملاحظہ ہو۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

"ہم" کی انفرادیت اپنی آپ مثال ہے۔

"ہم سفر ملے" اور "پیروی کریں" یہ دونوں فقرے ظاہر کرتے ہیں کہ انسان کی عام شاہراہ زندگی پیشِ نظر ہے۔ راہ محبت میں مرزا کا طرزِ عمل اور ہو جاتا ہے اس منزل میں ان پر ہمیشہ جذبۂ رشک شدت کے ساتھ طاری ہوتا ہے ان کو معشوق سے متعلق ہر چیز اور ہر ذات پر رشک آتا ہے اس کو دیکھنا چاہتے ہیں تو خود اپنے اوپر رشک آ جاتا ہے زنار کو کمر پر بندھے اور موتیوں کو کانوں میں لٹکتے دیکھنا برداشت نہیں کر سکتے۔ یار تیغ بکف غیر کی طرف جاتا ہے تو وہ خود کٹ مرتے ہیں انتہا یہ کہ معشوق کو خدا کے سپرد کرنا بھی گوارا نہیں ہوتا۔ رشک سے اتنے زیادہ مغلوب عاشق کے لئے راہ محبت میں خضر کی رہبری تو درکنار ان کا ہمسفر ہونا بھی تکلیف دہ ہوتا ہے اگر وہ اتفاقاً مل جائیں تو یہی کہہ کر ٹال دینے کو جی چاہتا ہے کہ جناب معاف فرمائیں "آپ کے ایسے کو راہ محبت میں کوئی کیا کرے" اسی صورت حال کو مرزا پیش کرتے ہیں۔

باخویشتن از رشک مدارا نتواں کرد در راہِ محبت خضر ہمسفرے را چہ کند کس

"چہ کند کس" کا فقرہ واضح کرتا ہے کہ خضر کی ہم رہی قبولِ خاطر نہیں ہے اور "سخنے" کہہ کر خضر کی برتری کو بھی پست کر دیا تاکہ اپنی انفرادیت نمایاں ہو جائے۔

مرزا غالب کسی دوسرے کی خواہ خواجہ خضر ہی کیوں نہ ہوں رہبری گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی راہ خود نکالنے کے قائل تھے۔ ان کو اپنی عظمت کا احساس تھا اور اس احساس کو بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کے ساتھ بڑے سلیقہ سے نباہ لے گئے اُن کے تیور یہ تھے کہ برق تجلی کو طور کے بجائے خود انہیں پر گرنا چاہئے تھا۔ راہ اپنی ہو تو وہ کعبہ کی زیارت بھی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ معشوق سے اس کی نگاہ خشمگیں کے طالب تھے۔ تاکہ ان کو منفرد امتیاز حاصل ہو تلاش طلب ان کے نزدیک سبکسری تھی اور ہجوم انبوہ میں اپنے کو "محتشم" "سمجھتے تھے" جراحت پیکاں" سے تشفی نہیں ہوتی تھی۔ لہذا فراخئ دل کیلئے زخم تیغ کے خواہش مند ہوتے تھے امتحان گاہ محبت میں موت سے کچھ آگے کی منزل ان کا مطمح نظر تھی۔ وادئ خیال کو مستانہ طے کرتے تھے، تاکہ بازگشت کا مدعا باقی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا حوصلہ مند اور جوان ہمت کسی منزل اور کسی میدان عمل میں پیچھے رہ جانے کا خیال تک دل میں نہیں لا سکتا بلکہ وہ صرف یہی تہیہ کر کے قدم آگے بڑھائے گا کہ اگر کسی سنگلاخ وادی میں اُس کا میر کارواں بے بس ہو جائے اور خود اس کے پاؤں بھی شل ہو جائیں تب بھی وہ سینہ کے بل آگے بڑھتا ہی رہے گا۔ اسی حوصلہ مندی میں مرزا پکار اٹھتے ہیں

بوادئ کہ دراں خضر را عصا خفت است — بسینہ می سپرم رہ اگرچہ پا خفت است

خضر کے ایسے معمر کا عصا بیکار ہو گیا۔ لہذا وہ رہبری سے مجبور ہیں غالب پاؤں شل ہو جانے کے باوجود سینہ کے بل راستہ طے کر رہے ہیں۔ یہی وہ وادئ عشق ہے جہاں فرشتوں کے پر جل جاتے ہیں۔

خضر کی دوسری فضیلت ان کی عمر جاوداں ہے۔ مرزا کی بصیرت اس خصوصیت کا بھی جائزہ لیتی ہے۔ انھوں نے کارگاہ تخلیق میں ہر پیکر تصویر کو کاغذی پیرہن میں آمادہ بہ فنا دیکھا۔ بنی نوع انسان کو یہ کہتے سنا کہ "جیتے ہیں امید پہ لوگ" پھر اپنے حال پر غور کیا اور یہ محسوس ہوا کہ "ہم کو جینے کی بھی امید نہیں" مایوسیوں کی اس طغیانی میں موت اور صرف موت کا ساحل نظر آیا اور فلسفۂ حیات یہ سمجھ میں آیا

کہ کشمکش زندگی حقیقتاً بے حلاوت ہے جس کو مرنے ہی میں ابدی سکون ملتا ہے اب ان کا ذہن دفعتاً ان ہستیوں کی طرف منتقل ہوتا ہے جو حیاتِ جاوداں کی مالک ہیں خضر و ادریس و مسیحا کا خیال آتا ہے اور وہ یہ سوچتے ہیں کہ زندگی جب خود ایک ناخوشگوار فریضہ ہے تو یہ لوگ آخر کس امید پر جی رہے ہیں یہ عقیدہ کسی طرح حل نہیں ہوتا تو بے تابانہ فریاد کرتے ہیں کہ پالنے والے تو ہی بتا کہ خضر و ادریس و مسیحا کس امید پر جی رہے ہیں جب کہ ہمارے دل مایوس کے واسطے مر جانے کے علاوہ اور کوئی تسکین کی صورت نہیں ہے۔ آخر حیاتِ جاودانی میں کیا لذت ہے؟ یقیناً کوئی نہیں! فرماتے ہیں۔

دلِ مایوس را تسکیں بمردن میتوان دادن ؎ چہ امید ست آخر خضر و ادریس و مسیحا را

پھر بھی مرزا فطرتاً قنوطیت اور فرار کے قائل نہیں ہیں۔ زندگی کتنی ہی بے حلاوت کیوں نہ ہو، نشاط و طرب سے کتنے ہی محروم کیوں نہ ہوں مگر ایک گونہ بےخودی طاری رکھنا ضروری ہے تا کہ غم روزگار اگر غلط نہ ہو سکے تو کم ضرور ہو جائے۔ اس کے علاوہ بے عملی سے بھی اُن کے مزاج کو مناسبت ہے ان کے نزدیک زندگی کا دوسرا نام حرکت ہے یعنی یہ کہ انسان کو بیکار نہ رہنا چاہیے۔ ہنگامۂ ہستی میں خواہ کتنا ہی خلفشار ہو، ماحول چاہے کتنا ہی ناسازگار ہو، مرد کو ہر حال میں اپنی حیاتِ مستعار کے چار دن بیکاری میں ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ اس اصول کے تحت جب وہ خضر کی عمر جاوداں کو پرکھتے ہیں تو اس عمرِ دراز کا رشتہ اُن کی نظر میں اس چھوٹی سی لکیر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا جو اندراج حسابات میں تفریق پیدا کرنے کے لئے شامل کر دی جاتی ہے یعنی یہ کہ خضر کی زندگی جو ہنگامۂ دنیا سے خارج رہ کر بیکاری میں بسر ہو رہی ہے ایک علیحدگی کے علاوہ اور کسی مصرف کی نہیں ہے کہتے ہیں۔

خارج از ہنگامہ ہستم تا عمر بہ بیکاری گذشت ؎ رشتۂ عمر خضر مدِ حساب بیش نیست

مرزا کی شاعری میں ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے کلام میں جہاں رجائیت اور باعمل زندگی کی تلقین کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی ہے وہاں روزگار کی تلخیوں کے حقائق کی بھی بھرپور ترجمانی ہے ان کے سوانح حیات کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ انہوں نے اپنے بعض دوستوں اور ہم عصروں کے ہاتھوں شدید دکھ جھیلے تھے۔ ان مصائب سے متاثر ہو کر وہ یہاں تک محسوس کرنے لگے تھے کہ:۔

"پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ — ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں"

آئینہ میں اپنی ہی صورت سہی مگر وہ بھی آدمی ہی کی شکل و شباہت تھی یہی وہ منزل تھی جب انھوں نے مردم گزیدہ ہو کر خضر کی پنہاں زندگی کو .... راحت جاوید سے تعبیر کیا کیوں کہ ایسی علیحدگی میں آدمیوں سے اختلاط کی کوئی صورت ہی پیدا نہیں ہوتی غالباً یہ وہ داخلی احساس ہے جب ان میں شکستگی کا جذبہ ابھرا تھا اور انہوں نے خضر کی تاسی کرنا چاہی تھی۔ فرماتے ہیں۔

راحت جاوید ترک اختلاط مردم ست — چوں خضر باید ز چشم خلق پنہاں زیستن

انسان کی زندگی کا دھارا ہمیشہ یکساں نہیں بہتا۔ کبھی غم و آلام کا جزر و مد سامنے آتا ہے کبھی فارغ البالی و خوشحالی کا طوفان موجیں مارتا ہے بلند پایہ شاعر کا یہی کمال ہے کہ وہ متضاد حالات کے تحت انسان کے تغیر پذیر جذبات کی مناسب موزوں الفاظ میں صحیح طور پر عکاسی کرے مرزا کو اس فن میں زبردست دستگاہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا جواب اب تک پیدا نہیں ہوا تخیل کی بلندی اور جذبات کی ترجمانی کے ساتھ سادہ استعمال الفاظ اور بندش الفاظ میں بھی ان کی استادانہ ہنرمندی عدیم المثال تھی متذکرہ بالا شعر میں جب وہ اپنے وقتی تاثرات کے تحت خضر کے "پنہاں زیستن" کو "راحت جاوید" قرار دیتے ہیں تو اس کی وجہ "ترک اختلاط مردم" ہے اس مقام پر "مردم" سے یقیناً بعض مخصوص آدمی مراد ہیں جنھوں نے ان کو ایذا پہنچائی تھی۔ ساری خلقت پر اس فقرہ کا اطلاق نہیں ہوتا اور نہ ہونا چاہئے کیوں کہ مرزا مردم بیزار کبھی نہیں ہوئے بلکہ اس کے برعکس وہ تمام تکالیف جھیلنے کے بعد بھی "روشناس خلق" ہونے پر فخر کرتے ہیں اور اپنے اس کردار کو خضر کے "پنہاں زیستن" پر ترجیح دیتے ہیں اس کے علاوہ یہ تذکرہ اس انداز سے فرماتے ہیں کہ روپوش رہ کر زندگی گزارنے والے کو لفظ "چور" سے متصف کرتے ہیں اور اس بے تکلفی سے "چور بنے" کہتے ہیں۔ کہ لطف خصوصی ہوتا ہے اور سننے والے کو لطف آجاتا ہے حسب ذیل شعر ان کے طرز ادا میں شوخی و بیباکی نیز سماجی زندگی کے سلسلہ میں ان کے ذاتی رجحان کی وضاحت کرتا ہے شعر پڑھئے اور مزہ لیتے رہئے۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر — نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

اب تک جتنے اشعار پیش کئے گئے ہیں اُن میں خضر کی دونوں خصوصیات کو طرح طرح سے نظم کیا گیا ہے۔ اور ان سب میں رفعت خیال، طرز بیان، بندش الفاظ جیسی دمقانی کے فنی کمالات موجود ہیں لیکن اب ندرت خیال کا ایک ایسا عدیم المثال نمونہ سامنے آتا ہے جس کو ہم شعر کا معجزہ کہنے پر مجبور ہیں۔ خضر نے ہزاروں کوششیں کر کے عمر دراز حاصل کی ہے۔ مرزا پوچھتے ہیں کہ خضر جنھوں نے ہزاروں کوششیں کر کے عمر دراز حاصل کی ہے آخر وہ خود کس پر نثار ہونے کے لئے زندہ ہیں؟ اسی سوالیہ طرز میں اپنا خصوصی رنگ یعنی جذبۂ رشک شامل کر کے وہ کہتے ہیں کہ میں اسی رشک میں مرا جاتا ہوں کہ عمر کس پر صدقے ہوں گے کہیں وہ میرا ہی معشوق ... نہ ہو۔ شعر ملاحظہ ہو

تا خود از بہر نثار کیست میرم ز رشک　　خضر دچندیں کوشش عمر دراز آوردش

حقیقت امر یہ ہے کہ رشک کے مضمون پر غالب سے بہتر بلکہ ان کے برابر بھی کسی شاعر نے طبع آزمائی نہیں کی اور خود انھیں کے کلام میں یہ شعر ان کے کمالات میں داخل ہے، اپنا جواب نہیں رکھتا۔

آخر میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ اشعار کی مندرجہ بالا ترتیب اس امر کی ضمانت نہیں ہے کہ غالب نے بھی ان اشعار کو اسی سلسلہ میں نظم کیا تھا اور نہ ہمارے پاس ایسی تاریخ موجود ہے۔ جو ان کی تخلیقات کا تعینِ وقت کرنے میں کوئی معتبر مواد فراہم کر سکے لہٰذا ایک عام اصول مدِ نظر رکھنا مناسب معلوم ہوا ہوتا یہ ہے کہ ہر عظیم شاعر اپنی آسودگی خاطر کیلئے ایک ہی موضوع سخن پر مختلف اوقات میں اور طرح طرح سے طبع آزمائی کرتا ہے ان تخلیقات کو اس کے وقتی رجحان میں شدت، زاویۂ فکر میں ندرت اور طرز ادا میں محاسن کی بدولت درجۂ تفوق حاصل ہوتا ہے اس لئے شاعر کے فکر و فن میں ترقی منازل کی ترتیب مجموعہ کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی قائم کرنا چاہئے ایسی صورت میں ایک مبصر حق بجانب ہوگا اگر وہ کسی بلند پایہ شاعر کے کلام میں منازل ترقی کی بنیاد پر تقدیم و تاخیر میں اپنی خود ترتیب قائم کرے

امیر خسرو

ایک سرسری مطالعہ

امیر خسرو موضع پٹیالی ضلع ایٹہ میں ۶۵۳ھ مطابق ۱۲۵۵ء پیدا ہوئے تھے آپ کے والد امیر سیف الدین محمود اسی علاقے کے جاگیردار تھے، سپہ سالاری پیشہ تھا اور بہ لحاظ نسب ترک لاچین تھے۔ انھوں نے اپنے اس ہونہار اور خداداد صلاحیتوں کے مالک فرزند کا نام ابوالحسن یمین الدین خسرو رکھا تھا۔ ابھی صرف چار سال کا سن تھا کہ ان کے والد ان کو اپنے ہمراہ دلی لے گئے اور غالباً نو برس کی عمر تھی جب باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ کی والدہ ہندی نژاد تھیں، عماد الملک کی صاحبزادی تھیں عماد الملک صاحب کمال خوش حال بزرگ تھے۔ اور ان کا شمار اولیاء اللہ میں ہوتا تھا۔ انھیں کی آغوش تربیت اور ماں کے سایۂ عاطفت میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ذہانت و ذکاوت کے بل بوتے پر بہت جلد مدارج علمیہ طے کر لئے۔ پندرہ بیس برس کی عمر ہی میں درسی علوم سے فارغ ہو چکے تھے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ مبداء فیاض کے مرحمت کردہ غیر معمولی کشف و کرامات لے کر دنیا میں آئے تھے جس کے مظاہرے ابتداء سن ہی سے ہونے لگے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ابھی ان کی عمر سات برس ہی کی تھی کہ ان کی طبیعت صوفیہ کی طرف متوجہ ہو گئی چنانچہ ان کے والد مرحوم ہی نے ان کو حضرت سلطان جیؒ کے آستانے تک پہنچا دیا تھا۔ اسی مقدس بارگاہ کی قربت کا اثر تھا کہ باوجود دنیا کی دولت و ثروت اور عزت و وقار حاصل ہونے کے امیر خسرو فقیرانہ زندگی بسر کرتے رہے اور صوفیائے کرام کی صف میں ان کا افضل مقام ہے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے وہ مخصوص ترین مریدوں میں تھے اور اپنے

پیر سے ان کو اتنی والہانہ عقیدت تھی کہ حضرت نظام الدین اولیاء کے وصال کے بعد امیر خسرو بھی اس دار فانی سے وفات کر گئے۔

امیر خسرو کی وفات کا واقعہ بھی اتنا ہی محیر العقول ہے جتنا کہ ان کے سوانح حیات ہم کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں شہزادے قدسی نظامی اپنے تذکرہ "حضرت امیر خسرو" میں رقم طراز ہیں کہ "حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی ۱۸ ربیع الثانی ۷۲۵ھ میں وفات ہوئی تو امیر خسرو شاہی کام کے سلسلے میں بنگال گئے ہوئے تھے چھ ماہ کے بعد ۱۸ شوال ۷۲۵ھ کو دہلی میں واپس آ کر یہ غمناک خبر سنی تو بیتاب ہو کر پہلے حضرت کے مزار کی زیارت کے لئے حاضر ہوئے ٹھہر گئے دور سے مزار کو دیکھا اور دونوں ہاتھ دل پر رکھ کر ہندی زبان کا یہ دوہا پڑھا جو غالباً اسی وقت موزوں کیا تھا۔

گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس　　چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چہوں دیس

یعنی میرا محبوب پھولوں کی سیج پر پڑا سوتا ہے اور اپنے چہرے پر اپنے بال ڈال رکھے ہیں لہٰذا اے خسرو تو بھی اپنے گھر کو چل کہ اب چاروں دیس یعنی ساری دنیا میں شام ہو گئی۔ یہ دوہا پڑھ کر مزار مبارک کو دوبارہ دیکھا اور مکرر مذکورہ دوہا پڑھا۔ اس کے بعد تیسری بار دوہا پڑھا اور گر پڑے لوگوں نے پاس جا کر دیکھا تو روح پرواز کر چکی تھی"۔ جس جگہ وفات ہوئی تھی لوگوں نے اسی جگہ قبر تیار کر کے حضرت امیر خسرو کو دفن کر دیا۔ بابر کے وقت میں اس مزار پر سنگ مرمر کا گنبد بنایا گیا روضے کے باہر سنگ سرخ کی جالیاں ہیں اور یہ مرید اپنے پیر کی بارگاہ میں اب تک محو خواب ہے امیر خسرو کے سوانح نگاروں نے ان کے اعلا ترین مدارج تصوف پر فائز ہونے کے سلسلہ میں ان کے کشف و کرامات کے بے شمار واقعات و حالات لکھے ہیں لیکن اس موقع پر ان کا تذکرہ اس لئے غیر متعلق ہے کیونکہ راقم ---- اپنے بیان کو ان کے علمی اور ذہنی ارتقا کے بارے میں محدود رکھنا چاہتا ہے۔ امیر خسرو کا یہی ایک کارنامہ کچھ کم معجزہ نہیں تھا کہ انھوں نے کھڑی بولی کو جنم دے کر اردو زبان کی داغ بیل ڈالی ہندی زبان کو اپنا کر اتنا سہل بنایا کہ وہ عوام کی زبان بن گئی اور شعر و سخن میں خواہ وہ ہندی ہو یا فارسی اتنا بڑا ذخیرہ چھوڑا جو ایک انسان کے بس کی بات نہ تھی اور اس کے ساتھ ساتھ صاحب شمشیر و قلم ہوتے

ہوئے موسیقی کے ماہر اور اس فن میں بھی موجد تھے۔ سپہ گری آبائی پیشہ تھا لیکن شاعری اور موسیقی میں وہ کمال حاصل کیا جس کی مثال کسی اور شاعر اور فن کار کے یہاں نہیں ملتی۔

امیر خسرو نے اپنے علمی کمالات کا مظاہرہ اپنے لاتعداد تخلیقات میں پیش کیا تھا۔ یہ بتانا دشوار ہے کہ ان کے ایسے تصنیفات کی تعداد کیا تھی بعض لوگوں نے خالق باری کو بھی انھیں کی تصنیف قرار دیا ہے ایسے محقق ان کے تصنیفات کی تعداد چھیالیس سے لے کر ۹۹ تک قرار دیتے ہیں لیکن شدید سے شدید قطع و برید کے بعد بھی ان کے کارنامے اکیس جلد دن تک ضرور پہنچ جاتے ہیں جو نثر اور نظم دونوں پر مشتمل ہیں اور جن میں ہر تخلیق ایک زبردست ادبی شاہکار ہے۔ تاریخ و سیر بھی ہیں لطائف و ظرائف بھی، قصص و حکم بھی صنائع و بدائع کی توانائی بھی تاہے جس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی امیر خسرو کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے ادب میں تفنن و تفریح طبع کا بھی سامان فراہم کر دیا ہے۔ ان کی پہیلیاں اور مکرنیاں اس قبیل کے ادب میں جواہر پارے ہیں جن میں وہ زبان استعمال کی ہے جو فارسی کھڑی بولی ہندی اور اردو سب ہی کچھ ہے۔ موسیقی میں "ستار" انھیں کا ایجاد ہے اور بعض راگ راگنیاں بھی انھیں سے منسوب ہیں قوالی کا بھی انھیں کو موجد کہا جاتا ہے۔ وہ ادب جسکو آج ہم معمولی اور سستا ادب کہتے ہیں اور جس کا مصرف محض دلچسپی اور تفریح کے علاوہ کچھ نہیں اپنی تخلیق کے لئے انھیں کا مرہون منت ہے جو ان کے "دو سخنوں" اور "ڈھکوسلوں" والے چٹکلوں میں ملتا ہے۔ لیکن امیر خسرو کے ذہنی ارتقاء اور قدرت بیان کا جائزہ لینے کے لئے ہم کو ان کے فارسی کلام کا مطالعہ کرنا ہی ضروری ہے۔ انھوں نے اپنی فارسی دانی اور اپنی فارسی شاعری کے لئے ایران والوں سے بھی خراج تحسین حاصل کر لیا تھا۔ مولوی عبدالحق صاحب نے امیر خسرو کی شاعری اور ایران والوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "یوں تو سب اہل زبان کو اپنی ہی زبان کا غرہ ہوتا ہے۔ لیکن اہل ایران اس معاملہ میں خاص طور پر ممتاز ہیں۔ وہ کسی غیر ایرانی کے کلام کو لحاظ میں نہیں لاتے لیکن حضرت امیر خسرو کے سامنے انھیں بھی جھکنا پڑا۔"

حضرت امیر خسرو نے مشق سخن کب شروع کی اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ انھوں نے خود یہ فرمایا

تھا کہ میں نے اس وقت سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا جب کہ میرے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے تھے اس بیان کے بعد ان کی زندگی میں کہے گئے تمام اشعار کی تعداد بتانا محال ہے کہا جاتا ہے کہ انھوں نے چار پانچ لاکھ اشعار کہے تھے یہ بیان مبالغہ ہو تب بھی ان کی تصنیف میں مثنویوں کے علاوہ ان کے پانچ دیوان منظر شہود میں آئے تھے جو غالباً انھیں کے مرتب کردہ بھی تھے۔ ان دیوانوں کے نام تحفۃ الصغر، غرۃ الکمال، وسط الحیات، بقیہ نقیہ اور نہایۃ الکمال تھے پہلا دیوان انیس برس کی عمر تک، دوسرا تیس برس کی عمر تک، تیسرا بیالیس برس کی عمر تک، چوتھا چونسٹھ برس کی عمر تک اور پانچواں آخری عمر کی تصانیف پر مشتمل تھا۔ ان دیوانوں میں قصائد اور مثنویاں بھی شامل تھیں۔ امیر خسرو نے گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا تھا جن میں سے سات بادشاہو کی ملازمت بھی کی تھی ان پانچوں دیوانوں کا مطالعہ اس زمانے کے حالات پر خاطر خواہ روشنی فراہم کرتا تھا لیکن افسوس ہے کہ یہ دیوان اپنی اصلی حالت پر ناپید ہیں۔ راقم ..... نے تخمیناً چالیس برس قبل پہلے چاروں دیوانوں کا ایک انتخاب دیکھا اور شروع سے آخر تک پڑھا بھی تھا اس انتخاب ہی میں ۹۴۲ غزلیں موجود ہیں جن میں اوسطاً ہر غزل دس اشعار کی ہے بعض غزلیں طرح طرح کی صنعتوں پر مشتمل ہیں مثلاً ایک غزل کے صرف چار اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

ساقی بیا کہ موسم عیش ست و بیم دے — مے خور کہ لالہ گوں شود از بادہ ہر رخے

رخ بہ قمر و زد زلف بسنبل مزن گرہ — تا بشکند جمال تو بازار سیم و مے

سر از روے خوب تو نسبت کجا کنم — اے روے آفتاب و بیت شیں کلف ہیے

شکر شد از نجات لعل تو آب دار — ہر گرد میم و ہے جو کشیدے توخ و بطے

پہلا شعر مطلع ہے اس کے آخر میں جو دو حرف قافیہ اور ردیف میں استعمال ہوئے ہیں وہی دوسرے مصرع کا پہلا لفظ ہیں اسی طرح ہر دوسرے مصرع کے آخری دو حرف آنے والے شعر کا پہلا لفظ بنتے ہیں یہ غزل بھی اسی انتخاب میں دس اشعار پر مشتمل ہے ایسی صنعتوں کے ساتھ خیال میں نزاکت اور بیان میں لطافت برقرار رکھنا بہت مشکل کام تھا لیکن امیر خسرو نے اس مشکل کو آسان تر بنا کر پیش کر دیا ہے۔ یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی

ہے کہ یہ غزل غرۃ الکمال سے ماخوذ ہے جس کو پھر بھی ہم ابتدائی کلام کہنے پر مجبور ہیں حیرت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم ان کے بالکل ابتدائی کلام میں شاعری کے بہترین نمونے پاتے ہیں۔ ایسے نمونے جن کو ہم ایران کے اساتذہ کے کلام کے مقابلہ میں پیش کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اور دوسرے دیوانوں کو نظر انداز کر کے اس مقام پر تحفۃ الصغر سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں ملاحظہ ہو ۔

ابر باران و من و یار ستادہ بوداع　　من جدا گریہ کناں ابر جدا یار جدا

جان من از آرام رفت آرام جان من کجا　　ہجرم نشان فتنہ شد فتنہ نشان من کجا

گر اے زاہد دعائے خیر میخواہی مرا ایں گو　　کہ آں آوارہ کوئے بتاں آوارہ تر بادا

بہر پرسش آمدی و زدیدنت جان می رود　　کشتنی ست این جان من پرسید رنجور نیست

ما جان فدائے خنجر تسلیم کردہ ایم　　خواہی بخشش و خواہ بکش رائے رائے تست

ہر کس آنجا کہ مے و شاہد و گلشن آنجاست　　من ہم آنجا کہ دل سوختہ من آنجاست

ہر بوئے خوش کہ باد ز زلف بر دبباغ　　اندر قبائے غنچہ تنگ آستیں نہند

بادہ کش دوز خیان بہتر ازیں مدعیاں　　کز پئے خلد بریں طاعت معبود کنند

مغان گرچہ براند گدا را از در ...　　گہے گہے حاجت درویش روا نیز کنند

ہر منم و اشکے و ز خون ہمہ بالین تر　　عشق ایں منم و فرمود ز عیب نہ فرمائے

ہر کشاد دعائے بکشا از زلف خود خمے　　در پیچ پیچ زلف تو پیچیدہ شد چوں عالمے

یہ چند اشعار مشتے نمونہ از خروارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر بھی ان کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ امیر خسرو کی صغر سنی والے ابتدائی کلام میں بھی سعدی کی چاشنی اور حافظ کی حلاوت موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ مشق سخن کے بعد جب کلام میں زور آ گیا تھا تو کیا کچھ نہ کہا ہو گا۔ اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے بقیہ تین دیوانوں میں سے ایک شعر بھی مثالاً پیش نہیں کیا جا رہا ہے۔ لیکن توقع یہ ہے کہ قاریان کرام کے پیش نظر امیر کے وہ اشعار ضرور ہوں گے جو ضرب المثل ہو گئے ہیں اسی طرح ان اشعار کو بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے جو خالص تصوف کے رنگ میں ہیں اور جن کی امیر خسرو کے کلام میں اس لئے بہتات ہے کہ وہ ایک بہت بڑے صوفی تھے

اور حضرت نظام الدین اولیا کی ایسی برگزیدہ ہستی کے صحیح معنوں میں مرید تھے۔

امیر خسرو کی لامحدود صلاحیتوں کا راز ان کی فطری ذہانت و ذکاوت اور ان کے خداداد عظیم المرتبت کردار میں مضمر تھا۔ وہ بادشاہوں امیروں اور غریبوں سب ہی کے ساتھ یکساں طور پر بے تکلفی اور اخلاق سے پیش آتے تھے۔ فارسی کے علاوہ سنسکرت اور عربی زبان پر بھی قدرت تھی نغمۂ توحید اسلام میں ڈوبے ہوئے تھے۔ لیکن ہندو گرہستوں کے بھی رسیا تھے۔ ان کو ہندو دیومالاؤں کے بارے میں اسی قدر معلومات حاصل تھیں جتنی کہ ایمانی تعلیم اسلام پر رسائی تھی۔ ان کا یہ ذہنی رجحان غالباً اس عقیدے و ارادت کا فیض تھا جو ان کو حضرت خواجہ نظام الدین اولیا سے حاصل تھی خواجہ صاحب قدس سرہ کا بھی یہی مسلک تھا۔ چنانچہ ان کے تذکرہ میں یہ واقعہ درج ہے کہ ایک مرتبہ خواجہ نظام الدین اولیا اپنے کوٹھے پر بیٹھے ہوئے ہندوؤں کے اشنان اور عبادت کے طریقہ کو دیکھ رہے تھے۔ امیر خسرو وہاں موجود تھے، ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا "ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے" یعنی ہر قوم سیدھے راستہ پر ہے جو اپنا دین اور قبلہ بھی رکھتی ہے۔ اسی ایک جملہ سے حضرت خواجہ کی وسعتِ نظر اور بلندی فکر کا پتہ چلتا ہے اور اسی ایک واقعہ میں امیر خسرو کی ارادت و عقیدت کا مظاہرہ بھی موجود ہے۔ اس وقت نظام الدین رض کی ٹوپی ذرا ٹیڑھی تھی امیر خسرو نے اس کی طرف اشارہ کر کے برجستہ کہا کہ "من قبلہ راست کردم برطرف کج کلاہے" یعنی میں نے ٹیڑھی ٹوپی پہننے والے کی طرف قبلہ سیدھا کر لیا ہے۔ اس لطیفہ کو جانے دیجئے ... یہ مطلب بہرحال نکلتا ہے کہ پیر اور مرید دونوں مذہب گزیدگی عصبیت اور تنگ نظری سے بالاتر تھے۔

فارسی شعرا تو درکنار اردو شعرا پر بھی بعض حلقوں سے یہ اعتراض وارد کیا جاتا ہے کہ انھوں نے عرب اور ایران کے واقعات و حالات کا اثر قبول کیا ہے اور ان کے تصور و تخیل پر ہندوستانی واردات قلبیہ کی چھاپ بہت کم ہے۔ یہ اعتراض کس حد تک صحیح ہے اور اس کے جواب میں کیا کچھ کہا جا سکتا ہے ان تمام عقلی و نقلی دلائل کو نظر انداز کر کے ہم صرف امیر خسرو کے کلام کو پیش کر کے یہ بات ثابت کر سکتے ہیں کہ ہمارا تیرہویں صدی کا یہ شاعر کتنا پکا ہندوستانی تھا اور اس کو ہندوستان

کے پتّے پتّے، یہاں کے ذرّہ ذرّہ اور اس ملک کے چرند و پرند تک سے کتنی محبت تھی وہ دور سیاسیات کا زمانہ نہیں تھا۔ عام طور سے لوگ مذہبی تھے۔ لیکن تقدس مذہب کے قائل تھے۔ کہ درت سے بیر تھا وطن پرستی اور قومیت کا کوئی تخیل اس وقت تک تعمیر نہیں ہوا تھا لیکن امیر خسرو نے آنے والی نسلوں کے لئے قومیت اور وطن پرستی کا وہ معیار پیش کیا تھا جو اس وقت تک اٹل ہے اور ان کا یہ کلام اس ملک میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ ڈاکٹر تارا چند نے "امیر خسرو اور ہندستان" کے عنوان کے تحت اس موضوع پر سیر حاصل اور بصیرت افروز مقالہ تحریر فرمایا تھا جس میں خسرو کی ایک مثنوی کے اقتباسات پیش کر کے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ان کو ہندستان سے کس درجہ محبت تھی۔ یہ مقالہ بار بار پڑھنے کی ضرورت ہے اس مقام پر چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

ہندوستان کے پھولوں کی تعریف میں کہتے ہیں کہ "ہندستان کی خوبی یہ ہے کہ اس کے اردگرد چاروں طرف سبزہ اور پھولوں کی فراوانی کی وجہ سے پورے سال بہار اور کھلے ہوئے پھولوں اور شباب کا منظر دکھائی دیتا ہے" اسی ضمن میں پھل یاد آجاتے ہیں "ان لوگوں پر جو انجیر کے سامنے آم کی کم قدر کرتے ہیں لاف زن ہیں" پھولوں پر اس قدر گرویدہ ہیں کہ ایک ایک کا نام لیکر تعریف کرتے ہیں۔ گل کوزہ، صد برگ، جوہی، کیوڑہ، چمپا، مولسری، سیوتی، سب کا بیان کرنے کے لئے خراسانی پھولوں سے برتری کا سبب بتاتے ہیں "اگر ارغوانی لالہ کو ہنستا ہوا دیکھے تو معلوم ہوگا کہ ان کے رنگ تو خوب ہیں لیکن خوشبو نام کو بھی نہیں" "ہمارے پھولوں کے نام ہندی ہونے کی وجہ سے خراب ہیں ورنہ حقیقت میں ہمارے باغ کا ہر پھول باغ جنت کی طرح ہے" "اگر یہ پھول روم اور شام میں اُگتا تو اس کو پارسی یا عربی نام ملتا" "اور جب اس سرزمین کے پرندوں کو معلوم ہوتا تو وہ رے اور روم کے شہروں میں اس طرح غلغلہ مچاتے کہ یہ پھول اس سال اس طرح کا ہوگیا ہے کہ درخت سے دور دور تک خوشبو پھیلاتا ہے"

یہاں کے کپڑوں کی تعریف میں فرماتے ہیں "پریوں جیسی خصلت رکھنے والے حسین اچھی طرح جانتے ہیں کہ دیوگیری کا کپڑا بڑا باریک ہوتا ہے" "لطافت بس جو کپڑا آفتاب کی طرح معلوم

ہوتا ہے" اور یہ کہئے کہ وہ خود ہی سایہ ہے یا چاند ہے" "ہندوستان کے ریشم کا بنا ہوا کپڑا اتنا... مہین اور باریک ہوتا ہے کہ ظاہر طور پر تو وہ ایک گز معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے دس خیمے ایستادہ کئے جا سکتے ہیں۔" "اس کا دس گز کپڑا آنکھوں میں سما سکتا ہے اور اس کے سما جانے سے آنکھوں کو ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی" "نہ اس میں پانی نکل سکتا ہے اور نہ کسی طرح کی چکنائی گزر سکتی ہے اور نہ جنگی تیر اس طرح پار ہو سکتا ہے جس طرح پانی کا قطرہ نہیں نکل سکتا۔" "ہندوستان کا ایک کپڑا ہے جس کا نام لوگ نہیں جانتے وہ اتنا باریک ہوتا ہے کہ اگر اسے کوئی پہنے تو سارا جسم نظر آتا ہے۔" "اگر اس کو ناخن میں بھی لپیٹ لیا جائے تو پوشیدہ ہی رہے حالانکہ اگر اس کو کھولیں تو ساری دنیا ڈھانپ لے۔"

"ہندوستان کے پرندوں کا بیان بھی سن لیجئے۔ طوطے کے بارے میں کہتے ہیں جانور نہیں آدمی ہے اس کی زبان پر سورہ فاتحہ اخلاص اور دعاؤں کا ورد رہتا ہے اور ہمارے تمہارے ساتھ تمہاری ہماری طرح باتیں کرتا ہے۔ پھر شارک کا ذکر کرتے ہیں کہ ویسا پرندہ نہ عجم میں ہے نہ عرب میں۔ کوّے کی کائیں میں بھی خاص اثر ہے اس کی بولیوں سے شگون لیتے ہیں اور چڑیا تو پنہاں راز کی خبر دیتی ہے لیکن مور کے لئے تعریفوں کے دریا بہا دیتے ہیں کہتے ہیں اگر ہندوستان بہشت نہیں ہے تو پھر مور کی وجہ سے میرے لئے جنت بن گیا ہے۔ کہیں اسے طائر فردوس کہا ہے کہیں بتایا ہے کہ ہُدہُد جو مرغ سلیمان ہے اس کا زریں تاج دیکھ کر انگلی کاٹتا ہے اور آخر میں فیصلہ دے دیا ہے کہ پوشیدہ اور ظاہر طور سے سب جانتے ہیں کہ اطراف عالم میں اس طرح کا پرندہ کوئی نہیں ہے۔"

ڈاکٹر تارا چند اس مثنوی سے مثالیں پیش کرنے میں اختصار ملحوظ رکھتے ہوئے رقم طراز ہیں "جانوروں میں ہرن کی چال، گیدڑ کے زیر و بم، گھوڑے کے ناچ، بندر کی عقل، بکرے کا لکڑی پر چاروں طرف سُم رکھ کر پھرنا اور ہاتھی کا آدمیوں کے سے کام کرنا بہت مزے لے کر کرتے ہیں۔ لیکن ہندی حسینوں کو تو دیکھ کر بے تاب ہو جاتے ہیں۔ سو ملک چین بھی ہندوستان کے

ایک بال کے برابر نہیں۔ یغما اور بلخ کے تو بردیوں کی آنکھیں ضرور چمکتی ہیں لیکن چہروں پر ترشی ہوتی ہے خراسانی سرخ و سفید ہیں لیکن خراسانی پھولوں کی طرح بے بو ہیں۔ روم اور روس کا حال مت پوچھئے۔ یہ برف کی سِل کی طرح سفید اور ٹھنڈے ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر دوزخی عورتوں کی سانس اکھڑ جائے۔" تاتاریوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور ختن والیوں میں ملاحت نہیں، سمرقندی اور قندھاریوں میں شیرینی کی کمی ہے تو مصریوں میں چپتی اور ریالا کی کمی۔ غرض کہیں بھی وہ خوبروئی اور دلربائی نہیں ہے جو ہند کی حسیناؤں میں ہیں۔"

ان تمام اقتباسات کے مطالعہ کے بعد کوئی بافہم اور ذی شعور انسان ڈاکٹر تارا چند کے اس خیال سے اختلاف نہیں کرسکتا کہ "چھ سو سال گزرنے پر بھی خسرو کا پیغام ہمارے لئے وہ مشعل ہدایت ہے جو منزل مقصود کی طرف ہماری راہبری کرسکتا ہے" اور یہ منزل مقصود ہے وطن پرستی، قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی۔

حضرت امیر خسرو کا کوئی تذکرہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک ان کی ہوشمندی اور تدبر کو خراج تحسین پیش نہ کردیا جائے۔ ان کی پارسائی، سلامت روی، دانش مندی اور اہلیت و قابلیت کا اس سے بہتر ثبوت ناممکن ہے کہ انھوں نے غیاث الدین بلبن سے لے کر غیاث الدین تغلق تک گیارہ درباروں سے وابستگی رکھی اور ہمیشہ اور ہر جگہ کامگار اور کامران رہے۔ انکی محبوبیت میں کہیں فرق نہیں آیا یہ زمانہ وہ تھا جب انقلاب کی آندھیاں برابر آتی رہیں، حکومتیں بنتی اور بگڑتی رہیں متمکین دولت و امارت کو عروج و زوال کا برابر یکے بعد دیگرے تخت نشینی کے بعد سامنا کرنا پڑا خاندان بنتے اور بگڑتے رہے۔ بہت سے رئیسوں کو جان عزیز سے بھی ہاتھ دھونے پڑے اور بہت سے خاک نشین تخت نشین ہوئے بہت سے اہل فضل و کمال کو بھی تباہی و بربادی کا سامنا کرنا پڑا لیکن یہ فضیلت صرف امیر خسرو کو حاصل رہی کہ ہر آنے والے بادشاہ نے پورے عزت و احترام کے ساتھ انکو اپنی قربت میں جگہ دی۔ ہوسکتا ہے کہ اس خصوصیت کی یہ وجہ بھی رہی ہو کہ انھوں نے سیاسیات میں کبھی دخل نہیں دیا، امور سلطنت میں کوئی حصہ نہیں لیا اور کوئی عہدہ ایسا کبھی قبول نہیں کیا جو مملکت کی سیاست سے متعلق ہو لیکن انکی عظمت کی اصل وجہ انکا بلند کردار تھا انکا پاکیزہ عمل تھا اور انکی اہلیت و قابلیت تھی جس نے انکو آسمان علم و ادب کی بلندیوں پر مہر و ماہ کی طرح درخشاں اور تاباں کردیا تھا۔

یاسؔ عظیم آبادی

مرزا واجد حسین یاسؔ پٹنہ عظیم آباد صوبہ بہار کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے اپنے بزرگوں کے وطن ہی میں تعلیم و تربیت پائی مشق سخن بھی ابتدائے عمر ہی میں شروع کر دی تھی۔ شاد عظیم آبادی کے ایسے جلیل القدر استاد سے تلمذ تھا اور انھیں کی صحبت میں یاسؔ نے اس فن میں کمال حاصل کر لیا تھا۔ تخمیناً چالیس برس کی عمر میں جب لکھنؤ آئے تو ان کا رنگ سخن پختہ ہو چکا تھا اور وہ یقیناً ایک بلند پایہ اور باکمال شاعر ہو چکے تھے۔ لکھنؤ آنے کا باعث انھوں نے خود کبھی نہیں بتایا لیکن یہ ظاہر تھا کہ ان کو اس شہر کی شہرت گھسیٹ لائی تھی اور وہ یقیناً نہ صرف کسب معاش کی خاطر بلکہ دبستان لکھنؤ میں ایک ممتاز مقام حاصل کرنے کی تمنا میں آئے تھے۔ یہ ضرور ہوا کہ اس شہر میں آکر انھوں نے پہلی ملازمت حاصل کی مشاعروں میں شرکت کی اور یہیں شادی کر کے ایسا بسے کہ متعدد مقامات کا سفر کرنے کے بعد بھی برابر لکھنؤ آتے رہے اور بالآخر اسّی برس کی عمر میں انتقال فرما کے اسی سرزمین کی خاک کا پیوند ہو گئے۔ لیکن انھوں نے اپنی زندگی کے جتنے برس لکھنؤ میں گزارے ان کو مجادلہ اور ہنگامہ آرائی کا دور کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ ان کی طبیعت میں طوفان کا زور، مزاج میں بلا کی سرکشی اور دماغ و دل میں بے انتہا منچلا پن اور خود ستائی تھی۔ انھیں رجحانات کی بدولت ان کی فنکاری کے جوہر قدردانی کے ان منازل تک نہ پہونچ سکے جن کے وہ حقیقتاً مستحق تھے۔

یاسؔ عظیم آبادی سنہ ۱۹۱۱ء میں بہار سے مراجعت کر کے لکھنؤ آئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اس شہر کا سارا ماحول شعر و ادب میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس دور کے تمام باکمال شعرا زندہ تھے اور ان کا طوطی بول رہا تھا۔ ان فنکاروں کی ایک منضبط اور مضبوط پارٹی تھی جس کے بل بوتے پر ہمارے شہر میں بڑے کامیاب اور مہتم بالشان مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ شعرائے کرام کو عوام اور خواص سب ہی میں ہر دلعزیزی حاصل تھی۔

ان حالات میں قرینِ مصلحت یہی تھا کہ یاس عظیم آبادی بھی صفِ اول کے شعرا میں اپنی جگہ حسنِ اخلاق اور حسنِ گفتار کے سہارے حاصل کرتے اور اسی ایک کہکشاں سے منسلک ہو کر آسمانِ غزل پر ایک تابندہ اور درخشندہ ستارہ کی طرح رونق افروز ہو جاتے لیکن لکھنؤ کی بزمِ سخن میں آتے ہی ان کے دماغ میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا کہ لکھنؤ والے کسی بیرونی فنکار اور ادیب کو خواہ وہ کتنا ہی بلند مرتبہ کیوں نہ ہو کوئی اعلیٰ مقام دینے کو تیار نہیں ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے کو کسی سے بھی کمتر درجہ کا شاعر نہیں سمجھتے تھے اور کسی نہ کسی نہج سے اپنے کو سبھی سے بہتر اور برتر سمجھتے اور اظہار بھی کرتے تھے یہ دونوں باتیں ایک حد تک صحیح تھیں لیکن پھر بھی ان کا وہ طریقِ کار جو انہوں نے مجادلہ کے طرز کا اختیار کیا۔ لکھنؤ کی متانت اور سنجیدگی کے لئے سازگار نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دوستوں نے بھی ایک ایک کر کے ان کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا اور جو چھوٹا وہ فوراً ان کے ہاتھوں تیرِ ملامت کا نشانہ بن گیا۔ بیخود مرحوم سے ابتدا میں بہت گہرے دوستانہ تعلقات تھے لیکن بہت جلد ان کو "حرصی ٹٹو" کا خطاب دیا گیا۔ آرزو مرحوم کے ایسے سنجیدہ، متین اور خاموش بزرگ کو "میاں آرزو" کا لقب مرحمت ہوا۔ خود پرستی اور خودستائی اور طبیعت میں ہٹ اور فقدان اختلافات کے نیز اور بڑھتی گئی بالآخر وہ اساتذہ کے زمرے میں اپنے کو یکہ و تنہا محسوس کرنے لگے تھے یہ احساس جتنا جتنا بڑھتا گیا اتنا ہی ان کا خروشِ مجادلہ بھی گرم سے گرم تر ہوتا گیا سپر انداختہ ہونے کے وہ کبھی قائل نہیں ہوئے۔

اس ہنگامہ آرائی کا بنیادی سبب دو اساتذہ قدیم یعنی غالبؔ اور آتشؔ میں ایک کی دوسرے پر برتری کا معاملہ بن گیا تھا اس دور کے اساتذہ اپنے کو پیرو میرزا غالبؔ کہتے تھے غالبؔ کی تقلید اور ان کی عظمت کے قائل تھے یاس عظیم آبادی نے آتش ہی اتنا سراہا اور اتنا سراہا کہ آتش کو غالبؔ سے بھی اونچا کر دیا اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اپنے ہیجانی دماغ اور ضدی خصلت کے تابع ہو کر اپنے کو آتش پرست قرار دے دیا۔ غالبؔ کے کلام پر کوئی عالمانہ تبصرہ کرتے یا ان سے متعلق کسی مسئلہ پر کوئی فاضلانہ بحث چھیڑتے تو اس تنازعہ کی نوعیت ہی دوسری ہوتی اور ایک ادبی مباحثہ کی صورت اختیار کر لیتی مگر انہوں نے اپنی مخصوص ذہنیت کے تحت غالبؔ کی تحقیر و تضحیک کر ڈالی۔ کبھی غالبؔ کو چچا بنایا، کبھی خود غالبؔ

کیچا نے، غالبؔ شکن عنوان سے ورق کے ورق سیاہ کر کے اپنی ہجویات شائع کرائیں جس کا بہت خراب اثر خود انہیں کی شہرت پر پڑا۔ ایسے تصنیفات سے دو رباعیاں مثالاً پیش کی جاتی ہیں

تلوار سے کچھ کام نہ کھانڈے سے غرض　　مومن سے سروکار نہ پانڈے سے غرض
رنگون میں دم توڑتا ہے شاہ ظفر　　غالبؔ کو ہے اپنے حلوے مانڈے سے غرض

خاصانہ بھی بلا سے گھر میں گھر چیزیں بہت　　تن ڈھکنے کو صاحب کا اُتارن ہے بہت
دلّی کی سلطنت گئی چھینے گئے سے　　نوشہ کے لیے خلوت دہ پنشن ہے بہت

ان رباعیوں اور اسی طرز کے دوسرے کلام کا مطالعہ یہ ضرور واضح کرتا ہے کہ یاس عظیم آبادی کی انفرادیت نے ان کو "آتش پرست" بنایا اور انہوں نے غالبؔ کی جو نکتہ چینی کی وہ بڑی حد تک حق بجانب نہیں تھی۔

ہو سکتا ہے کہ ان کا یہ طرزِ عمل کردار کی کسی مخصوص بلندی کے پیشِ نظر رہا ہو کیوں کہ وہ خود بہت زیادہ مستغنی مزاج تھے۔ وہ جاہ و حشم کے پرستار نہیں تھے، حرص و آز کے بندے نہیں تھے اور نہ دولت و ثروت کے حصول میں زندگی کی اعلیٰ قدروں کو قربان کرنے کے قائل تھے۔ یہاں تک تو ہم ان کی نیک سیرت کو آج بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور ان کی یہ خوبی یقیناً اعتراف کی مستحق ہے لیکن شکایت اس بات کی ہے کہ انہوں نے غالبؔ کی تنقید کرنے کے لئے جن الفاظ کو منتخب کیا اور جو لب و لہجہ اختیار کیا وہ کسی طرح بھی انگیز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بالخصوص لکھنؤ کے اس ماحول میں جو شرافت، متانت اور سنجیدگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ان کے ایسے کلام کو خواص تو در کنار عوام نے بھی پسند نہیں کیا لیکن چوں کہ وہ ایک فنکار تھے اور بہت اچھے فنکار اس لئے شاعروں میں ان کو جگہ ملتی رہی اور ان کی حوصلہ افزائی بھی ہوئی۔ البتہ ان کے تعلقات اپنے ہم عصروں سے خراب تر ہوتے ہی چلے گئے، جن کو درست کرنے کی کوئی کوشش ان کے دماغی ساخت کے بس ہی میں نہ تھی وہ ایک دیو پیکر اور رستم نژاد پہلوان کی طرح ہر ایک کے مقابلہ میں تن تنہا اتر آئے تھے اور ان کا دل یہی چاہتا تھا کہ وہ اس میدان میں سب کو چت کر کے دم لیں۔ ایک مدت تک یہ گرم بازاری رہی اور یاس

عظیم آبادی اپنے ارادے پر ڈٹے رہے۔ چونکہ آہستہ آہستہ وہ بے یار و مددگار ہو گئے تھے اس لئے اس مجادلہ کو کوئی ختم کرانے والا بھی نہیں نکلا غالبؔ کے ایسے مسلم الثبوت اور باکمال شاعر کی شان میں جب اتنی اور ایسی دریدہ دہنی یاسؔ عظیم آبادی کر سکتے تھے تو ان کو اپنے ہم عصروں پر ملامت کے تیر چلانے میں کیا باک ہو سکتا تھا؟ یہ تمام اساتذہ غالب پرستی میں ان کے مدمقابل بنے ہوئے تھے۔ محاذ براہ راست انھیں کے خلاف قائم تھا اور یاسؔ ان سب کو اپنے مقابلے میں پست اور کمتر سمجھتے تھے۔ اس لئے نہ کسی رواداری کا سوال تھا اور نہ کسی تحقیر و تذلیل میں باک ہو سکتا تھا۔ ادبی مباحثے پس پشت ڈال کر ذاتیات اور ذاتی حملے برسرِ کار آ چکے تھے صف اول کے شعراء جن میں صفیؔ ثاقبؔ عزیزؔ، محشرؔ، آرزوؔ وغیرہم شامل تھے "غلیچون" کے لقب سے پکارے جاتے تھے اور ان میں سے ہر ایک کی توہین کر دینا یاسؔ نے اپنا مسلک بنا لیا تھا۔ مولانا صفیؔ کے ایسے محترم اور پاک باز بزرگ کی شان میں کہہ ڈالا کہ "ایک وہ ہیں جن کا جوبن تو ڈھل چکا ہے مگر چتون کی خونخواری جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے" بیخودؔ موہانی کے لئے ایک مقام پر فرمایا کہ "ایک ہیں مولوی ٹھینگا جو عرف عام میں موہانی کہلاتے ہیں"۔ عزیزؔ مرحوم کو "نخاس کا کشمیری" کہہ ڈالا محلہ نخاس میں کشمیری بھانڈ رہتے تھے اس طرح ان کو بھانڈ بنا دیا۔ غرضکہ کسی کو بھی اپنی بدلگامی سے نہیں بخشا۔ لیکن آخر کب تک!

یاسؔ عظیم آبادی کی انفرادیت اور ان کی قادر الکلامی ان کو ایک مدت تک سہارا دیتی رہی اساتذہ میں جو اپنی عمریں محفل شعر و ادب میں آخری منزل تک گھسیٹ لائے تھے باوجود اتنی دشنام طرازی کے صبر و تحمل سے کام لیتے رہے اور کسی طرح کا کوئی جواب دینے یا قصاص لینے پر آمادہ نہیں ہوئے لیکن جب شہرت کاذبہ المعروف بہ خرافات عزیزؔ کے نام سے ایک رسالہ عزیزؔ لکھنوی کی ہجو میں شائع ہوا تو ان کے شاگردوں کا جام صبر لبریز ہو گیا انہیں شاگردوں میں جوشؔ ملیح آبادی بھی تھے جو کافی اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ وہ ملیح آباد کے ایک تعلقہ دار گھرانے کے چشم و چراغ ہیں اور پٹھان ہوتے ہوئے ان کی رگوں میں ہمیشہ خون گرماتا رہا ہے۔ جوشؔ صاحب اپنے استاد کی توہین اور

ہتک گوارا نہیں کر سکے۔ انہوں نے اپنے ذاتی اقتدار کے بل بوتے پر یاس عظیم آبادی کو ان کی ملازمت سے سبکدوش کرا دیا وہ مطبع نولکشور میں ایک اچھی جگہ پر ملازم تھے نوکری سے برخاست کیے جانے کے بعد معاش کا مسئلہ پھر درپیش ہوا اور یاس کے لئے اور کوئی چارہ بجز اس کے باقی نہیں رہا کہ وہ شہر لکھنؤ کو خیرباد کہہ دیں۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کو لکھنؤ چھوڑنے کا بہت دکھ ہوا اس شہر سے ان کو قلبی لگاؤ تھا اور یہاں کا تذکرہ ان کے کلام میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ لکھنؤ کی تعریف کو بھی اپنے فطری بانکپن کے زور میں دبائے رکھنا چاہتے ہیں لکھنؤ کی تعریف بھی کرتے ہیں تو ان کی انانیت ان پر غلبہ کئے رہتی ہے مثال کے طور پر ایک شعر درج ذیل ہے۔

لکھنؤ کے فیض سے دور دور ہیں پھر سے میرے سر　　ایک تو استاد یگانہ دوسرے داماد ہو

انفرادیت ان میں بلا کی تھی اور انانیت کا سودا ان کے دماغ میں اتنا بھرا ہوا تھا کہ وہ اپنا سر کسی کبھی کسی عظمت اور فنی کمال کے آگے جھکا نہیں سکے وہ جب یہاں آئے تھے تو مرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی تھے یہاں کی محفلوں میں جب مقابلے اور لڑائی میں اتر آئے تو اپنا تخلص یاس سے یگانہ بدل دیا۔ اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اپنے کو کبھی امام الغزل، کبھی ابوالمعانی اور کبھی یگانہ علیہ السلام کے القاب سے سرفراز فرماتے رہے۔ بے روزگار ہونے کے بعد جب لکھنؤ کو باعث دیاس خیرباد کہہ کر تلاش معاش میں پنجاب جانا پڑا اس وقت بھی مزاج کے طنطنہ میں کوئی کمی نہیں تھی اور نہ یکہ و تنہا اپنے تمام معاصرین سے نبرد آزمائی کا جذبہ کسی طرح بھی کم ہوا تھا ان کے ان جذبات و رجحانات کی ترجمانی ان کا کلام اور ان کا بیان کیا کرتا تھا چنانچہ پنجاب پہنچنے کے بعد ہم نے یہ دیکھا کہ ان کی حوصلہ مند طبیعت نے ان کو اپنے نسب نامہ پر نظر ثانی کرنے کے لئے مجبور کیا اور وہ اپنے کو یگانہ چنگیزی کہنے لگے چنگیز خاں سے انسیت ان کے اسی جذبے کا مظاہرہ تھا جو اپنے مدمقابل کو نہ صرف شکست بلکہ ہلاک کر دینے کا ان کے دل میں موجزن رہا کرتا تھا۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہلاک کر دینے سے موت کے گھاٹ اتار دینا

کبھی ان کے وہم و خیال میں بھی نہیں آیا بلکہ وہ اپنے مدمقابل کے ادبی وقار کو ملیا میٹ کر دینے کے ضرور خواہش مند رہتے تھے کیونکہ وہ ہر ایک کو اپنے سے پست سمجھتے اور کسی ہمعصر کی اپنے مقابل میں برتری تو درکنار برابری بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔

یگانہ بہرحال ایک بلند پایہ اور نغز گو شاعر تھے خوش مزاج اور خوش گفتار انسان تھے۔ اس لئے پنجاب میں ان کی بڑی قدر دانی ہوئی۔ ان کی ٹکر کا کوئی دوسرا شاعر بھی بظاہر موجود نہیں تھا جو ان سے برابری کا دعویٰ کر سکتا لہذا بہت آسانی کے ساتھ ان کی شہرت دور دور پھیل گئی۔ کچھ ذریعہ معاش بھی فراہم ہو گیا مگر شعرائے لکھنؤ سے ان کی نوک جھوک وہاں سے بھی چلتی رہی تھوڑی مدت کے بعد پنجاب کو خیرباد کہہ کر پھر لکھنؤ آ گئے اس مرتبہ زیادہ قیام نہ کر سکے۔ بہت جلد حیدرآباد میں ملازمت کا سہارا مل گیا وہاں وہ مہاراجہ کشن پرشاد کے ایسے ادب نواز اور ادیبوں کے قدر داں بزرگ سے منسلک رہے انھیں کی توجہ کی بدولت سب رجسٹراری کا عہدہ مل گیا جہاں پوری نیک نامی کے ساتھ انہوں نے فرائض منصبی ادا کئے۔ شاعر کی حیثیت سے بھی وقار حاصل رہا بالآخر سنہ ۱۹۴۲ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور مستقل سکونت اختیار کرنے کے ارادے سے لکھنؤ واپس آ گئے اور محلہ ٹاپے والی گلی میں فروکش ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ان کی سب سے پہلی آمد کے بعد تیس برس کی مدت گزر چکی تھی۔ جو مجادلہ اس زمانے میں ایک طوفان کی شکل میں برپا ہوا تھا اسکے اثرات بظاہر ختم ہو چکے تھے جن جن لوگوں سے پہلے وہ دست و گریباں ہو چکے تھے اُن میں بیشتر راہی ملک عدم ہو گئے تھے اور جو باقی رہ گئے تھے ان کی کوئی منظم ٹولی نہیں تھی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ لکھنؤ کی بساط شعر و سخن پُر شکن تھی اور پرانی محفلیں سونی ہو چکی تھیں یگانہ بھی مخصوص چند دوستوں سے تعلقات برقرار رکھتے ہوئے قریب قریب گوشہ نشین تھے۔

ان معدودے چند نفوس میں جو پرانی یادوں کو بھلا نہیں سکے تھے اور جو یگانہ چنگیزی کی دوستی کا دم بھی بھرتے تھے بعض ایسے تھے جن کے دلوں میں رنجش ایک دبی ہوئی چنگاری کی طرح

اندر ہی اندر سلگ رہی تھیں ان کو یگانہ کی لکھنؤ میں واپسی اس لیے اور شاق گزری کہ اس مرتبہ لکھنؤ آتے ہی انہوں نے یہاں کی درہم و برہم انجمن میں شہرت و وقار حاصل کر لیا تھا۔ پروفیسر احتشام حسین مرحوم کے ایسے ناقدانِ فن، پروفیسر مسعود حسن مرحوم کے ایسے گراں مایہ ادیب اور پنڈت آنند نرائن ملاؔ کے ایسے بلند پایہ شاعر ان کا احترام کر رہے تھے اور ان کے منزلت شناس تھے۔ دفعتاً وہ وقت آگیا کہ جو نہ آنا چاہئے تھا اور وہ سانحہ رونما ہوا جس کو دیکھ کر انسانیت لرزہ براندام ہو گئی اور شرافت نے ندامت و شرمندگی میں اپنا سر جھکا لیا۔ جو کچھ ہوا وہ لکھنؤ کی درخشندہ پیشانی پر ایک ایسا بدنما داغ تھا جو ہمیشہ برقرار رہے گا۔ یگانہ نے ایک خط نیاز فتحپوری کو لکھا جو انہوں نے مولانا عبدالماجد دریاآبادی کو بھیج دیا۔ یہ دونوں بزرگ یگانہ کے دوست سمجھے جاتے تھے۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ اس خط کو طنز و مزاح کا ایک ادبی شاہکار قرار دیا جاتا اور اسی لب و لہجہ میں یگانہ کو جواب دے دیا جاتا لیکن اس خط کا شدت کے ساتھ نوٹس لیا گیا۔ یگانہ پر خدا کی توہین اور رسول اسلام کی شان میں گستاخی کا الزام لگایا گیا اور اس الزام کی بھرپور اشاعت ہوئی مسلمانوں کا نوجوان طبقہ مشتعل ہوا یا مشتعل کرایا گیا بیراہ روی سے یگانہ کی توہین و تذلیل میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی جس کو انہوں نے بجز نفس اور مجبوری کے عالم میں انگیز کیا۔ لیکن جو بات آج بھی کہنے میں آتی ہے وہ ان کے کردار کی بلندی ہے انھوں نے شدید ترین ظلم برداشت کیا لیکن نہ ان کی بے نیازی کو ٹھیس لگی اور نہ ان کے بانکپن میں کوئی فرق آیا۔ اس سانحہ کے بعد کئی برس تک زندہ رہے اور بالآخر ۴۔ فروری سنہ ۱۹۵۶ء کو انتقال فرمایا آخر عمر میں یہ شعر بہت یاد آتا تھا اور بار بار پڑھا کرتے تھے،

زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے   دیکھیں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

یاسؔ عظیم آبادی ثم یگانہ چنگیزی کی ستاسی سالہ زندگی کے اس سرسری مطالعہ کے بعد جہاں یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان کی شخصیت بحث طلب تھی تو اسی کے ساتھ ہم کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا

ہے کہ وہ اپنے معین کردہ اصولوں پر سختی کے ساتھ پابند رہے اور اپنی دھن کے پکے تھے۔ ان کے مزاج میں بانکپن اور طبیعت میں سخت ہونے کے باوصف نفس کشی کا بھی جذبہ تھا وہ سپر انداختہ ہونا جانتے ہی نہ تھے لیکن جب ان کو شدید ترین عقوبت کا سامنا کرنا پڑا تو اپنی بے گناہی پر ایقان رکھتے ہوئے بھی انہوں نے جو کچھ ظلم ہوا اس کو خندہ پیشانی کے ساتھ جھیل لیا اور صبر وتحمل کا عدیم المثال مظاہرہ کر دکھایا۔ اس موقع پر انہوں نے اپنے پُرخلوص دوست پنڈت آنند نرائن ملّا کو جن کی قانون دانی مسلّم تھی اور وجاہت واقتدار مستند تھا، یاد بھی کیا لیکن کسی قانونی کاروائی کے لئے نہ خواستگاری کی اور نہ آمادگی ظاہر کی۔ اس خاص مکتوب کے بارے میں جس کے لکھنے کی سزا ان کو شدت کے ساتھ بھگتنا پڑی، ہرگز بہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ عبارت آرائی ان کے مذہبی عقیدے کی ترجمانی کرتی تھی۔ بلکہ اس کے برعکس ہم نے یہ بھی دیکھا تھا کہ اسی قسم کے خیالات کو خود جناب نیاز فتحپوری بار بار پیش کر چکے تھے لیکن ان سے کبھی کسی نے کوئی باز پرس نہیں کی تھی۔ البتہ حضرت نیاز نے جب یگانہ کے خلاف اعتراض وارد کیا تو نوجوانوں کو مشتعل کرانے کی حرکت بیجا بھی جائز قرار پا گئی۔ راقم ...... اپنی جانب سے یگانہ کی بے گناہی پر کوئی دلیل پیش کرنا مناسب نہیں سمجھتا لیکن اس موقع پر خود انہیں کا ایک شعر یاد آرہا ہے جو ان کے خلاف عائد کردہ فرد قرار داد جرم کا مکمل جواب ہے ؎

کرشن کا ہوں پجاری علی کا بندہ ہوں
یگانہ شانِ خدا دیکھ کر رہا نہ گیا

صرف اسی ایک شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ذات واجب الوجود پر ایمان رکھتے تھے اور اپنی وسعت فکر و نظر کی بدولت عصبیت اور فرقہ واریت سے بھی بری اور پاک و صاف تھے۔

یگانہ کے مذہبی عقیدے سے موجودہ زمانہ میں بحث بیکار ہے۔ حالات بدل چکے، قدریں تبدیل ہو چکیں لکھنؤ کا یادش بخیر وہ ماحول باقی نہ رہا جب تہذیب و اخلاق کی شمعیں گلی گلی اور کوچہ کوچہ تابندہ اور فروزاں رہا کرتی تھیں، وہ بساط شعر و سخن الٹ گئی جہاں ارباب فن بیٹھا کرتے تھے، اب نہ یگانہ ہیں اور نہ وہ ان کے ہم عصر ہیں جن سے مجادلے رہا کرتے تھے، ان ہنگامہ آرائیوں

کی محرک یگانہ کی جو ذہنی گتھیاں تھیں ان واقعات وحالات کو جاننے اور بیان کرنے والے بھی نہ رہے یہ ساری داستانیں اب طاقِ نسیاں کی زینت بن چکی ہیں اور پرانے کلچر کے مٹ جانے کے بعد اس کی نزاکتوں اور باریکیوں کو نہ سمجھانا سہل ہے اور نہ سمجھنا آسان ہے اسلئے اب ہم کو یگانہ چنگیزی کا صرف بحیثیت ایک شاعر، ادیب اور فنکار کے جائزہ لینا چاہئے اور انھیں کے کلام سے اس ذہنی کشمکش کا اندازہ کرنا چاہئے جس میں وہ ہمیشہ مبتلا رہے اس اصول کے تحت ہم جب ان کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو ہم کو ان کی فنکاری اور قدرت کلام کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ ان کے اشعار میں سادگی، برجستگی، کیفیت، شورش لذت اور معنویت ہے۔ اس کے ساتھ ان کے کردار کا نقش بھی ان کے کلام میں بھرپور رعنائی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ بسا اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ غیر معمولی حساس بھی ہیں اور اپنے جذبات ورجحانات کو من وعن پیش کرنے کی قدرت بھی رکھتے ہیں۔ ایک دکھے ہوئے دل کی دھڑکنیں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ کرب کی آواز سننے والوں کے کلیجوں کو برما دیتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس زمانہ میں بھی جب وہ لکھنؤ کی انجمنوں میں مستند اساتذہ کی نکتہ چینی میں قہر وغضب تک اتر آتے تھے مشاعروں میں ان کی غزلیں پسند کی جاتی تھیں۔ اور رسمی واہ واہ سے زیادہ مبنی بر حقیقت ان کی تعریفیں ہوتی تھیں۔ سخن فہموں اور نکتہ دانوں کی کمی نہیں تھی۔ مشاعروں میں ایسے ہی لوگوں کا مجمع رہا کرتا تھا، اور ان سامعین میں بڑی تعداد ان کی مشتاق رہا کرتی تھی۔ زیادہ تر لوگ ایسے ہی ہوتے تھے جو ان کی غزل سنتے وقت ان کی ایسی ہرزہ سرائیوں کو فراموش کر دیا کرتے تھے جن کا ارتکاب ان کا اپنے ہم عصروں کے خلاف معمول بن گیا تھا ان کے مطبوعہ دیوان غالباً اب بھی دستیاب ہو سکتے ہیں ان کا مطالعہ ہمارے ذوق سخن سنجی کو پوری طرح آسودگی بخشتا اور علم النفس کے طالب علم کے سامنے ان کے نفسیاتی کیفیات کو اچھی طرح اجاگر کرتا ہے۔ قادر الکلامی کا یہ عالم تھا کہ ان کا رنگ سخن اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں یکساں ہے انہوں نے فارسی میں بھی بہت اچھی غزلیں کہی تھیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر ان کے کچھ فارسی اور اردو اشعار

مثلاً پیش کر دیے جائیں اختصار ملحوظ رکھتے ہوئے راقم صرف ان چند اشعار کو پیش کر دینا کافی سمجھتا ہے جن کو منجملہ بہت سے دیگر اشعار کے مجھے صحبتوں میں خود انہیں کی زبان سے سننے کا فخر حاصل ہوا تھا اور جن کو پڑھ کر آج بھی یگانہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ پہلے چند اشعار فارسی کے ملاحظہ فرمائیے۔

منکہ بزمی تابم درد زیستن تنہا   صبحدم چناں بینم شمع انجمن تنہا
ہر گلے و ہر خارے فتنہ ہا برانگیزد   الحذر دل حیراں صد بہار و من تنہا

اضطراب بال و پر پروانہ وارم دادہ اند   جائے دل یک شعلۂ بے اختیارم دادہ اند
تشنۂ موج سرابم پا بجولاں می روم   منزل موہوم و پائے بیقرارم دادہ اند
مژدۂ تسکیں یگانہ کے نصیب من شود   یک پیام زیر لب بیگانہ وارم دادہ اند

دیدنی نادیدنی را ہیچ آثارے نماند   گل بدستارم کجا بر دامنم خارے نماند

ہر کس دنا کس بہ طوفان حوادث مبتلا   موج دریا بیقرار و خار و خس بے اختیار

خود پرستان ازل دارند ایمانے دگر   حق پرستی می کنند اما بہ عنوانے دگر
دست خود داماں خود بودن زادولئے   دست گستاخے دگر خواہیم دامانے دگر

ان اشعار میں سعدی کی سادگی بیان اور حافظ کے کلام کی چاشنی نہیں ہے اور نہ خیام کی بلندی فکر و نظر، پھر بھی ندرت خیال کی اچھی مثالیں ملتی ہیں اور طرز ادا میں لذت ہے بڑی حد تک آمد ہے اور آورد کی بے کیفی سے یہ اشعار پاک و صاف ہیں قادر الکلامی کے ثبوت میں

یہی دو اشعار کافی ہیں جن میں "تنہا" کی ردیف کے ساتھ "زیستن" اور "انجمن" کے قوافی نظم کئے ہیں۔ داد اندکی ردیف والے اشعار ہیں فلسفۂ حیات شاعر کے دل کا گداز اور اس کے احساس مجبوری پر تشکر کے پردہ میں شکوہ کا اظہار پیدا کیا گیا ہے۔ یگانہ کے فنی کمال کو واضح کرنے کے لئے پورے اطمینان کے ساتھ چند اشعار پر اکتفا کی جاتی ہے حق پرستی میں خود پرستی کو شامل کر دینا اس بانکپن کا ثبوت ہے جو یگانہ کے کردار کا طرۂ امتیاز تھا۔ یہ خوبیاں اس زبان میں ملتی ہیں جو ان کے لئے اکتسابی تھی مادری زبان یعنی اردو میں ان کا کلام ندرت خیال، معنویت، اور شعریت کا ایک بیش بہا خزینہ ہے اور ان کی غزلیات میں وہ لطف اور تاثیر ہے جس کے لئے ان کو داد دینا ہی پڑتی ہے۔ غالب اور آتش کے طرز فکر اور طرز ادا کا موازنہ کئے بغیر ہم یگانہ چنگیزی کی شاعری اور ان کے خصوصیات شعری کی عظمت تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ چند اشعار اردو کے بھی مثالاً درج ذیل ہیں۔

مصیبت کا پہاڑ آخر کو اک دن کٹ ہی جائیگا مجھے سر مار کر تیشہ سے مر جانا نہیں آتا

نیرنگ حسن و عشق کی وہ آخری بہار تربت تھی میری اور کوئی اشکبار تھا

اصلاح کی مجال نہیں ہے تو کیا ضرور بے ربطیٔ نوشتۂ تقدیر دیکھنا

اجل سے بڑھ کے محافظ نہیں کوئی اپنا خدا کی شان کہ دشمن نگاہبان نکلا

جامہ زیبوں پہ کفن نے بھی دیا دہ جوبن دوڑ کر سب نے کلیجے سے لگانا چاہا

دیکھ کر آئینے میں چاک گریباں کی بہار اور بگڑا ہے مزاج آپ کے دیوانے کا

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے　　وہ بدنصیب جسے بختِ نارسا نہ ملا

موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی　　لے دعا کر چکے اب ترکِ دعا کرتے ہیں

منزل کی دھن میں آبلہ پا چل کھڑے ہوئے　　شورِ جرس سے دل نہ رہا اختیار میں

لیلےٰ کجا، کجا یہ طلسماتِ عنصری!　　کیا ڈھونڈھتا ہے پردۂ گردِ غبار میں

سہو و خطا ودیعتِ فطرت سہی مگر　　سمجھاؤں کیا ضمیرِ ملامت شعار کو

دیوانہ وار دوڑ کے کوئی لپٹ نہ جائے　　آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا نہ کیجئے

ہم دل جلوں کو راس نہ آئی ہوائے گل　　اک آگ سی برستی ہے ابرِ بہار سے

دہائی ہے دلِ درد آشنا دہائی ہے　　کراہ مرد پہ تہمت ہے دل دکھانے کی

مزہ گناہ کا جب تھا کہ باوضو کرتے　　بتوں کو سجدہ بھی کرتے تو قبلہ رو کرتے
مزا دیاسؔ یہ کرتے ہیں شکر کے سجدے　　دعائے خیر تو کیا اہلِ لکھنؤ کرتے

ان اشعار پر تبصرہ کرنا بے سود اور بے محل ہوگا اسلئے کہ ہر شعر اپنی جگہ پر یاس کی فنکاری اور قادر الکلامی کی ایک واضح مثال ہے۔ ان کا طرزِ فکر، حسنِ بیان اور معنویت کے ساتھ لذت

ہر ہر شعر میں موجود ہے۔ ان کی عالی ہمتی اور رجائیت کے ثبوت میں پہلا ہی شعر کافی ہے۔ تصوف اور وحدت واجب الوجود کا بھی انھیں اشعار میں تذکرہ مل جاتا ہے۔ یہ چند منتخب اشعار اس زمانہ میں خواص و عوام کے زبان زد تھے اور ان میں کچھ اتنی جاذبیت اور کشش محسوس کی جاتی تھی کہ ان کے وہ ہم عصر بھی جن سے ان کی لڑائیاں رہا کرتی تھیں، اعتراف کرنے پر مجبور پائے جاتے تھے۔ اس دور میں بعض ایسے اساتذہ بھی تھے جو مشاعروں میں تعریفیں نہیں کرتے تھے اور ایسے حضرات کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا اظہار شعر سنتے ہی ان کے چہروں سے ہو جایا کرتا تھا۔ یہ لوگ مشاعروں کے بعد اپنے ہم عصروں یا شرکائے بزم کو سنا کر داد سخن دیا کرتے تھے۔ انھیں جلیل القدر ہستیوں میں مولانا صفی بھی تھے۔ لیکن یہ واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مشاعرہ ہی میں یاس کی زبان سے یہ شعر سن کر کہ

"بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے وہ بد نصیب جسے بخت نارسا نہ ملا"

مولانا صفی نے برجستہ فرمایا تھا "پھر ارشاد ہو" اسی طرح ہماری بھی صحبتوں میں بیخود موہانی بہت مزے لے لے کر یاس عظیم آبادی کے اشعار پڑھا کرتے تھے ایک مرتبہ ان کو میں نے اور سید علی اختر مرحوم فیض آبادی نے، جو بیخود مرحوم کے گھریلو دوستوں میں تھے یہ یاد دلایا کہ یاس دہی ہی جوان کو "حرمی ٹٹو" اور "مولوی ٹھینگا" بنا چکے ہیں تو انہوں نے مسکرا کر جواب دیا تھا کہ "وہ اور بات ہے لیکن جب شعر اچھا ہو تو اس کمبخت کی بھی تعریف کرنا ہی پڑتی ہے" اس واقعہ کے ذیل میں اتنا اور کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ جہاں تک میں سمجھ سکا تھا ان پرانے اساتذہ کے دلوں میں باوجود شدید ترین ظاہری مخالفت اور نبرد آزمائی کے نفاق و شقاق و عناد کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ یہ لوگ اپنے بدترین دشمنوں کے خلاف بھی دلوں میں کوئی کدورت نہیں رکھتے تھے۔ اور یہی خوبی ہمارے پرانے کلچر کا اہم جزو تھی۔

آخر میں یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یاس عظیم آبادی ثم یگانہ چنگیزی کے طرز غزل سرائی کا ضمناً کچھ تذکرہ کر دیا جائے۔ اس زمانہ میں شعراء اپنا اپنا کلام بے حد سادہ طرز سے پڑھتے

تھے بعض اساتذہ الفاظ اور فقروں کو توڑ موڑ کر پیش کرتے تھے۔ ایسے حضرات کو اگر آج ہمارے مشاعروں میں ترنم کے مواقع فراہم ہو جائیں تو داد ملنے کے بجائے جملہ بازیوں اور سیٹیوں کی آوازوں سے ان کی تواضع کی جائے گی۔ لیکن اس وقت کا سماج اتنا زیادہ سنجیدہ تھا کہ ترنم کو بھی موسیقی سے تعبیر کیا جاتا تھا، موسیقی بہت مرغوب تھی لیکن اپنے مخصوص محل و مقام پر، مشاعروں میں صرف کلام پر نظر رکھی جاتی تھی اور اسی میں خوبیاں یا لغزشیں نکالی جاتی تھیں۔ مولانا صفی وہ پہلے استاد فن تھے جنھوں نے مشاعروں میں اپنی غزل ترنم سے پڑھنے کی بناڈالی تھی مگر ان کا طرز بھی لے اور سُر سے بری تھا، اس میں خوش الحانی تھی، غنائیت برائے نام نہ تھی۔ یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ ان کے اس اچھے اسلوب کا بھی تتبع نہیں کیا گیا۔ یاس عظیم آبادی آئے تو اپنے ساتھ اپنا مخصوص لحن بھی لائے ان کا انداز یہ تھا کہ وہ خود وجد میں آکر لحن سے اپنی غزل سناتے تھے۔ ان کی آواز میں گداز تھا اور ایک مخصوص دھیمی گرج کے ساتھ فطری ترنم تھا کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہمہ تن شعر و شعریت ہیں پہلے مصرع کو عموماً دو مرتبہ پڑھتے اور دوسری مرتبہ اس طرح جھوم کر پڑھتے کہ مصرع کا اثر دوآتشہ ہو جاتا تھا مجمع کو مسخر کر لیتے اور اپنا وجد دوسروں پر بھی طاری کر دیتے تھے۔ وجدانیت اور محویت سامعین پر چھا جاتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ زیادہ تر مشاعرہ لوٹ کر اٹھتے تھے وہ اساتذہ جن کے خلاف انہوں نے محاذ قائم کر رکھا تھا خاموشی کے ساتھ ان کا کلام سنا کرتے تھے لیکن انہیں کے شاگرد یاس کے پڑھنے سے متاثر ہوتے اور ان کے محاسن کلام کی تعریفیں کرتے۔ اس صورت حال سے بھی یاس کو بے انتہا گھٹن اور تکلیف محسوس ہوتی تھی اور اُن کے ذہنی ہیجانات میں ان مایوسیوں کو بھی ایک قومی محرک کہنا پڑتا ہے۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ غزل پڑھنا یاس عظیم آبادی کا حصہ تھا اور اس فن کو انہوں نے معراج کمال تک پہونچا دیا تھا۔ راقم کو پرانے مشاعروں سے شغف تھا اور شاید ہی کوئی ایسا بڑا مشاعرہ ہوا ہو جس میں اس نے شرکت نہ کی ہو اس لئے وہ بلا خوف تردید یہ عرض کر سکتا ہے کہ اس نے یاس سے بہتر کسی کو غزل پڑھتے نہیں سنا۔ یہ وہ ہنر تھا جو

انھیں کے ساتھ ختم ہو گیا۔ وجدان کی جگہ اب غنایت نے لی ہے لیکن وہ بات کہاں کہ شعر کی معنویت اور اس کی خوبیاں طرز ادا کے بل بوتے پر سننے والوں کے دل و دماغ میں اتر جائیں یگانہ اس فن میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے ان کو ہر اعتبار سے ایک بلند پایہ فنکار کہنا پڑتا ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں بہت بڑا ادبی ذخیرہ چھوڑا ہے جو ہمارے لئے مایہ ناز ہے لیکن اب وہ آواز کہاں جو ان کی غزلوں میں جان ڈال دیتی تھی۔ کہنا پڑتا ہے کہ ؎

نغمہ را از پردۂ سازش کفن خواہد شدن

ہری چند اختر

یہ قول مسلم الثبوت ہے کہ شاعر کا کلام اس کے کردار کا آئینہ ہوتا ہے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ شاعر حقیقتاً شاعر ہو، صاحب کردار ہو اور اس کا کردار بلند بھی ہو، ہر موزوں طبع انسان بلندیٔ کردار کا حامل نہیں ہوتا طبیعت کی موزونی بڑی حد تک سخن فہمی اور سخن سنجی کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے جس کے ثبوت میں ہم کو ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں کہ ہم ایسے شعراء کا کلام سن کر وقتی طور پر لطف اندوز ہو لیتے ہیں لیکن بعد میں ان کے تخلیقات کو رسمی شاعری کہہ کر سعیٔ لاحاصل قرار دینے ہی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال ان اساتذہ کے کلام کی نہیں ہے جو بلند کردار کے مالک ہوتے ہوئے شعر و سخن کے اعلا ترین مدارج پر بھی فائز ہوتے ہیں۔ ان کے اشعار بالخصوص چند اشعار کے بارے میں اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ یہ وہ کلام ہے جو جب دل سے نکلا اسی وقت دل میں پیوست ہو گیا ایسے باکمال شاعروں میں سب سے زیادہ دل آویز اور جاذب نظر شخصیتیں میرؔ و غالبؔ کی تھیں۔ یہ دونوں اپنے اپنے مخصوص طرز کا مذاق رکھتے تھے۔ میرؔ کے یہاں سوز و گداز، قناعت اور رفعتِ تخیل کی عدیم المثال نظیریں ملتی ہیں تو غالبؔ دقیقہ سنجی، عالی ہمتی اور رجائیت میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے چنانچہ ہم نے میرؔ کی قناعت اور غالبؔ کی اعلیٰ ہمتی کو ان کے کلام میں پرکھا ہے۔ یا یوں کہئے کہ ان کے اسلوب سخن کو جانچ کر ان کے کلام سے ان کے کردار کو سمجھا ہے میرؔ و غالبؔ کے یہاں حسنِ کردار کی تابندہ مثالیں بہتات کے ساتھ ہیں لیکن بعض دوسرے شعرا کے کلام میں بھی ان کے کردار کی درخشانی نظر آتی ہے چنانچہ ہمارے اسی صدی کے شعرا میں ہری چند اختر ایک ممتاز اور مقتدر جگہ کے مالک ہیں ہری چند اختر سے میری صرف ایک بار جوش ملیح آبادی کے توسط سے ملاقات ہوئی تھی

اور میں اسی وقت ان کی خوش گفتاری، شیریں زبانی اور بذلہ سنجی سے مسحور ہو گیا تھا ان کا کلام ان ہی کی زبانی سننے کا موقع کبھی نہیں ملا۔ البتہ جوش صاحب نے فرمایا تھا کہ وہ بے حد زود گو تھے اور انہوں نے بے شمار غزلیں اور نظمیں کہی تھیں جو بہت بڑی تعداد میں تلف ہو گئیں جو کچھ فراہم ہو سکا وہ ایک مختصر مجموعہ کی صورت میں "کفر وایمان" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ آل احمد سرور صاحب نے ہری چند اختر کے بارے میں اور ان کے طرز ادا کا جائزہ لے کر جو کچھ لکھا وہ حرف بحرف صحیح ہے سرور صاحب فرماتے ہیں "وہ ایک بڑے بلغ وبہار آدمی، ایک بڑے مخلص اور بے ریا دوست، ایک فاضل، ایک کڑھے ہوئے انسان اور ایک زخموں کی کائنات لئے ہوئے محفل کو زعفران زار بنانے والے تھے" کفر وایمان" کے اوراق الٹیے، آپ دیکھیں گے کہ زندگی کی تلخیوں کا ذکر ہو، موت کا تذکرہ آجائے، حسن وعشق کی داستان بیان ہو انسانیت کی تشریح کی جائے، وطن پروری کے جذبہ کی ترجمانی ہو، عبادت وریاضت کی منزل پیش ہو، یہ شاعر ہر جگہ اور ہر مقام پر خوش فکر، خوش گفتار، نغز گو، بذلہ سنج اور بلغ وبہار نظر آتا ہے۔ اس کی ہر بات کھلتی ہوئی کلی کی طرح مہک مہک اور رنگ و بو رکھتی ہے۔" حسب ذیل اشعار مثالاً پیش کیے جاتے ہیں:

ذہن رہین قومیت احساس محبوس وطن
والے نادانی قفس کو آشیاں سمجھا تھا میں

زندگی بیٹھی تھی اپنے حسن پر پھولی ہوئی
موت نے آتے ہی سارا رنگ پھیکا کر دیا

ابھی تو یہی دیکھنا چاہتا ... ہوں
نہیں چاہتا ان کو یا چاہتا ہوں

وہ کہتے ہیں تم مجھ سے کیا چاہتے ہو
یہی کچھ تو میں جاننا چاہتا ہوں

میں سمجھا وہ کچھ پوچھنا چاہتے ہیں
وہ سمجھے کہ میں کچھ کہا چاہتا ہوں

عمر بھر کا عہد الفت اک خیال خام تھا
آؤ لیکن اس خیال خام کی باتیں کریں

لب پر ہی کبھی آ نہ سکا نام تمہارا — دل نے تو کئی بار پکارا ...!

اک بار جو مل جائیں وہ بچھڑے ہوئے لمحے — سو بار مجھے تلخیٔ ایام ..... گوارا

فریادِ آرزو اب تو نہ دے اے مرگِ مایوسی — ہم امیدوں کی اک دنیا لٹا کر لوٹ آئے ہیں

بہارِ جانفزا بلبل کے نغمے چاندنی راتیں — ہر اک شے آنے والی آ گئی کیا تم نہ آؤ گے

نگاہوں کو زباں کا ترجماں کہنا ہی پڑتا ہے — خموشی کو کبھی دل کی زباں کہنا ہی پڑتا ہے

خداوندا بھر آخر کیا تمنا ہے مرے دل کی؟ — وہ پہلو میں بھی ہیں لیکن پریشانی نہیں جاتی

ان اشعار میں نہ صرف رنگینی و شوخی ہے بلکہ وہ برجستگی بھی ہے جو اختر کے کلام کو بیحد دلکش بنا دیتی ہے۔ صفائی اور سادگی کے ساتھ ان کا برجستہ انداز ہر موضوعِ سخن میں خواہ وہ دردناک ہی کیوں نہ ہو لطف پیدا کر دیتا ہے دنیا کی بیوفائی کا ذکر ہو یا دوستوں کی بے مہری کا عام انسانوں کی زبوں حالی پر تأسف کیا جائے یا بڑے چھوٹے کی امتیازی شان پر آنسو بہائے جائیں اختر کی زبان و بیان میں خلوص کی جھلک ملتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو کچھ خود ان کے دل پر گزر رہی تھی اسی داستان کو بیان کر رہے ہیں۔ اس حقیقت نگاری کو ان کے بیان کی سادگی اور برجستگی نے اور بلند کر دیا ہے۔ انہوں نے جو کچھ محسوس کیا اس کو اسی طرح نظم کر دیا اپنے تاثرات کے اظہار میں الفاظ کے انتخاب پر بھی سنجیدہ اور شگفتہ نظر رکھی ہے۔ ایسے موضوعات کو پیش کرنے میں معمولی دماغ بسا اوقات جذبات کی رو میں خود بھی بہہ جاتا ہے اور دوسروں کو بھی جذبات سے مغلوب کرا دیتا ہے لیکن ہر چند اختر نے کبھی اور کسی مقام پر اپنے تفکر کو جذبات کا محکوم نہیں ہونے دیا جس کی غالباً یہ وجہ تھی کہ وہ ایک باغ و بہار طبیعت لے کر دنیا میں آئے تھے۔ انہوں نے دنیا کے مصائب کو بھی ہنسی خوشی جھیل ڈالا لیکن حساس دل اور حقیقت پسند دماغ تلخ حقائق سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا یہی وجہ ہے کہ غمگین دل رکھتے ہوئے بھی ان کا چہرہ بشاش

ہی رہا اور اسی بشاشت چہرے کی تابانی ان کے کلام پر پوری طاقت کے ساتھ ہر موقع اور ہر منزل میں جلوہ افگن ہے، حالات دنیا، طبقاتی امتیازات اور بے مہری احباب کے تذکرے وہ اس طرح کرتے ہیں:-

اک ہنستا بے نیازِ کاوشِ بود و نبود ... ایک سہمے اور فکرِ عافیت میں غرق ہے
پوچھنے والے یہ دونوں میں کسی سے پوچھ لیں ... بزدلی اور آتمک شکتی میں کتنا فرق ہے

کہیں افراطِ مے ہے چہرہ افروز ... کہیں خونِ جگر باقی نہیں .... ہے
مجالِ دم زدن کس کو ہے یارب ... مگر یہ شانِ رزاقی نہیں ... ہے

رمز آشنا ملے کئی اہلِ نظر ملے ... پھر بھی یہ جستجو رہی کوئی بشر ملے

جنھیں سنکر ضمیرِ حضرتِ یزداں لرز جائے ... کتابِ زندگی میں ایسے افسانے بھی آتے ہیں
کسی کے حسنِ عالم تاب کی تنویر کے صدقے ... کسی بدبخت کی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

ہمیں بھی آ پڑا ہے دوستوں سے کام کچھ یعنی ... ہمارے دوستوں کے بیوفا ہونے کا وقت آیا
نوید سربلندی کی منجم نے تو ہیں سمجھا ... سگانِ دہر کے آگے دوتا ہونے کا وقت آیا

دنیا کی بیوفائی، دوستوں کی بے مہری اور اپنی زبوں حالی سے پوری طرح متاثر اور مغموم ہوتے ہوئے ان کا ایمان و ایقان یہ ہے کہ دنیا وجود حقیقی کی جلوہ گاہ ہے، کارسازِ عالم جس طرح چلاتا ہے دنیا چلتی رہتی ہے۔ بندہ ایک مخلوقِ مجبور ہے اور خدا قادرِ مطلق ہے۔ ہری چند اختر کے تمام پسندیدہ موضوعات پر اسی بے کسی، بے بسی، اور مجبوری کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ اسی لئے وہ اپنے مخصوص انداز میں خلاقِ عالم سے برابر یہ شکایت کرتے رہے کہ ہم کو مجبور پیدا کر کے ہم سے ہمارے گناہوں کا محاسبہ کیوں

ہوتا ہے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ بندہ صرف رحم و کرم کا مستحق ہے اسی لئے بارگاہِ احدیت میں وہ صاف گو اور منزل مغفرت میں گستاخ طلب ہیں ہمارے اردو شعرا نے خاص ایرانی اور دوسرے فارسی شعرا سے رنگ تصوف اکتساب کیا تھا۔ انہیں شعرا میں میر تقی میر کے ایسے حقیقی صوفی بھی تھے اور دوسرے رسمی صوفی بھی تصوف کی چاشنی بہر حال ہر کلاسیکل شاعر کے کلام میں ہے کہیں اصلیت کی چاشنی ہے تو کہیں نقل کی بو باس۔ کسی کے یہاں حلاوت تیز ہے اور کہیں کم یہ اختلاف انفرادی مذاقِ تصوف کا نتیجہ ہے اور کہیں انفرادی عقیدہ کو بھی دخل ہے۔ تصوف کے جس مضمون کو ایک صوفی شاعر جس انتہائی آسانی اور موثر انداز میں کہہ جاتا ہے دوسرے غیر صوفی شاعر کے کلام میں نہ اتنا زور ہوتا ہے اور نہ ویسا مزہ۔ ہم ی چند اختر کی درویشانہ زندگی ان کے صوفی مشرب ہونے کی طرف ضرور نشاندہی کرتی ہے لیکن وہ اگر صوفی نہ رہے ہوں تب بھی ان کے ایسے موضوعات سے متعلق اشعار ہم کو متاثر کرتے ہیں اور ہم ان کی حلاوت، معنویت اور چاشنی سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور ہمارا یہ کہنے کو دل چاہتا ہے کہ تصوف کی اعلیٰ ترین منزل نہ سہی تب بھی اختر اس وادی کے بادیہ پیما ضرور تھے۔ وہ اس منزل کی جستجو میں برابر منہمک رہے ورنہ ان کے کلام میں اتنا اثر اور خلوص ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس موضوع سے متعلق چند اشعار درج ذیل ہیں۔

پتا بھی اگر ہلتا ہے تو اس کی رضا سے — اور بندہ گنہگار ہے معلوم نہیں کیوں
صحیفے بھی پیمبر بھی ترے ابلیس بھی تیرا — الٰہی روزِ محشر امتحاں تیرا ہے یا میرا
علامت میرے عصیاں کی ہے بے شک داغِ پیشانی — مگر یہ داغِ دل یارب نشاں تیرا ہے یا میرا

دمادم شعبدے ہم کو دکھاتا ہے کوئی جلوہ — کہیں شیخِ حرم ہو کر کہیں پیرِ مغاں ہو کر
خودی کی ابتدا یہ تھی کہ اپنے آپ میں گم تھا — خودی کی انتہا یہ ہے خدا کو یاد کرتا ہوں
بتوں کے عشق میں کھویا گیا ہوں وائے اختر — خدا شاہد ہے میں اکثر خدا کو یاد کرتا ہوں
حسن کی ہیبت تو سب مجھ پر حقیقت کھول دی — اور پھر خاموش رہنے کا اشارا کر دیا

بندہ کو بندہ مجبور تسلیم کر لینے کے بعد سزا و جزا کا معاملہ یقیناً غور طلب ہے اسی لئے بعض وقت شاعر گستاخ ہو جاتا ہے۔ اختر کے مزاج میں طنز و مزاح کی بھی بھرپور صلاحیت تھی بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس مخصوص لب و لہجہ میں ان کا جواب کہیں نہیں ملتا۔ اُن کی اس صلاحیت کا انتہائی دلکش انداز ان کے اس طنز میں ملتا ہے جو وہ اپنے پیدا کرنے اور پالنے والے سے تخاطب میں استعمال کرتے ہیں حقیقت امر تو یہ ہے کہ ان کا یہی رنگ اور ان کا یہی اسلوب سخن ان کو دوسرے اردو شعراء سے علیحدہ کر کے انھیں ایک ایسے بلند مرتبہ پر پہنچا دیتا ہے جس کو ہم انہیں کی انفرادیت سے تعبیر کر سکتے ہیں یہ رنگ مومن کے کلام میں بھی موجود ہے لیکن صرف ان کے مقطعوں میں جہاں انہوں نے اپنے تخلص کا بے حد شوخی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ بعض دوسرے اساتذہ نے بھی اس رنگ میں کچھ چیدہ چیدہ اشعار کہے ہیں لیکن ہری چند اختر کے یہاں ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے اس رنگ کے قریب قریب ہر شعر میں وہ کیفیت و لذت ہے جو ہم کو زبردستی ان کے کلام کی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے بے حد مصائب و آلام میں زندگی کے دن کاٹے تھے۔ ان حالات میں اور اس کے علاوہ اپنے کو مجبور، خالق کو کریم و رحیم مانتے ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ پیدا کرنے والی کی دل میں محبت رکھتے ہوئے ان کی زبان سے اس قسم کی شوخ گفتگو کچھ مناسب حال ہی تھے۔ ان کے ایسے اشعار میں بھی شوخی و رنگینی کے ساتھ برجستگی ہے اور بھرپور خلوص بھی ہے۔ ان تمام خصوصیات و کیفیات کا ایک حسین امتزاج ان کے ایسے اشعار کو ایک اہم امتیازی شان کا حامل بنا دیتا ہے ملاحظہ ہو

اے خدا! میرے خدا! تجھ کو خدا سمجھا تھا میں　　تو مرے اعمال کا پابند نکلا حشر میں

زندگی بیشک ترا انعام ہے یارب مگر　　سن سکے تو کچھ ترے انعام کی باتیں کروں

خدائے دو جہاں جب آنجہانی ہو کے رہ جائے　　کسی کو پھر خدائے این جہاں کہنا ہی پڑتا ہے

عجب کیا تھا جو میں روز ازل ایمان لایا تھا　　عجب یہ ہے کہ اب تک بھی مرا ایمان باقی ہے
نمودِ خیر و شر کا یہ نتیجہ کس نے سوچا تھا　　خدا مفرور، آدم جاں بلب، شیطان باقی ہے

ملے گی شیخ کو جنت مجھے دوزخ عطا ہوگا　　بس اتنی بات ہے جس کے لئے محشر بپا ہوگا

قنوطیت ہو یا رجائیت دونوں کیفیات کو شاعری میں یکساں طور پر اہمیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ طنز و مزاح اور شوخی و طراری بھی پسندیدہ اسلوب ہیں بشرطیکہ اعتدال اور ادب کے دائرے ہیں محدود ہوں۔ اختر کے کلام میں طنز اور شوخی پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے۔ وہ بارگاہ احدیت میں بھی گستاخ ہیں اور بندوں سے بھی طنز و مزاح میں بات کر لیتے ہیں۔ لیکن ان کا کلام اس لئے نا مطبوع نہیں ہے کہ وہ ایک دکھ بھرے دل کی آواز ہے جو خلوص میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ان کے یہاں نہ زاہدانہ خشکی ہے اور نہ سیاسی چال بازی ہے وہ ہر موضوع پر ہنس مکھ رہتے ہوئے بات کرتے ہیں اور صاف صاف بات کرتے ہیں۔ مذہب گزیدگی اور عصبیت سے ان کا دامن خیال پاک و صاف ہے انسانی برادری کے قایل ہیں اور برہمن ہوتے ہوئے بھی شیخ و پنڈت کے جھگڑوں سے اس حد تک دور ہیں کہ "خدا" اور "پرماتما" کے لفظی اختلاف کا بھی مذاق اڑاتے ہیں۔ ان کا ایسا طنز و مزاح والا کلام بھی ناصحانہ اور بصیرت افروز ہے جو ہم کو قومی یکجہتی کا درس دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

شیخ و پنڈت دھرم اور اسلام کی باتیں کریں　　کچھ خدا کے قہر کچھ انعام کی باتیں کریں
یہ سنائیں پاک نغمے اولیں الہام کے　　وہ خدا کے آخری پیغام کی باتیں کریں
ہم کھڑے سنتے رہیں اور دل میں یہ کہتے رہیں　　اب یہ رخصت ہوں تو ہم کچھ کام کی باتیں کریں

پھر دسا کس قدر ہے مجھکو اختر اس کی رحمت پر　　اگر وہ شیخ صاحب کا خدا نکلا تو کیا ہوگا

فریب حضرت آدم کو دے گیا ابلیس — قریب ہی تھا خدا بھی، خدا سے کچھ نہ ہوا

خدا تو خیر مسلماں تھا اُس سے کیا شکوہ — مرے لئے مرے پرماتما سے کچھ نہ ہوا

وہی عالی مرتبت شاعر جو بارگاہ صمدیت میں ایسی گستاخانہ جسارت سے کام لیتا ہے جو "خدا" اور "پرماتما" کی مفروضہ بے مائیگی پر طنز کرتا ہے۔ مقام عبدیت میں اللہ کے وجود کا قائل ہے، عبادت گزاری اس کا شعار ہے اور عبادت میں خلوص و بے ریائی شرط قرار دیتا ہے اپنے کو گنہگار جانتا اور اپنے گناہوں کو بخشوانے کے لئے رحمتِ خداوندی کی خواستگاری ہی نہیں اپنی افتادِ طبیعت کے تحت بخشش کا مطالبہ کرتا ہے وہ دستِ دعا بلند کرنے میں عاجزی کا قائل نہیں بلکہ عرضِ مدعا میں جرأتِ گستاخ رکھتا ہے۔ وہ اللہ اللہ کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ خدا کی رحمت پر بھروسا کرم خدا ہی نے گناہوں پہ ناز کرنا بھی سکھایا ہے۔ یہ عقائد ایک حد تک تصوف سے بہت قریب ہیں ہر چند کہ اختر کے یہاں خدا پرستی میں وجدان بھی کارفرما ہے لیکن اس کے علاوہ اُن کے کلام میں تصوف کے ٹھوس مسائل کچھ نہ کچھ ضرور اثر انداز ہوئے ہیں۔ خالق و مخلوق کا تصور اور عبدیت کے رشتہ میں استواری پوری طرح جلوہ فرما ہے اور وہ اسی راستہ پر گامزن ہو کر اس منزل تک کامیابی کے ساتھ پہنچ جاتے ہیں جس کے لئے دوسرے شاعروں نے تصوف کی شاہراہیں اختیار کی تھیں مثال کے طور پر چند اشعار درج ذیل ہیں

دنیا سے کچھ فیض نہ تھا، دنیا کو تج بیٹھا ہوں — اللہ سے امیدیں ہیں اللہ اللہ کرتا ہوں

جو ٹھوکر ہی نہیں کھاتے وہ سب کچھ ہیں مگر واعظ — وہ جن کو دستِ رحمت خود سنبھالے اور ہوتے ہیں

خود حسن نے مجھے ناز گناہوں پہ سکھایا — یا رب یہی رحمت کی نظر ڈھونڈ رہا ہوں

مرے دستِ طلب کو جرأتِ گستاخ دے یا رب — یہاں دستِ دعا کی عاجزی سے کچھ نہیں ہوتا

انکارِ سجدہ ہے یاں کس رو سیاہ کو — شایانِ سجدہ بھی تو مگر کوئی در ملے

ایک قطعہ بھی ملاحظہ ہو:-

عبادت از پے انعام ..... زاہد — ہوس کاری ہے مشتاقی نہیں ہے
کہ تیرا امر کر سعی د..... تمنا — شراب و جام ہے ساقی نہیں ہے

کسی شاعر کے ہنر کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس کا ایک ضخیم کلیات ہمارے پیشِ نظر ہو کسی شاعر کی صلاحیت اور فنکاری کو جانچنے کے لئے کبھی کبھی ایک شعر بھی کافی ہوتا ہے۔ ہری چند اختر کے مختصر انتخابِ کلام میں "دوستی" کے معیار سے متعلق ایسا ہی جامع ایک شعر ایسا ملتا ہے جو اپنے دامنِ خیال میں بلا کی وسعتیں سمیٹے ہے موجودہ دور میں دوستی کی تشریح کہاں سے بہتر ناممکن ہے۔

جہانِ دوستی اک جنتِ ایثار ہوتا ہے — وہاں بھی کاہشِ سود و زیاں کی بات آئی بھی

اسی ایک شعر سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی نظر میں دوستداری کا معیار کیا تھا: جس پر وہ خود کاربند تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے دل کو کیا کیا دکھ اٹھانا پڑے اس کا اندازہ دوسرے مصرع کے طرزِ ادا سے کیجئے اور سر دھنئے۔ اسی طرح ایک عالی ہمت اور توکل پرست انسان کے کردار کی تصویر اس سے بہتر طریقہ پر پیش کرنا محال نہیں تو دشوار ضرور ہے جس کی عکاسی یہ شعر کرتا ہے

داتا ہے بڑا رزاق مرا، بھرپور خزانے ہیں اس کے — یہ سچ ہے مگر اے دستِ عام ہر روز تقاضا کون کرے

ہری چند اختر بیحد متواضع اور دریا دل انسان تھے۔ غالباً ان کی اسی افتادِ طبیعت کی بدولت ان کی زندگی کبھی پرسکون نہیں بن سکی، ہمیشہ عسرت و تنگدستی میں مبتلا رہے۔ وہ اپنی قلیل آمدنی بھی اپنی سخت سے سخت ضرورتوں کو نظر انداز کر کے اپنے ضرورت مند دوستوں کی نذر کر دیا کرتے تھے۔ اپنے دوستوں کی مدد کرنے کا فریضہ کبھی کبھی قرض لیکر بھی انجام دیتے تھے۔ ان حالات میں وہ بھی خوش نہیں رہ سکے لیکن انہوں نے ناخوشہائے دنیا دنی کو بھی چارہ پیشانی سے انگیز کیا۔ ان کے ماتھے پر کبھی کسی نے شکن نہیں دیکھی اور نہ ان کی زبان سے کبھی کسی نے کوئی کلمۂ شکایت کا سنا لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ.....

ان کا دل فرد در رنجور رہا کرتا ہوگا۔ چنانچہ اپنی اسی کیفیت کو انہوں نے اپنے مخصوص طرز میں نظم بھی کیا ہے۔ کہنا پڑتا ہے کہ یہ شعر صرف ہری چند اختر کہہ سکتے تھے کیونکہ جو کچھ کہا گیا ہے وہی ان کے حرماں نصیب دل کی آواز تھی۔ جن حالات میں انہوں نے زندگی کے دن گزارے اُن کی صحیح ترجمانی اس شعر کے علاوہ اور کسی دوسرے طرز میں ممکن نہیں اور اگر ممکن ہو جائے تب بھی وہ اثر پیدا نہیں ہو سکتا جو اس شعر میں ہے ؎

مرے چمن کی خزاں مطمئن رہے کہ یہاں　　خدا کے فضل سے اندیشۂ بہار نہیں

مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ متذکرہ بالا تین اشعار ہی ہری چند اختر کو اردو شعراء کی صف اول میں جگہ دلوانے کے لئے کافی ہیں۔

بیدل دہلوی

پنڈت کیلاس ناتھ کول بیدل مرحوم سے ملاقات کی عزت مجھے کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ لیکن پھر بھی میرے اور ان کے درمیان کئی خصوصیات مشترک تھیں۔ اول تو وہ ہم پیشہ تھے۔ وہ مظفر نگر میں وکیل تھے اور میں لکھنؤ میں وکالت کرتا تھا دوسرے یہ کہ میرے بعض مخلص ترین دوست بجانسٹھ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے۔ اس طرح مجھے بھی مظفر نگر سے قلبی لگاؤ تھا۔ لیکن جو تیسری نسبت مجھے ان سے حاصل ہوئی وہ ان کے کلام کے ساتھ میری گرویدگی ہے حقیقت امر تو یہ ہے کہ میں نے ان کو انھیں کے کلام میں دیکھا اور اسی وسیلے سے جانا اور پہچانا۔ ان کے کلام کا مطالعہ ان کی شخصیت کے تمام جوہر ہماری بصیرت کے آگے روشن کر دیتا ہے " تصورات بیدل" کے نام سے ان کے کلام کا انتخاب ہمارے پاس ہے اور یہی انتخاب ان کی شاعری کی چالیس سالہ زندگی کا مرقع ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ رنگ قدیم میں جدیدیت کی جھلک اور جدیدیت میں قدیم کا حسن ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے ان دونوں کا حسین امتزاج ان کے اشعار میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ان کو خود بھی اس کا احساس تھا فرماتے ہیں۔

ہو رنگِ قدیم میں بھی جدت کی جھلک یعنی پیری میں بھی جوانی ... دیکھیں

یہ شعر ایک رباعی کے تیسرے اور چوتھے مصرعے پر مشتمل ہے۔ یہ رباعی غالباً آخر عمر میں لکھی تھی جب رنگِ سخن پوری طرح مستحکم ہو چکا تھا لیکن اس کے باوصف ان کے دل میں جدیدیت کی طرف اور زیادہ راغب ہونے کی تمنا تھی یعنی یہ کہ ان کے ذہن و فکر میں لکیر کا فقیر بنے رہنے کا کوئی جذبہ نہیں تھا وہ قدیم سے ہمہ گیری، بلندئ تخیل، حسن ادا اور جدیدیت سے رعنائی فکر اور

برنائی بیان اخذ کرنے کے قائل تھے۔ اس مقام پر صرف ایک قطعہ مثالاً پیش کر دینا کافی ہوگا۔

کبھی
ان گوکل کا بھی نغموں سے دل شاد کیا | اور کبھی طور پہ موسیٰ سے کچھ ارشاد کیا
تم اسی رنگ میں پھر اس کو نظر آتے ہو | جس نے جس رنگ عقیدت سے تمہیں یاد کیا

انھیں قوافی اور ردیف میں ان کی ایک غزل بھی تصورات بیدل " میں موجود ہے یاد ش بخیر اسی زمانے میں اور اسی طرح میں ہمارے شہر لکھنؤ میں بھی جب ایک گراں قدر مشاعرہ پنڈت برج نرائن چکبست نے پنڈت جگت نرائن ملا کے دولتکدے واقع محلہ گولہ گنج میں منعقد کیا تھا جس میں تمام مشاہیر نے شرکت کی تھی اور پوری طاقت کے ساتھ ہر ایک نے طبع آزمائی کر کے اپنی اپنی غزلیں پڑھی تھیں۔ راقم آثم کو بھی اس مشاعرے میں شرکت کرنے اور اپنی غزل پڑھنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس میں جوش ملیح آبادی کی غزل نے مشاعرہ لوٹ لیا تھا جس کا مطلع یہ تھا ؎

سوز غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا | جا تجھے کشمکش زیست سے آزاد کیا

بیدل دہلوی کی غزل دیکھ کر وہ مشاعرہ بے ساختہ یاد آگیا اور دل تڑپ اٹھا کہ کاش وہ بھی اس مشاعرے میں موجود ہوتے اور ہم ان کی غزل خود انھیں کی زبانی سنتے بہر حال اس مقام پر ان کا مطلع اور دو اشعار درج ذیل ہیں۔

تو حیرت کدۂ عالم ایجاد کیا | مجھ کو بے پردگیٔ حسن نے برباد کیا
میرا ممنون ہوئے خانۂ زنجیر جنوں | خود کو برباد کیا اور تجھے آباد کیا
بن گئے دشت وجبل باغ وطن کی تصویر | جب مسافر نے کبھی راہ میں گھر یاد کیا

"بے پردگیٔ حسن" اور "خانۂ زنجیر جنوں" کی ترکیبیں ہی لطف آفریں نہیں ہیں ان کی معنویت اور گہرائی بھی اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ تیسرے شعر میں دشت وجبل کی بادیہ پیمائی کے دوران گھر کا یاد آجانا فطری جذبات کا حامل ہے لیکن طرز ادا اور انداز بیان ایک دکھی مسافر کی داستان غربت کا ایک درد انگیز مرثیہ ہے جو دلوں کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا دشت وجبل میں صحرا

نوردی کے وقت وطن کی یاد گھر کی تباہی کو بھی باغ و بہار بنا کر پیش کرتی ہے۔ اس منظر کا تصور
ہی کتنا بے حد دردناک ہے۔

یہ سچ ہے کہ دورِ حاضر کے تقاضے ان قدروں سے بہت مختلف ہیں جو نصف صدی قبل
رائج تھیں، تاہم انسان اپنے خیالات و رجحانات میں اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔ زمانہ جتنی
کروٹیں چاہے بدل ڈالے لیکن انسانیت، شرافت، نیکی اور تقدس اب بھی پوری طرح عظمت
و احترام کے مستحق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان جوہروں کی جہاں بھی چمک دمک مل جاتی ہے ہم متاثر
ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور اگر خیالات میں بلندی، گہرائی اور ہمہ گیری ہو، الفاظ میں موزونیت
اور برنائی ہو اور ساتھ ہی ساتھ طرزِ ادا میں توانائی بھی ہو تو ایسے شاعر کو ہم فنی حیثیت سے
صفِ اول میں جگہ دینے کے لیے مجبور ہیں۔ بیدل کا کلام ان تمام خوبیوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس کا
مطالعہ ہر سنجیدہ قاری کی روح کو گرمائے بغیر نہیں رہ سکتا بالخصوص اُن مقامات پر جہاں
انہوں نے زندگی اور زندگی کی قدروں کا جائزہ لیا ہے۔ یا جہاں انھوں نے انسان کی بلند
خصلتوں کو اپنی چشمِ بصیرت سے پرکھ کر پیش کیا ہے۔ ایک مختصر مضمون میں اشعار کی بہتات
کے ساتھ مثالیں پیش کرنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا اس لئے صرف چند اشعار درج ذیل ہیں۔

شکستہ بادباں، طوفاں بپا، گرداب میں کشتی — نہ دھوکے دے مجھے تو اے تمنا قربِ ساحل کے
عشق کیا ہے، وہ بادۂ صافی — حسن جس کا سرور ہوتا ہے
برقِ یقیں جو چمکی تو اے ذوقِ بیخودی — ہم نے قبائے ہوش و خرد تار تار کی
حسن پروانے میں ہے شمعِ شبستاں میں نہیں — عشق کی آنکھ میں ہے جلوۂ عریاں میں نہیں
مجھ کو سکوں نہ مل سکا غمکدۂ حیات میں — اور یہ جانتے ہوئے اس کی کوئی کمی نہیں
گلشنِ دہر میں وہ طائرِ پر بستہ ... ہوں — قید خانے میں نہیں قید سے آزاد نہیں
فنا آمادہ ہر نقش و نگارِ بزمِ امکاں تھا — تعجب ہے کہ یاد دنیا پہ ہستی کا گماں پھر بھی

ان اشعار میں فکر و خیال کی بہترین مثالیں ہیں کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم حقیقت

ہیں نے جو کچھ دیکھا اس کو بہترین اسلوب سخن کے ساتھ پیش کردیا۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی حساس قاری ان اشعار سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حسن وعشق کی واردا تیں سادہ سادہ بیان کردینا یا زندگی کی تلخیوں کو صاف صاف پیش کردینا سہل ہے لیکن حسن وعشق کو ان کے اصل رنگ روپ میں مناسب اور موثر الفاظ کا جامہ پہنانا یا حیاتِ ناپائیدار کی تلخیوں میں لذت کی چاشنی پیدا کرنا دشوار کام ہے۔ انھیں وادیوں سے جو فنکار کامیابی کے ساتھ گزر جائے اسی کو ہم حقیقی اور دقیقہ سنج شاعر کہیں گے۔ بیدل کے یہاں قنوطیت کے مواقع پر بھی زندہ رہنے اور زندگی کو خوشگوار بنانے کی خواہش ہے وہ قید سے آزاد نہ ہونے کو بھی یہی سمجھتے ہیں کہ "قید خانے میں نہیں" اور یہ جانتے ہیں کہ "بادبان شکستہ" "طوفان بپا" اور "گرداب میں کشتی ہونے کے بعد بھی" "تمنا" ان کو قرب ساحل کے دھوکے نہیں دے سکتی وہ جذبات کا احترام کرتے ہوئے بھی تفکر وتعقل کی منزل میں سکون حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

بیدل کی غزلیات کا سرسری مطالعہ بھی واضح کردیتا ہے کہ ان کے کلام میں بے ثباتی دنیا کے پرکیف تذکرے، حسن وعشق کی بلند پایہ داستانیں، زندگی اور ماجرائے زندگی کی حلاوتیں اور تلخیاں، غم کے نوحے اور شادی کے نغمے ہیں لیکن یہ سب کچھ اتنے حسن اعتدال کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں کہ ہمارے خوابیدہ احساسات متحرک ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود ایک ٹھہری ہوئی طبیعت کے حامل اور فطرتاً اعتدال پسند تھے اور یہ خصوصیت ان کے کردار سے کبھی جدا نہیں ہوسکی۔ انگریزی تعلیم سے پوری طرح اثر قبول کیا لیکن اس طرح نہیں کہ اسلاف سے گنجینۂ معنی کا جو طلسم ان کو ورثے میں ملا تھا، اسے کم حقیقت سمجھ کر خیرباد کہہ دیتے جدیدیت سے بھی بہ قدر ذوق لطف اندوز ہوئے اور مذاق سلیم کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ خیالات ومطالب کی فراوانی میں بھی الفاظ کے انتخاب اور اضافتوں کے استعمال پر کڑی نظر رکھتے تھے خرد کی ذہنوں کی یا جنوں کی کارفرمائی ہر مقام پر متناسب اور متوازن انداز بیان ملحوظ رہتا ہے اور یہی شاعری کا طرہ امتیاز ہے۔ یہ مقصد پیش نظر نہ ہو تو ایک ادیب ناظم گو ہو سکتا ہے لیکن اچھا شاعر کہلانے کا حق دار نہ ہوگا۔ بیدل کو اس فن میں اتنا کمال حاصل تھا کہ کبھی کبھی وہ

حقیقت منتظر اور صداقت جمال کے پرواز وار مقرب نظر آتے ہیں اور جو کچھ ان کے دل پر گزرتی ہے اسی کیفیت کو اس صفائی اور بے ساختگی اور برجستگی سے کہہ جاتے ہیں کہ سننے والا مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس قبیل کے اشعار ان کے کلام میں فراوانی کے ساتھ ملتے ہیں مثالاً چند درج ذیل ہیں جو فن شعر کے ہر جوہری کو مالامال کر دیں گے۔

وہ ارماں اور حسرت دل میں کہاں ٹھہرتے — ویرانیوں سے ایسا برباد ہو گیا تھا

تیری غفلت شعاریوں کی قسم — بھولتا ہی نہیں عتاب ترا

عشق کی ابتدا دل بیدل! — حسن کی ابتدا شباب ترا

محبت کے سمندر کو بنا دے بے کنارا اے دل — ہو ساحل تو پھر طوفان بھی طوفاں نہیں ہوتا

چلتے رہے ہیں اپنے مقدر کے ساتھ ساتھ — بیگانہ ہو چکے ہیں سزا و جزا سے ہم

دل میں آتا ہے جب اُن مست نگاہوں کا خیال — محو ہو جاتا ہے عالم مرے پیمانے میں

دیوانگی کا قصہ دیوانے کی زبانی! — کچھ کہہ گیا یہاں سے کچھ کہہ گیا وہاں سے

کہاں سجدے کی ہمت ہر کسی کے آستانے پر — گنہ جب یاد آتے ہیں جھکا لیتا ہوں گردن کو

خبر کچھ قافلے کی ہے نہ کچھ پروا ہے منزل کی — خدا جانے کہاں لے جائیں گی بیتابیاں دل کی

اردو شاعری نے اپنا رنگ و روپ، ناک نقشہ اور سارا نکھار فارسی شاعری سے حاصل کیا ہے بکثرت موضوعات، تشبیہیں، استعارے، اضافتیں یہاں تک کہ اسلوب سخن بھی اردو والوں نے فارسی سے لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رنگ تصوف بھی اردو شاعری میں بہتات کے ساتھ موجود ہے۔ خواجہ میر درد اور میر تقی میر صوفیائے کرام میں سے تھے اس لئے انہوں نے اپنے طرز فکر و بیان میں اس رنگ کو اور چوکھا کر دیا دوسرے شعرا کے یہاں بھی تصوف کے شاہکار موجود ہیں لیکن کہنا پڑتا ہے کہ ان میں روایت زیادہ ہے اور انفرادیت کم ہے۔ یہ انفرادیت آخری دور کے شعرا میں بیدل کے یہاں ملتی ہے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ ویدانتی فلسفے سے بھی بخوبی آگاہ تھے اور اس سے متاثر بھی تھے۔ ایرانی رنگ تصوف کے ساتھ ویدانتی طرز فکر کی آمیزش بیدل کی شاعری میں سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔ ان

کے یہاں تخلیق عالم، تخلیق آدم، غایت خلقت انسان، دنیا میں آدمی کی حیثیت، حسن حقیقی کی جلوہ فروزی بصیرت کی کارفرمائی، عبد ومعبود میں واسطہ ان تمام حالات ومعاملات کی وضاحت اور ترجمانی اسی انداز میں ہے جو حقیقی صوفی شعرا کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ انھوں نے بھی قید تعینات کے طلسم کدے میں حسن حقیقی کا مشاہدہ کرنے کی تلاش کی ہے۔ اس ناپائیدار ہستی کو سیمیائے ایزدی قرار دیتے ہوئے اپنے قطرۂ وجود کو بحر ناپیدا کنار سے ہم کنار ہونے کی تمنا کی ہے اپنی اسی تلاش تجسس اور تمنا میں انھوں نے تصور کے مدارج طے کیے ہیں، دیدۂ بصیرت سے مشاہدہ کی کوشش کی ہے اور اپنے دل کی اس تڑپ کو جو صوفیائے کرام کی شان ہے بڑی حد تک آسودگی فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔

کہنا پڑتا ہے کہ بیدل نے تصوف کے مدارج کامیابی کے ساتھ طے کیے تھے ورنہ ان کے دردمند دل میں وہ گداز اور زبان میں وہ بے ساختگی نہ ہوتی جو ان کے اشعار میں نمایاں ہے ان کا یہ طرز بیان رسمی ہوتا تو ان کے الفاظ میں وہ چبھن نہ ہوتی جس کو قاری اچھی طرح محسوس کرسکتا ہے چند اشعار مثالاً درج ذیل ہیں۔

نغمۂ کن نے چھیڑا راگ خلق دہر کا
انس آیا وجد میں اور شکل انساں ہو گیا

پہلے سب بے کیف تھا گو تھی فضا معمور حسن
عشق جب پیدا ہوا تو زینت محفل ہو گئی

تنگ تھی وحشی کو تیرے وسعت وہم و خیال
گو ابھی وہ معرفت کی اولیں منزل میں تھا

حسن تیرا ہے تو ہر اک سنگ میں ہے جلوہ فروز
چاہیے دیکھنے والا کوئی فرہاد نہیں

موت سمجھے اے افسوس یہ دنیا والے
روح کو قید علائق سے جو آزاد کیا

زندگی کو قید سمجھا موت کو سمجھا حیات
تیرے دیوانے کو اب مرنا بھی مشکل ہو گیا

مجھ سے چھپنا چھپنے والے کا خیال خام تھا
میری بینائی کی وسعت کا تصور نام تھا

ہوتا جاتا ہے اور دل سے قریب تر
جتنا آنکھوں سے دور ہوتا ہے

یہ اشعار صرف مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ بیدل کے مطبوعہ انتخاب میں بکثرت ایسے اشعار موجود ہیں جن میں وحدت واجب الوجود الوہیت، عبدیت، اور تصوف سے متعلق مراحل کے انتہائی لطیف

مضامین نظم کیے گئے ہیں جو ان کو عرفان کے اعلا مدارج تک پہنچا دیتے ہیں۔

بیدلؔ اس دارِ فانی میں زندگی بسر کرنے کے لئے محبت کا پیغام لے کر آئے تھے۔ یہ پیغام ان کے روحانی مشن اور مادی طرزِ زندگی دونوں کے لئے افضلیت کا درجہ رکھتا ہے۔ تصوف کے منازل میں یہی محبت عبد و معبود کے مابین رابطہ ہے اور اس مادی دنیا میں بنی نوع انسان کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کا وسیلہ ہے یہی وجہ ہے کہ ہر رفارمر، ہر ہادی، ہر رہنما اور ہر منی رشی نے محبت کا درس دیا ہے۔ انسان پھر بھی اتنا گمراہ ہے کہ وہ "محبت" کو اب تک اپنا نہیں سکا۔ اگر ہم ایک دوسرے سے بلا تفریق مذہب و ملت اور بلا امتیاز رنگ و نسل محبت کرنے لگیں تو دنیا سے ہر قسم کے گناہ کا بڑی حد تک خاتمہ ہو سکتا ہے اور ہماری زندگی امن و آسودگی سے ہم کنار ہو سکتی ہے اسی لئے ضرورت ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں کچھ ایسے مصلح پیدا ہوتے رہیں جو خدا کے بندوں کو شد و مد کے ساتھ محبت کا درس دیتے رہیں، چنانچہ ایسا برابر ہوتا رہا ہے۔ بظاہر یہ پیش پا افتادہ سبق ہر ادیب اور ہر شاعر دہراتا ہے البتہ طرزِ بیان میں فرق ہوتا رہا ہے اور یہ فرق اب بھی پایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جو بات دل سے نکلتی ہے اور خلوص سے کہی جاتی ہے وہ دل میں اتر جاتی ہے۔ بیدلؔ کے ہم عصر دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی منقصت کسی طرح بھی نہیں ہوگی۔ اگر یہ کہا جائے کہ بیدلؔ کے کلام میں بہت اثر ہے۔ اس اثر کو ہر قاری محسوس کر سکتا ہے بشرطیکہ پہلو میں ایک گداز دل ہو۔ انھوں نے تڑپ کر مذہب کی ظاہری تفریق کو مٹانے کی کوشش کی ہے اور وحدت کا سبق دیا ہے۔ وحدت کے تخیل میں الوہیت کے ساتھ ہی نوع انسان کی واحد برادری کا تصور بھی شامل رکھا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

تھا وہیں کعبہ، وہیں مسجد، وہیں بتخانہ تھا	بندگی کے جوش میں میں نے جہاں سجدہ کیا
حدود سے دین کے باہر محبت کا شوالہ ہے	پرستارِ محبت تابعِ زنداں نہیں رہتا
رام اور رحیم کو تو مسلم مانتے ہیں واحد	جھگڑا ہے خوب لیکن ناقوس کا اذاں سے
اندھیرے کو چھپا لیتا ہے جیسے نور کا دامن	محبت میں چھپا لیتا ہوں میں تحقیرِ دشمن کو

دیر ہندو کے لئے کعبہ مسلماں کیلئے — اُور دونوں باہم چلیں جس جا صلائے عام ہے

انھیں اشعار میں درس عرفاں بھی ہے اور درس حیات و آدمیت بھی، مشیت کے آگے سر بسجود بھی ہیں اور انسان کا بول بالا کر رہے ہیں۔

صوفیائے متقدمین کی مقدس شاہراہوں پر متوازن قدم بڑھاتے ہوئے اگر انہوں نے ناقوس و اذان کے جھگڑوں کو کم حقیقت قرار دیا ہے تو دوسری طرف آبائی ہندو دھرم کا پابند ہو کر دیگر مذاہب کی برگزیدہ شخصیتوں کا احترام بھی کیا ہے۔ انہوں نے کعبہ و بتخانہ میں امتیاز نہیں کیا ناقوس و اذان میں ایک ہی آواز سنی اور وجودِ حقیقی کا جلوہ ہر جگہ یکساں طور پر دیکھا۔ ان کے کلام میں بھجن بھی ہیں، شری کرشن بھگوان کی شان میں ترانہ بھی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام کو بھی خراج عقیدت پیش کیا ہے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کربلا میں ایک عظیم قربانی پیش کرنے والے ہیرو سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ اس کا بہت احترام کرتے تھے "تصورات بیدلؔ" میں ایک ترجیع بند "یادگار حسینی" کے عنوان سے موجود ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ کربلا کی جس زمانے میں سیزدہ سالہ یادگار منائی گئی تھی، اسی موقع پر یہ نظم بھی کہی گئی تھی۔ کیوں کہ پہلا ہی شعر یہ ہے

آج گلشن کی خوشی میں رنج کا عالم بھی ہے — چشم نرگس وا تو ہے لیکن ذرا پرنم بھی ہے

یہ ترجیع بند پانچ بندوں پر مشتمل ہے جو انھوں نے محسوس کر کے لکھے تھے۔ مثالاً دو بند پیش کئے جاتے ہیں۔

آج ہم افسانہ مہر و وفا کہنے کو ... ہیں — ایک خونیں واقعے کا ماجرا کہنے کو ہیں
حالِ مسکینی و تسلیم و رضا کہنے کو ہیں — ضبط اور پھر ضبط کی بھی انتہا کہنے کو ہیں
جہد آزادی کا اک قصہ نیا کہنے کو ہیں — خود کو کھو کر بے خودی کا مدعا کہنے کو ہیں
پیاس سے مرجاتے ہیں قومی حمیت کیلئے — سر کٹا دیتے ہیں عزت اور عظمت کے لئے

آدمیت بھولنا کیا مذہبی فرمان ... ہے
جسم مذہب ہے تو جبّ قوم اسکی جان ہے
دین کی رسمی ہدایت تو بہت آسان ہے
کبر و نخوت کو مٹانا آدمی کی شان ہے
ہند والے ایک ہو جائیں یہی ارمان ہے
حریت بیدلؔ ہمارا دین ہے ایمان ہے
دیکھئے تو غیر کو اپنا بناتے ہیں حسینؓ
کربلا میں پیاس دشمن کی بجھاتے ہیں حسینؓ

ایک مختصر نظم میں انسانیت، شرافت، صداقت اور حریت کا درس بھی ہے اور ہندوالوں کو متحد و متفق ہونے کی تلقین بھی ہے۔ امام حسینؓ کی قربانی کو سراہ کر ایسا سبق دینا یقیناً مناسب اور برمحل تھا۔ بالخصوص جب ہم یہ بھی یاد کرلیں کہ یہ نظم اس وقت کہی گئی تھی جب ہندوستان شدید ترین کرب میں مبتلا تھا، ہماری جنگِ آزادی اپنے شباب پر تھی اور انگریز انتہائی بے رحمانہ ظلم و تشدد کے پہاڑ ہم پر توڑ رہے تھے۔ یورپ میں دوسری جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ انسانوں پر بہیمیت کو شرما دینے والے مظالم ہو رہے تھے، اس وقت ہمارا سب سے بڑا فرض یہی تھا کہ ہم ایک جسم و جان ہو کر انگریزوں کا مقابلہ کریں اور اپنے ملک کو غلامی سے نجات دلائیں۔ بیدلؔ نے اس نظم میں روحانی اور مادی دونوں اقدار ملحوظ رکھے ہیں۔

متذکرۂ بالا نظم کے علاوہ "تصورات بیدلؔ" میں اور دوسری نظمیں بھی متعدد عنوانات کے تحت موجود ہیں جن میں بعض سیاسی نوعیت کی ہیں۔ لیکن بیدلؔ کی روح اور ان کے کردار کو پرکھنے اور سمجھنے کے لئے ان کی غزلیات ہی کا مطالعہ، غائر مطالعہ اور بار بار مطالعہ نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔

ان کے پیش نظر جو پیغام تھا وہ انہوں نے غزلوں ہی کے ذریعے ہم تک پہونچایا ہے اور اپنے کردار کو واضح کرنے کے لئے خود انہوں نے بھی اسی صنف کلام کو وسیلہ بنایا ہے۔ وہ ایک اچھے اور بلند پایہ شاعر ہی نہیں تھے بلکہ اعلا اخلاقی قدروں کے مالک بھی تھے۔ خوش حال اور مادی اعتبار سے فارغ البال ہونے ہوئے درویش صفت انسان تھے اور قناعت کوشی ان کے نفس کا یہ خیال جو ہر تھی۔ بستر مرگ پر اپنے ہونہار فرزندوں کو یاد کر کے ایک قطعہ کہا اور وہی لکھ کر بھیج دیا تھا۔

یہی دو اشعار ان کی شرافت نفس اور قناعت پرستی کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں فرماتے ہیں ؎

آئنا ہے تو آؤ پھر کھو کے نہ پاؤ گے.. ہمیں ہم چلے جائیں گے تب دیکھنے آؤ گے ہمیں!

فقر و فاقہ سے ہے پُر بیدل درویش کا گھر لے ہی جاؤ گے کچھ دے کے نہ جاؤ گے ہمیں

لیکن جب ان کے مایۂ ناز فرزند جناب پی۔ این۔ کول (آئی۔ اے۔ ایس) وہاں تک پہنچے تو ان کا طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر چکا تھا۔ بیدل کے اٹھ جانے کے بعد اردو کلاسیکل شاعری کی انجمن سونی ہو گئی آخری چراغ گل ہو گیا۔

آتش کا غیر معروف کلام

خواجہ حیدر علی آتش نہ صرف اپنے ہم عصروں میں بلکہ تمام اردو شعرا کی صفوں میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ شعراء لکھنؤ میں جو اسی شہر کی پیداوار تھے، آتش کی جگہ صف اول میں ہے۔ بعض لوگوں نے ان کو غالب کا ہم پلہ قرار دیا ہے اور یگانہ چنگیزی کے ایسے نقاد تو ان کو غالب پر بھی فضیلت دے گئے ہیں جن لوگوں نے غالب کی شاعری کا دقیقہ رسی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے اور غالب کے کمال فن کا گہری نظر سے جائزہ لیا ہے۔ وہ یقیناً آتش کو ان کا ہم پلہ قرار دینے میں بھی پس و پیش کریں گے لیکن پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ آتش نے لکھنؤ کی زبان اور اردو شاعری کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ ان کے کلام میں جو لطافت و شیرینی ہے۔ وہ دوسری جگہ نہیں ملتی آتش کے یہاں "شورش و کیفیت و معنی" کی وہ گرمی نہیں ہے جو میر تقی میر کے کلام میں کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی ہے اور نہ غالب کی ایسی بلندیِ خیال کی نظیریں ملتی ہیں لیکن پھر بھی آتش کے کلام میں حسن و عشق کی داستانیں ہیں، تصوف کے رموز شاعرانہ انداز میں ملتے ہیں، زندگی کی حلاوتوں اور تلخیوں کی چاشنیاں ہیں اور سب سے بڑھ کر زبان و بیان کا وہ مزا ہے جو آتش کے ساتھ مخصوص تھا

خواجہ آتش کا کلام خوب بھی ہے اور بہت بھی۔ چنانچہ جو کلیات نولکشور پریس کا مطبوعہ ہمارے پاس ہے وہ کافی ضخیم ہے پھر بھی بعض اشعار جو زبان زد رہے ہیں آتش کی طرف منسوب ہوتے ہوئے بھی مطبوعہ کلیات میں نہیں ملتے مثال کے طور پر حسب ذیل اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں۔

سوائے نام کے باقی اثر نشاں سے نہ تھے زمیں سے دب گئے جھک کے جو آسماں سے نہ تھے

مہماں بہار باغ ہے دو چار روز کی   چندے ہے دور دور شراب فرنگ کا

شراب بیخودی ایسی پلادی ساغر گل نے   رہے صیاد سے مرغ چمن غافل گلستاں میں

ان تینوں شعروں میں آتش کا رنگ اپنے منتہائے کمال پر ہے لیکن ان تینوں اشعار کے ردیف وقوافی میں ان اشعار کے ساتھ کوئی غزل نہیں ملتی۔ اسی طرح بعض دیگر اشعار بھی ایک زمانے میں بہت موقعہ اور خواجہ آتش کی طرف منسوب تھے۔ چنانچہ ایک ایسی ہی غزل کا یہ مطلع ہے

گر لگا کے یار نے ترچھی نگاہ کی   موت آئی پھر کسی نہ کسی بے گناہ کی

یہ شعر خواجہ کا ہے اور خالص لکھنؤ کے رنگ اور لکھنؤ کی زبان میں ہے تحقیق کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسی طرح کم سے کم چھبیس ۲۶ غزلیات جن میں بعض بعض تیس اشعار اور ان سے بھی زائد کی ہیں خواجہ آتش کی تصنیف سے ایسی موجود ہیں جو ان کے مطبوعہ نولکشور کلیات میں نہیں ہیں۔ یہ کمی کیسے رہ گئی اس کا پتہ نہیں چلتا بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نولکشور پریس میں جس نسخے سے کلام آتش نقل کیا گیا وہ ناقص تھا۔ خواجہ آتش نے ۱۲۶۳ھ میں وفات پائی تھی اور ان کے انتقال کے صرف پانچ برسوں کے بعد ان کے کلیات مطبع سلطان المطابع میں ۱۲۶۶ھ میں طبع ہوئے تھے۔ اس نسخے میں یہ تمام کلام مل جاتا ہے۔ ایک چھوٹے سے مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ یہ تمام غزلیات پوری پوری شامل کردی جائیں لہذا منتخب اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ انتخاب اپنے منتخب کرنے والے کے مذاق کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ذیل کے منتخب اشعار بعض سخن فہم حضرات کے نزدیک لائق قلم زدنی اور بعض دوسرے قابل انتخاب ٹھہرائے جائیں لیکن اس انتخاب کے بارے میں اتنا واضح کردینا ضروری ہے کہ اس کاوش میں لکھنؤ کے ممتاز شاعر وادیب ونقاد حضرت جعفر علی خاں اثر مرحوم کا مشورہ شامل تھا۔ مندرجہ بالا چھبیس ۲۶ غزلیات میں ہر غزل کے منتخب اشعار درج ذیل ہیں

(۱) - ۱۱ - اشعار

نالۂ ـــــ روز نہیں ہوسکتا　　دردِ ـــــ روز نہیں ہوسکتا
ماتم دل میں کہاں تک روؤں　　خون جگر روز نہیں ہوسکتا
پاؤں ٹوٹیں ترے اے عمر رواں　　اب سفر روز نہیں ہوسکتا
یار سے ہم کو شکایت بھی نہیں　　شکر اگر روز نہیں ہوسکتا
خیر ہے جیب رہے گی تک آتش　　رفع ـــ شر روز نہیں ہوسکتا
(قافیہ روز نہیں ہوسکتا)

(۲) ۱۲۔ اشعار

مے نوش بھر رہے ہیں دم ابرِ بہار کا　　تشریف لائیے تو کرم ابر بہار کا
ہے بادہ سرخ ہو کر سپید و سیاہ ہو　　ہر ایک رنگ ہے ستم ابر بہار کا
کیوں کر کہیں بساط سلیماں ترے گدا　　ساقی یہ مرتبہ ہے کم ابر بہار کا

(۳) ۱۳۔ اشعار

اڑ جائے گا زخم دلِ بیتاب کا پھاہا　　پیدا کرے گا حوصلہ سیماب کا پھاہا
وہ دوستی پیشہ ہوں لہو روتی ہیں آنکھیں　　چھوٹا ہے جو زخم دلِ احباب کا پھاہا

(۴) ۱۳۔ اشعار

آشیانہ نہ قفس میں نہ چمن یاد آیا　　آنکھ کھلنے بھی نہ پائی تھی کہ صیاد آیا
رو دیا ابر بہاری جو برستے .. دیکھا　　کرم پیرِ خرابات مجھے یاد آیا
عشق کے معرکے میں کون سی جھیلی نہ کڑی　　سر کیا سامنے جو قلعۂ فولاد آیا
قطع امید .. ہوئی رحم بھی آجانے کی　　ذبح کرنے مجھے منہ پھیر کے جلاد آیا
ایک دن ہچکی بھی آئی نہ مجھے غربت میں　　میں کبھی تم کو نہ یاران وطن یاد آیا
ہوں وہ دیوانہ وجود خبر اصلا نہ ہوئی　　طوق و زنجیر پہنانے کسے حداد آیا
دیکھئے پھر یہ تماشا نظر آنے کا نہیں　　سامنے آنکھوں کے ہے عالم ایجاد آیا

کہہ دو اندھوں سے کوئی اپنی تم آنکھیں کھولو　　روشنئ نگہِ عالم ایجاد آیا
فرقتِ یار میں بیتابئ دل کیا کہئے　　لب کلیجہ نہیں منہ کو دمِ فریاد آیا
درگہِ یار مرادوں کا محل ہے آتش　　شادیاں سے ہے گیا جب کوئی ناشاد گیا

(۵) ۔ ۹ ۔ اشعار

وہ گل جو آئے تو کیا لالہ زار میں ہو بہار　　دوچند لطفِ چمن ہو بہار میں ہو بہار
وہ رشکِ حور اگر ہو اپنے پہلو میں　　بہشت کی چمنِ روزگار میں ہو بہار
لباسِ سرخ پہن کر ہو یار ہم آغوش　　چمن کی طرح مرے بھی کنار میں ہو بہار
دکھاتی ہے مجھے حسنِ شباب یار کا رنگ　　نہ جانے دن جو مرے اختیار میں ہو بہار
شریکِ حال جو مٹی ترے شہید کی ہو　　چمن تو کیا ہے چمن کے غبار میں ہو بہار
فراقِ یار میں بدتر خزاں سے ہے آتش　　ہزارِ عالمِ نقش و نگار میں ہو بہار

(۶) ۱۹ ۔ اشعار

غمزے کرنا نہیں بیجا وہ ستمگر کس دن　　ناز ہوتے نہیں انداز سے باہر کس دن
بحرِ الفت کی بھی اللہ رے طوفاں خیزی　　ڈوب مرتے نہیں دوچار شناور کس دن
کیوں نہ عاشق رہے مشتاق پیامِ معشوق　　نہ رہے منتظرِ وحئ پیمبر کس دن

(۷) ۔ ۱۶ ۔ اشعار

ادا و ناز نہیں جس میں خوش جمال نہیں　　ہوئی جو چاند سی صورت تو کچھ کمال نہیں
صفا میں سینۂ عارف سے کم وہ گال نہیں　　جو خال ہے وہ سویدائے دل ہے خال نہیں
تمہارے دیکھنے والوں کی آنکھ جھپکا دے　　یہ برقِ طور پہ بھی ہم کو احتمال نہیں
تمہاری تیغ کے زخموں کے ماسوا کوئی　　بہادروں کے جو منہ پر چڑھے مجال نہیں
کہاں ہوئی ابھی معراج خاکساری کی　　ہنوز کاسۂ سر اپنا پائمال نہیں
زمانہ عاشق و معشوق سے نہیں خالی　　گلوں کا قحط نہیں بلبلوں کا کال نہیں

تلاش گنج میں جیسا خراب دختہ ہلوں — خرابہ بھی کوئی ایسا خراب حال نہیں

(۸) ۔ ۱۱ ۔ اشعار

طوق ہیں گردن ہی میرے پاؤں میں زنجیر ہیں — دو علاقے ہیں یہ مجھ دیوانے کی جاگیر ہیں
دوسرا مجھ سا نہیں دنیا میں دیوانہ فقیر — گوشہ گیری بھی ہوئی تو خانۂ زنجیر ہیں

(۹) ۔ ۷ ۔ اشعار

رہے مانند نقش پا ہے جبتک کہ عالم میں — فلک پر سے ہم آئے تھے زمیں پر جبہ سائی کو
خدا نے فقر و فاقہ کی گھڑی میں آبرو رکھی — توکل نے بٹھایا جب کبھی اٹھے گدائی کو

(۱۰) ۲۱ ۔ اشعار

خوب آگاہ ہے نظارے کے دستور سے آنکھ — یہ شگوفہ ہے کرامات شجرِ طور سے آنکھ
اثر عشق ہے پیری میں بھی اتنا باقی — دیکھ لیتی ہے حسینوں کیطرف دور سے آنکھ
کیا توقع ہو بھلا ان سے ہم آغوشی کی — پاس کب آئے وہ دکھلاتے ہیں جو دور سے آنکھ
تو توجہ جو نہ فرمائے تو اندھیر ہے پھر — دل ہے روشن ترے دم سے تو ترے نور سے آنکھ
پردہ ناموس محبت کا ہے یا نہ رہے — لڑ گئی اب تو ہے اک شاہد مستور سے آنکھ
حشر کے روز وہ دیدار خدا دیکھیں گے — نیچی ہوتی نہیں جن کی کسی مغرور سے آنکھ

(۱۱) ۱۴ ۔ اشعار

کیوں گراں پر پڑے نہ سب کی آنکھ — قد قیامت کا ہے غضب کی آنکھ
کیا تلون مزاج یار میں ہے — صبح کو پھر نہ تھی وہ شب کی آنکھ
تجھ سے قاتل کی شکل دکھلائی — دشمن جان و دل تھی کب کی آنکھ
یار پیش نظر ...... آیا — کھل گیا پردہ بند جیب کی آنکھ
تم نے بے وجہ ہم سے منہ پھیرا — تم نے کج ہم سے بے سبب کی آنکھ

(۱۲) ۔ ۱۷ ۔ اشعار

پیری میں فنا یاد دلاتی ہے دکھا کر
خورشید لب بام و چراغ سحری آنکھ

یہ شغل ہے دن رات جدائی میں کسی کے
خالی میں کیا کرتا ہوں اشکوں سے بھری آنکھ

دیکھے نگاہ بد سے نہ صورت کو کسی کی
اللہ رکھے تجھ کو گنتا ہوں سے بری آنکھ

بندھوائی دم قتل نہ جلاد سے پٹی
تلوار سے جھپکی تو قاتل سے ڈری آنکھ

(۱۴۳) ۱۷۔ اشعار

بخار دل ہے گھر آیا سحاب کے بدلے
اک آگ ہے کہ برستی ہے آب کے بدلے

لہو پلاتی ہے فرقت شراب کے بدلے
کھلاتی ہے غم و غصہ کباب کے بدلے

زمانہ رہتا نہیں اک حال پہ اے دوست
کبھی تو لطف بھی فرما عتاب کے بدلے

اسیر ہم ہوئے سودا ہوا اسے آتش
دھرے گئے دل خانہ خراب کے بدلے

(۱۴۴) ۲۰۔ اشعار

دار فنا سے اٹھ گئے کیا کیا نہ تاجدار
کسریٰ ہے طاق میں نہ فریدوں محل میں ہے

انجام کار کون سے آغاز کا ... نہیں
شاہ ابد نوشتہ روز ازل میں ہے

اے شاہ حسن تو نے جو پہلو کیا ہے گرم
بو سلطنت کی تیرے گدا کی بغل میں ہے

غنچہ شگفتہ ہوتے ہی آتی ہے فصل گل
کپڑوں کے پھاڑنے کی بہار آج کل میں ہے

عاشق کے جذب دل کو بھی کچھ کم نہ جانیے
اس میں بھی وہ اثر ہے جو عجب کے عمل میں ہے

ہر دل میں منزلت ہے ترے داغ عشق کی
خورشید کو شرف ہے تو برج حمل میں ہے

ہوشیار رشک کرتے ہیں آتش کے حال پر
دیوانہ خوش پری لیے اپنی بغل میں ہے

(۱۵۱) - ۱۵۔ اشعار

فصل گل میں کس کو عقل ذو فنون درکار ہے
لالہ بھولا ہے ہمیں داغ جنوں درکار ہے

ہجر میں کس کو شراب لالہ گوں درکار ہے
چار چلو غم کے پی لینے کو خوں درکار ہے

تجھ سوا دنیا و ما فیہا سے کچھ مطلب نہیں
تو ہمیں اے کائنات کاف و نوں درکار ہے

پاؤں بسم اللہ کہہ کر رکھ طریق عشق میں — فال کی حاجت نہ کچھ اسمیں شگون درکار ہے

دیدہ و دل دونوں صورت آشنائے یار ہیں — صاف آئینے سے بیرون و درون درکار ہے

زندگی کی گور ہیں اے دل نہ ہوں بیتابیاں — راہ ہیں تحریک منزل میں سکوں درکار ہے

درہم داغ جنوں دے موسم گل بے شمار — حوصلے سے مجھ کو یہ دولت فزوں درکار ہے

چاہتا ہوں واسطے عقبےٰ کے میں حسن عمل — کس کو آتش دولت دنیائے دوں درکار ہے

(۱۶) ۔ ۲۴ ۔ اشعار

موسیٰ و فرعون میں کچھ فرق غافل چاہیئے — آدمی کو امتیاز حق و باطل چاہیئے

انتظام ملک وحشت کے لئے دل چاہیئے — اس علاقے کیلئے دیوانہ عامل چاہیئے

حسن کا دکھلائے جلوہ عشق کامل چاہیئے — شہد سے شیریں ہو یہ زہر ہلاہل چاہیئے

دل ہے جس لیلےٰ کا مجنوں اس سے رکھتا ہوں غرض — ناقے سے مطلب ہے کچھ مجھ کو نہ محمل چاہیئے

دل ہے جس لیلےٰ کا مجنوں اس سے رکھتا ہوں غرض — ناقے سے مطلب ہے کچھ مجھ کو نہ محمل چاہیئے

نقش پائے رفتگاں سے آرہی ہے یہ صدا — دو قدم میں طے ہے شوق منزل چاہیئے

اشک خونی اس قدر شوق شہادت میں بہا — پیرہن ہو جائے تیرا رخت بسمل چاہیئے

کافی اپنے واسطے ہے جو ہے قسمت میں لکھا — کچھ نہ باقی چھوڑ جانا ہے نہ فاضل چاہیئے

بے تصور دل مکان یار ہونے کا نہیں — بند کرنے کو پری شیشہ میں عامل چاہیئے

دیدہ و دل بھی ترے شیدا ہیں اے زہرہ جبیں — ان فرشتوں کیلئے بھی چاہ بابل چاہیئے

بیشتر منزل سے مرجا اشتیاق گور میں — بھول جائے یاد خلوت میں محفل چاہیئے

باوجود قرب دریا ہے در مقصود ... گم — خاک سر پر ڈالنی یاں مثل ساحل چاہیئے

آسماں پہ روح تن زیر زمیں کیونکر نہ جائے — اپنی اپنی گور اپنی اپنی منزل چاہیئے

(۱۷) ۔ ۳۵ ۔ اشعار

ساقی چھکا ہمیں بھی مے لالہ فام سے — ہم کو بھی چپڑاشت ہے چشمک کی جام سے

غافل نہیں قضا و قدر اپنے کام سے
اُٹھی ہی پڑتی ہے یہ سروہی نیام سے

باہر حساب سے کرم بے حساب ہے
باراں ہے ایک قطرہ ترے فیض عام سے

کیوں کر شبِ فراق کٹی کچھ نہ پوچھئے
چلائے تام صبح کا لے لے کے نام سے

بسمل کی طرح لوٹتے ہیں مست ساقیا
شیشے سے ہوشیار خبردار جام سے

بحرِ جہاں کے شور سے آتی ہے یہ صدا
منزل میں ہے جو کوچ کیا اس مقام سے

عریاں کو تیرے قید نہیں پیرہن کی ہے
یہ ذوالفقار رہتی ہے باہر نیام سے

آوازِ دوست آتی ہے پردے سے ساز کے
ظاہر ہے وجد صوفیٔ عالی مقام سے

گردش میں رہتے ہیں تو رہیں ہفت آسماں
جنبش نہ ہوگی قلب کو اپنے مقام سے

بتخانے سے خدا کی طرف جو پھرا ہوں میں
گھی کے چراغ جلتے ہیں مسجد میں شام سے

(۱۸) ۔ ۱۸ ۔ اشعار

گستاخ بہت شمع سے پروانہ ہوا ہے
موت آئی ہے سر چڑھتا ہے دیوانہ ہوا ہے

اس عالمِ ایجاد میں گردش سے فلک کی
کیا کیا نہیں ہونے کا ہے کیا کیا نہ ہوا ہے

یاد آتی ہے مجھکو تنِ بے جان کی خرابی
آباد مکاں کوئی جو ویرانہ ہوا ہے

(۱۹) ۔ ۱۷ ۔ اشعار

یہ مرمٹوں کا ترے یادگار باقی ہے
کوئی کوئی جو نشانِ مزار باقی ہے

وہی ہے حُسنِ سفید و سیاہ کا عالم
وہی دو رنگیٔ لیل و نہار باقی ہے

دکھا رہے ہیں گل و لالہ اپنا اپنا رنگ
طلسم بندیٔ نقش و نگار باقی ہے

دکھائی دیں گے نہ یہ زرد زرد پتے بھی
خزاں کی بھی کوئی دس دن بہار باقی ہے

نیام میں ابھی قاتل نہ کیجیو شمشیر
جھکائے گردن اک امیدوار باقی ہے

مثالِ فاد کی بنیاد نرم کر دلِ سخت
وجود سنگ ہے جب تک شرار باقی ہے

(۲۰) ۔ ۲۷ ۔ اشعار

سُرمہ لگا کے یار نے ترچھی نگاہ کی — موت آئی پھر کسی نہ کسی بے گناہ کی

آمد ہمارے گھر میں ہے اس رشکِ ماہ کی — دعوت فقیر خانے میں ہے بادشاہ کی

بو یار کی سنگھا کے صبا نے اڑائے ہوش — بادِ مراد نے مری کشتی تباہ کی

فصلِ بہار آئی مبارک ہو اے جنوں — خار اور آبلے سے ملاقات راہ کی

اچھا ہیں، حالِ دل کے جو کہنے ہیں تو کہا — لکنت زبان کرتی ہے جھوٹے گواہ کی

دل میں ہمارے جلوہ نما ہے خیالِ یار — برجِ شرف میں روشنی ہے مہر و ماہ کی

ناگفتنی ہے مہر و محبت کا ماجرا — لذت بیان ہو نہیں سکتی ہے چاہ کی

ماتم کدے میں دہر کے وہ دردمند ہوں — بے درد نے بھی سُن کے مرا نالہ آہ کی

پائی سزا گناہ نہ کرنے کی روزِ حشر — پوچھی گئی نہ بات کسی بے گناہ کی

مجھ ناتواں کی خاک جو اس میں ہوئی شریک — اٹھ اٹھ کے بیٹھ بیٹھ گئی گرد راہ کی

آتش نہ پوچھ ہجر کی شب کس طرح کٹی — نالے سے دردِ سر جو ہوا تھک کے آہ کی

(۲۱) ۳۱۔ اشعار

عنایت و کرم ابرِ بہار رکھتا ہے — ہرا بھرا چمن روزگار رکھتا ہے

فسوں کوئی نہ تو اعجاز یار رکھتا ہے — فریبِ حسن سے عاشق کو مار رکھتا ہے

دو نیم دل لبِ جاں بخش یار رکھتا ہے — دمِ مسیح دمِ ذوالفقار رکھتا ہے

خفا جو ہیں کوئی ان سے مری طرف سے کہے — امیدِ عفو کی تقصیر وار رکھتا ہے

محل ادب کا ہے ٹھکرا کے چل نہ قبروں کو — پیادہ ہو کے قدم یاں سوار رکھتا ہے

خدا کا گھر اسے سنتے ہیں عارفوں سے ہم — بجیل کشورِ دل شہریار رکھتا ہے

جدا تو روح کو ہونے دے جسمِ خاکی سے — یہی غبار ہے جو شہسوار رکھتا ہے

سوالِ بوسہ کا ہم بھی کریں گے اے آتش — سنا ہے خیر کی توفیق یار رکھتا ہے

(۲۲) ۳۶۔ اشعار

شریک اشک جو لخت جگر نہیں رکھتے — دکان عشق میں لعل و گہر نہیں رکھتے
خوشا وہ مست جو لعل و گہر نہیں رکھتے — درون خانہ و بیرون در نہیں رکھتے
خدا کو اہل توکل ہیں جانتے رزاق — سحر کے واسطے ہم شب کو دھر نہیں رکھتے
بتوں کے جور و جفا سے جو رہتے ہیں نالاں — مگر یہ لوگ خدا پر نظر نہیں رکھتے
ملی ہے پاؤں میں مہندی انھوں نے پہلے پہل — زمیں تو کیا ہے قدم عرش پر نہیں رکھتے
نہ خوف دزد نہ ہے بیم حاکم ظالم — ہزار شکر کہ ہم سیم و زر نہیں رکھتے
علاقہ جسم سے جب وقت تک ہے خام ہے روح — لگاؤ شاخ سے پختہ ثمر نہیں رکھتے
عجب کی جا ترے بالوں کے بیچ سورج ہیں — یہ اتفاق تو شمس و قمر نہیں رکھتے
نہ ہو جو روح تو پھر جسم کس شمار میں ہے — حساب میں صدف بے گہر نہیں رکھتے

(۲۳) ۔ ۱۳ ۔ اشعار

گو رہیں دل سے خیالات جہاں دور رہے — وہ دیار اور وہ بستی وہ مکاں دور رہے
ایک دم دل سے نہ جو جان جہاں دور رہے — حیف آنکھوں سے وہ موجود و عیاں دور رہے
روح کو قالب خاکی سے نکل جانے دے — لامکاں سے بہت اے قید مکاں دور رہے
نفع ان سخت نہادوں سے نہیں غیر ضرر — بیچ میں پڑنے سے دانتوں کے زباں دور رہے
تلخ کامی دم نزع بھی شیریں ہو جائے — زندگی میں جو حلاوت سے زباں دور رہے
پیش منعم نہیں کم مایہ کی عزت ہوتی — آبرو چاہے تو دریا سے کنواں دور رہے
بند کیں خواب اجل نے مری آنکھیں آتش — وہ تماشائے جہان گزراں دور رہے

(۲۴) ۔ ۱۹ ۔ اشعار

غم خانۂ عاشق میں بھی شادی کا نشاں ہے — نوبت نہیں تو نوبت فریاد و فغاں ہے
دل دولت دنیا سے نہ ہو زر کی طرح سرخ — مسجد ہو طلائی تو قیامت کا نشاں ہے
شیخی و شیخت نہیں مے خانہ میں چلتی — یاں پگڑی اچھلتی ہے خرابات مغاں ہے

دنیا سے گزرنا سفرِ مصر ہے ہم کو — چاہ لحد اپنے لئے یوسف کا کنواں ہے

لختِ دلِ عاشق نہیں یہ آنسوؤں کے ساتھ — یوسف کو لئے قافلۂ اشک رواں ہے

پھیرے نہ کبھی منھ معرکۂ عشق سے آتش — جاں بازی ہے کھیل اسکو بہادر جو جواں ہے

(۲۵) ۴۔ اشعار

پھیریں گے نہ منھ کو تری تلوار سے قاتل — ہم دل کے کڑے ہیں وہ اگر منھ کی کڑی ہے

پر تجھے مرے نالوں کے عبث کرتی ہے بلبل — تو اپنی خبر لے تجھے کیا میری پڑی ہے

کچھ عشق میں مجنوں ہی سوا ہے نہ تو فرہاد — لیلیٰ ہی نہ چھوٹی ہے نہ شیریں ہی بڑی ہے

(۲۶) ۔۴۔ اشعار

اے شاہ حسن ہو گی ترقی جمال میں — لے جس قدر فقیروں کی تجھ کو دعا ملے

عشق بتاں میں لطف اٹھایا ہے تو نے کیا — آتش سے پوچھیے جو وہ مرد خدا ملے

مذکورہ بالا انتخابات کا مطالعہ آتش کی شیریں زبانی اور طرزِ فکر و ادا کے بہترین نمونے پیش کرتا ہے۔ لکھنؤ کے رنگ شاعری کی بھی بہترین مثالیں ان اشعار میں موجود ہیں۔ تصوّف بھی ہے، عقل و حکمت بھی، زبان و کلام کا لطف بھی، حسن و عشق کی داستانیں بھی ہیں اور ستم ہائے روزگار کی حکایتیں بھی، پند و نصائح بھی ہیں اور طعن و تشنیع کے حسین اشارات بھی۔ غرض کہ اس دور کی بہترین شاعری کا یہ انتخاب پوری طرح آئینہ دار ہے۔

آخر میں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ مندرجہ بالا اشعار میں بہت سے ایسے ہیں جو زباں زد خلائق ہیں لیکن بہت کم لوگ ان کو آتش کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اشعار آتش کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں اس انتخاب کو پیش کر دینے کے بعد یہ بیش قیمت ذخیرہ آتش ہی کے نام سے مشہور اور محفوظ ہو سکے گا۔

انیسؔ کے دس بند

میر انیسؔ کے تصنیف کردہ مراثی کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ انکے اعداد و شمار کا کوئی تعین نہیں کیا جا سکتا۔ راقم کی نظر سے سات مطبوعہ جلدیں گذری تھیں جن میں آخری دو جلدوں کے اندر بعض مراثی کی تکرار تھی تاہم کچھ مرثیے ایسے ضرور تھے جو پہلی پانچ جلدوں میں طبع نہیں ہوئے تھے۔ ان سات جلدوں کے علاوہ بھی کبھی کبھی اور کہیں نہ کہیں یہ سننے میں آتا رہا کہ فلاں فلاں صاحب کے پاس میر انیس کا غیر مطبوعہ مرثیہ موجود ہے۔ بہرحال اس لاتعداد مراثی کے ذخیرے میں کچھ ایسے ہیں جو غالباً سوز خوانی کے لئے کہے گئے ہوں گے۔ بعض مختصر مرثیے صرف تسکینِ خاطر یا کسی مخصوص موقع یا کسی مختصر مجلس کے لئے کہے گئے تھے۔ لیکن پھر بھی ایسے مراثی کی تعداد کم نہیں ہے جن کو ہم گراں قدر ادبی کارنامہ کہنے کے لئے مجبور ہیں۔ ان مراثی میں بھی یہ فیصلہ کرنا کہ کون مرثیہ انیس کا بہترین شاہکار ہے بہت مشکل ہے اس لئے کہ اگر کسی کا چہرہ عدیم المثال ہے تو کہیں کسی شہید کی رخصت اپنا جواب نہیں رکھتی۔ کہیں مکالمہ بے نظیر ہے تو کہیں رجز اور لڑائی بے مثل ہے۔ غرض کہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ کون ایک مرثیہ از ابتدا تا انتہا اتنا مرصع، مکمل اور فنکارانہ ہے جس کو درجۂ اولیٰ کا مرتبہ حاصل ہو۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ انیس کا بہترین مرثیہ وہ ہے جس کا مطلع ہے "جب خاتمہ بخیر ہوا فوج شاہ کا"۔ یہ مرثیہ غالباً انیس کا آخری کارنامہ ہے اسی لئے اکثریت اس کی افضلیت کی قائل ہے۔ لیکن محبِ محترم پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کا یہ فیصلہ ہے کہ انیس کا بہترین مرثیہ

ہے "جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے" اس فیصلہ کا احترام کرتے ہوئے میں اسی مرثیہ کے پہلے دس بندوں کو اپنے تبصرہ کا موضوع بنا رہا ہوں۔

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے — جلوہ کیا سحر کے رخِ بے حجاب نے
دیکھا سوئے فلک شہِ گردوں رکاب نے — مڑ کر صدا رفیقوں کو دی اس جناب نے
آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو — اٹھو فریضۂ سحری کو ادا کرو

قطع کرنے کے معنی ہیں کسی چیز کو درمیان سے کاٹ دینا قطع و برید کی اصطلاح مشہور اور رائج ہے جس کے معنی ہیں کاٹنا اور چھانٹنا لیکن قطع کرنا صرف کاٹ دینے یا بالخصوص درمیان سے کاٹ دینے کے لئے بولا جاتا ہے۔ کلام قطع کرنا یعنی بیچ میں بات کاٹ دینا مستعمل ہے اس طرح اس مصرع کا یہ مطلب ہوا کہ رات کاٹے نہیں کٹتی تھی آفتاب نے درمیان سے کاٹ دی یعنی رات ختم نہیں ہوئی تھی اور ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی کہ ناگاہ آفتاب نے طلوع ہو کر اس کو درمیان سے کاٹ دیا۔ امام حسین اور ان کے اصحاب و اقربا کے تاثرات' زمین آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔ آسمان بھی متاثر تھا اور رات بھی گویا کہ ارض و سما کی سانس رکی ہوئی تھی۔ ماہتاب زمین کربلا کی طرف نظر جمائے ہوئے تھا اور آفتاب کو بھی حاضر باشی میں عجلت تھی۔ آفتاب جو سب سے زیادہ طاقتور محرک تھا دخل اندازی کر کے طلوع ہو گیا اور مسافت شب قطع کر دی۔

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ مسافت کے معنی ہیں فاصلہ۔ لیل و نہار کے فاصلے شمس و قمر طے کرتے ہیں نہ کہ شب و روز۔ مسافت کو اس مصرع میں طوالت کے معنی میں استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ حالانکہ مسافتِ شب کے قطع ہونے کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ طوالتِ شب کو قطع کر دیا گیا۔ اس لئے یہ سوچنا پڑتا ہے کہ انیس نے شب کے ساتھ مسافت کا تخیل کیوں پیش کیا؟ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ امام زمانہ چوں کہ اسی روز ایک ایسا اقدام کرنے والے تھے جو روزِ قیامت تک بے عدیل و بے نظیر کارنامہ قرار پانے والا تھا اور جس کا پیش خیمہ وہ واقعات و حالات تھے جو چھ سات روز قبل سے رونما ہو رہے تھے اس لئے کائنات لرزہ براندام تھی مناظر فطرت کا نکتہ رس اور صاحبِ بصیرت

شاعر اس بحث میں کہاں پڑ سکتا تھا کہ شمس و قمر متحرک ہیں یا ارض و سما۔ اس نے صرف یہی محسوس کیا کہ مصیبت کی گھڑیاں بہت کٹھن ہوتی ہیں جو کاٹے نہیں کٹتی ہیں۔ لہٰذا آفتاب نے طلوع ہو کر مسافتِ شب کو قطع کر دیا۔

"مسافت" اور "قطع کی" کہہ کر اس عظیم المرتبت شاعر نے مصائب و آلام کی شدتوں، اذیت و تکلیف کی لامتناہی گھڑیوں اور اسی قسم کے دوسرے حالات کی طرف ایک مصرع میں اشارہ کر کے جس ندرتِ خیال کی مثال پیش کی ہے وہ اردو ادب میں مشکل کہیں اور نظر آئے گی۔ مصرع پڑھتے رہیے، غور کرتے جائیے اور بار بار سوچیے: لطف میں اضافہ ہی ہوتا جائے گا۔

آفتاب کا مسافتِ شب کو قطع کرنے کے بعد بادی النظر میں یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ سورج نکل آیا اور صبح ہو گئی لیکن انیس کے پیش پا افتادہ بات نہیں کہتے۔ وہ سحر کے رخِ بے حجاب کو جلوہ گر کرتے ہیں تیسرا مصرع یہی پتہ دیتا ہے کہ اگر صرف سپیدۂ سحری کا ظہور امام کو متاثر کر رہا تھا تو سوئے فلک دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ تمام دشت و در پر روشنی چھا گئی ہو گی۔ فلک کی طرف دیکھنا اور رخِ بے حجاب جلوہ گر ہونا ہی یہ ظاہر کرتا ہے کہ امام کی نظر اس نورِ حقیقی پر پڑی جو پردۂ سحر میں مستور تھا۔ خدا پرستوں نے طلوعِ صبح میں انوارِ الٰہی کو جلوہ گر ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ بلند پایہ شاعروں نے اس ادراک کو طرح طرح سے نظم کیا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ "ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے، اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی" میر تقی میر کے ایسے خدا ترس اور برگزیدہ شاعر نے کہا ہے کہ ؎

"اس وقت ہے دعائے اجابت کا وصل میر — اگ نالہ تو بھی پیش کش صبح گاہ کر"

ظاہر ہے انیس کی یہ صبح بھی کچھ ایسی ہی تھی جس کو امام نے طلوع ہوتے ہوئے دیکھا اور جس سحر کے رخِ بے حجاب کی جلوہ گری نے امام کے اس اقدام میں جو وہ اس روز کرنے والے تھے، انہماک اور جوش پیدا کر دیا۔

پہلے دونوں مصرعوں میں الفاظ کی ترکیب نے دو علیحدہ علیحدہ کیفیتیں پیدا کر دی ہیں۔ مسافتِ شب اور قطع کرنے کا تخیل ایک گداز پیدا کرتا ہے جو اندوہ و الم کا لازمی نتیجہ ہے لیکن رخِ سحر کا بے حجابانہ جلوہ گر ہونا دونوں نور اور امنگیں

خنکی مرحمت کرتا ہے انیس نے ڈرامائی انداز میں پہلے مصرعے سے جو سوز و گداز پیدا کر دیا تھا اسکو خنکی و ظلمات سے نور اور دوسرے مصرع میں تبدیل کر دیا اور یہی ان کی شاعری کا کمال اور ان کے کمال کا معجزہ ہے۔

تیسرے مصرع کو اگر غور سے دیکھا اور توجہ سے سوچا جائے تو کچھ عجیب حقیقت نظر آتی ہے امام کی نظر اس روشنی پر نہیں تھی جو معمولی آنکھیں دیکھ سکتی تھیں اور دیکھ رہی تھیں۔ وہ نور حقیقی کا مشاہدہ کر رہے تھے جس کے لئے توجہ تام کی ضرورت تھی۔ انیس نے اسی بھرپور توجہ کی تصویر "دیکھا سوئے فلک" کہہ کر پیش کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ پیدا کرنے والے کا جلوہ ہر طرف ہے لیکن ہم اپنے معبود کی درگاہ میں جب دعائیں کرتے ہیں تو آسمان ہی کی طرف اپنے ہاتھ بلند کرتے ہیں یہی حکم شرعی بھی ہے اور امام کا عمل بھی اسی کے مطابق تھا۔ اس لئے آسمان ہی کیطرف دیکھنا عین حکمت تھا۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ ہر انسان مصیبت و محن میں آسمان ہی کی طرف دیکھتا اور ادھر ہی رخ کر کے فریاد کرتا ہے یہی مقتضائے فطرت انسانی ہے۔ امام حسین کے لئے وہ دن اعظم مصائب کا تھا۔ اس لئے اس تیسرے مصرع میں اسی سوز و گداز کی طرف پھر اشارہ ہے جس کا حوالہ پہلے مصرع میں ملتا ہے آسمان کی طرف دیکھنے والے امام کو "شہ گردوں رکاب" کہنا انیس کا کارنامہ ہے۔ یہ تخاطب ظاہر کرتا ہے کہ امام کو آسمانوں سے بھی اتنی ہی واقفیت تھی جتنی زمین سے تھی، وہ آسمانوں کا حال بھی اسی طرح جانتے تھے جیسا کہ اُن کو دنیا کے معاملات کا علم تھا۔ اس لئے آسمان کی جلوہ گری جتنا ان پر روشن اور آشکار تھی اس کو صرف وہی سمجھ سکتے تھے۔ انیس نے صرف ایک لفظ "دیکھا" اور اس کے استعمال میں معنویت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ اس کے علاوہ "شہ گردوں رکاب" میں امام کی جلالت قدر کا بھی اعلان ہے۔ انیس کا ہیرو اپنی تمام بیکسی و مظلومی سمیت ایک جلیل القدر اور برگزیدہ ہستی ہے اور اس کی عظمت و احترام کا پاس و لحاظ رکھنا ہر مقام اور ہر محل پر ضروری بھی ہے۔

آسمان کی طرف دیکھنے اور انوار الٰہی کے جلوے کا مشاہدہ کرنے کے بعد جذبۂ عبودیت جوش میں آنا ضروری تھا۔ لیکن چونکہ یہ شخصیت امام کی ہے جس کے منصب میں تبلیغ اور تعلیم داخل ہے،

اس لئے امام کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ دوسروں کو بھی اللہ کی یاد دلائیں اور عبادت خدا کی طرف امادہ کریں۔ اس ارادہ اور نیت کی وضاحت کے لئے شاعرِ بے بدل نے صرف ایک فقرہ "مُڑکر" استعمال کیا۔ اِس فقرہ میں معنویت بھی ہے اور ڈرامائی انداز بھی انتہائی موثر طریقہ پر پیش کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے ساتھیوں کو "رفیق" کہہ کر امام نے پکارا ہے۔ امام اپنے اصحاب سے بے حد محبت فرماتے تھے اور اصحاب ان پر اپنی جانیں نثار کرنے کے لئے امادہ تھے۔ امام و ماموم کے درمیان اس پُرخلوص رشتۂ مودّت و اخلاص کو دیکھتے ہوئے بالخصوص اُس وقت جب نماز دعوت دی جا رہی ہو "رفیق" سے بہتر لفظ تلاش کرنا ناممکن ہے۔ انیس نے تقاضائے وقت اور حفظِ مراتب کے تمام مراحل کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے جو لفظ جس مقام پر استعمال کیا ہے وہ جواہر پارے کی طرح ضوفشانی کر رہا ہے۔

ان چار مصرعوں کے بعد بیت ہے جو پورے بند کا معقد اور خیالات کی زنجیر میں آخری سنہری کڑی ہے۔ بات صرف اتنی کہی گئی ہے کہ رات ختم ہو چکی اب اٹھو اور خدا کی حمد و ثنا کرو۔ فریضۂ سحری ادا کرنے کی تلقین کرنا امام کا تبلیغی فریضہ تھا۔ لیکن پھر بھی فریضہ ادائی ایک خشک ذمہ داری ہے جس میں عقیدہ لذت اور وجدان پیدا کرتا ہے۔ ذمہ داری کی طرف توجہ دلانے کے لئے پھر بھی وہ لہجہ اور وہ الفاظ ضروری ہوتے ہیں جو سننے والے کو اپنی طرف متوجہ کر لیں۔ انیس نے پہلے مصرع میں "آخر ہے رات" اور دوسرے میں "اٹھو" کہہ کر وہ لذت، وہ حلاوت، وہ انہماک اور وہ خلوص پیدا کر دیا ہے کہ اُن الفاظ کو اس بیت میں جانِ فصاحت کہے بغیر چارہ ہی نہیں ہے۔ یہ نہیں کہتے کہ سحر ہو گئی ہے، یا یہ وقتِ نمازِ صبح آگیا۔ یہ بھی نہیں کہتے کہ سو چکے اب اٹھو یا یہ کہ اٹھو کب تک سوؤ گے، بلکہ مستعمل فقروں کو نظر انداز کر کے کہتے ہیں "آخر ہے رات"۔ واقعاً رات ختم ہو رہی تھی اور یہ بھی تو ایک حقیقت تھی کہ اُن نماز گزاروں کی زندگی میں وہ آخری رات تھی۔ اس حقیقت سے وہ خود بھی واقف تھے۔ اس پسِ منظر میں مصرع پڑھئے اور سر دھنتے رہئیے۔ کیسی دعوت دی کوئی کہہ کر جگاتا کہ بس اٹھو تمہاری زندگی کی آخری رات ختم ہو گئی اس کے دنیائے خیالات و جذبات

میں ہیجان و تلاطم پیدا کر دے گا۔ لیکن یہ کہنا کہ "آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو" ایک برگزیدہ اور خدا پرست ہستی کے دل کو مرنے کا یقین ہوتے ہوئے بھی سکون بخشے گا اور وہ رضائے الٰہی میں بس مرجانا گوارا کر لے گا۔ انسانیت، شرافت اور محبت کی نظر میں، صرف یہی طرز تکلم پسندیدہ اور قابل قدر قرار پاتا ہے۔

چھٹے مصرع میں "اٹھو" کا منشا لفظوں میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ بظاہر یہ لفظ اس آدمی یا ان آدمیوں کو مخاطب کر کے بولا جاتا ہے جو لیٹے یا سو رہے ہوں۔ امام کے رفقا نے ساری رات عبادتِ الٰہی میں کاٹی تھی وہ یقیناً اُس وقت بھی جاگ ہی رہے ہوں گے۔ اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ اس مقام پر سوتے اور لیٹے ہوئے لوگوں سے تخاطب نہیں بلکہ "اٹھو" کا لفظ خلوص و انہماک کے جذبات سے متاثر ہو کر استعمال ہوا ہے۔ جس طرح "آخر ہے رات" کے ساتھ "حمد و ثنائے خدا کرو" کو ایک خاص معنویت حاصل ہے اسی طرح "اٹھو" کے بعد "فریضۂ سحری ادا کرو" بھی ایک مخصوص عبادت کی طرف اشارہ ہے اور یہ لفظ اسی عبادت میں انہماک پیدا کرانے کیلئے بولا گیا ہے امام کے رفقاء عبادت گزار تھے۔ ان کو نماز سے خلوص اور عبادت الٰہی سے شغف تھا۔ ان مقدس مشاغل کی طرف توجہ دلانا اور صبح ہوتے ہی نماز صبح کی طرف متوجہ کرنا یقیناً سعی لاحاصل کے برابر تھا۔ اس لئے ہم یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ اس بیت میں حمد و ثنائے خدا اور فریضۂ سحری کو ادا کرنے کے فقرے کن کن مقاصد اور اغراض کو اپنے پیکر الفاظ میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ یہ مسئلہ بظاہر ایک دشوار منزل ہے لیکن انیس خود ہی مشکل پیدا کرتے ہیں ______ اور خود ہی اس کو آسان تر بنا دیتے ہیں۔ ان سوالات کے جوابات کے لئے جو بیت کے یہ دو فقرے ہمارے دماغ کو سوچنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ آنے والے دو بند ملاحظہ فرمائیے :-

(۲)

ہاں غازیو یہ دن ہے جدال و قتال کا ۔ یاں خوں بہے گا آج محمد کی آل کا
چہرہ خوشی سے سرخ ہے زہرا کے لال کا ۔ گزری شبِ فراق دن آیا وصال کا

ہم وہ ہیں غم کریں گے ملک جن کے واسطے　　راتیں تڑپ کے کاٹی ہیں اس دن کیواسطے

دن بھر کے آنے والے مصائب اور آلام سے اپنے ساتھیوں کو مطلع کرنا ہے، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی خیال رکھنا ہے کہ بہادر ساتھیوں کے حوصلے اگر بڑھیں اور شوقِ جنگ میں شدت ہو تو جذبِ حصولِ شہادت میں بھی کمی نہ ہونے پائے۔ اس موضوع پر امام حسین کو مکالمہ کرنا ہے جو افصح الفصحا رہے ہیں۔ لیکن موضوعِ کلام سخت اور دشوار گزار ہے سکسپیر کے مایۂ ناز مقرر مارک انیٹنی کی چرب زبانی انیس کے ہیرو کے شایانِ شان نہیں اور نہ برو ٹس کی فلسفہ آفرینی کا یہ محل ہے حسین کا ایسا مردم شناس اور بلند پایہ و سنجیدہ ادیب، اپنے ہوشمند اور جلیل القدر ساتھیوں سے مخاطب ہوتا ہے جہاں نہ جذبات کو حرکت میں لانے کی ضرورت ہے اور نہ کسی دنیاوی یا اخروی منفعت کا سہارا لینا ہے حق شناس حسین اپنے حقیقت پرست ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہیں جس کی ترجمانی انیس کی زبان سے اس طرح ہوتی ہے۔

سب سے پہلے یہ واضح کر دیا جاتا ہے کہ آج کا دن جدال و قتال کا ہے۔ جن رفیقوں کو فریضہ سحری ادا کرنے کی تلقین کی جا رہی ہے، انہیں کو غازیوں کے لقب سے پکارا جا رہا ہے اور جدال و قتال کی بشارت دی جاتی ہے۔ یعنی یہ کہ یہ جدال و قتال بھی عین عبادت الٰہی ہے۔ اس کے فوراً بعد یہ بھی واضح کر دیا جاتا ہے کہ یہ معرکہ تمہارے خلاف ہی نہیں ہے۔ بلکہ یہاں آج محمد کی آل کا خون بہے گا۔ یہ نہیں کہا کہ میرا خون بہے گا اور میں محمد کا نواسہ ہوں۔ یہ کہا جاتا تو اس شہادتِ عظمیٰ کی فضیلت میں دوسروں کو شریک رکھنے کا شرف مشکوک ہو جاتا۔ محمد کی آل کہہ کر حسین نے اپنے سارے عزیزوں کو اپنی مرتبت میں برابر کا شریک کر لیا تیسرا مصرع جانِ تغزل ہے۔ اس مقام پر صرف اس کیفیت کا ذکر ہے۔ جو حسین کی ذات سے مخصوص تھی۔ جہاں زہرا کا لال کہا گیا وہاں لال کے ساتھ سرخی کی نسبت مرثیہ میں گل رنگی اور درد میں حلاوت پیدا کرتی ہے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ روزِ عاشورہ امام حسین پر مصائب میں جتنی شدت بڑھتی جاتی تھی آپ کا چہرہ سرخ سے سرخ تر ہوتا جاتا تھا۔ انیس نے وقتِ سحر ہی اس آنے والی کیفیت کی نشاندہی کر دی اور تیسرے مصرع کے بعد فوراً اسی کیفیت کو معراج

کمال تک پہونچا دیا۔ یعنی یہ کہ چہرہ پر سرخی جو خوشی کی علامت ہے، اس لئے ہے کہ شبِ فراق گزر گئی اور معشوقِ حقیقی کے وصال کا دن آگیا۔ امام حسین کی ساری زندگی کو شبِ فراق سے تعبیر کر کے محبت کا بلند ترین معیار قائم کیا ہے۔ اسی چوتھے مصرع سے بیت کا تسلسل ہے۔ فرماتے ہیں کہ جب راتیں تڑپ تڑپ کے کاٹ ڈالیں تب یہ دن آیا لہٰذا ساری خوشی برمحل ہے۔ لیکن چونکہ یہ کارنامہ ایک خوں چکاں سانحہ ہے اس لئے یہ بھی فرما دیا کہ "ہم وہ ہیں غم کریں گے ملک جن کے واسطے"۔ فنِ خطابت ہو یا علم النفس کے درسیات ہر نہج سے اس مصرع کی بلاغت تعریف سے بالاتر ہے پہلے مصرع میں نمازیوں کہہ کر تخاطب کیا" دوسرے مصرع میں محمد کی آل تک تذکرہ محدود ہوا، تیسرے چوتھے مصرعوں میں یہ ذکر سمٹ کر امام حسین کی ذات تک آگیا۔ چھٹا مصرع بھی چوتھے مصرع کی کیفیت کا ایک تتمہ ہے۔ لیکن پانچویں مصرع میں "ہم" کہہ کر امام حسین نے اپنے تمام ساتھیوں کو جن میں اعزا و اقارب، رفقا دبھی شامل تھے، یکساں طور پر شریک کر لیا۔

حمد و ثنائے باری تعالیٰ اور فریضۂ سحری ادا کرنے کی تلقین کے لئے یہی ایک بند کافی وزن رکھتا ہے۔ لیکن انیس کے پر پرواز آگے بڑھتے ہیں فرماتے ہیں۔

(۳)

یہ صبح ہے وہ صبح، مبارک ہے جس کی شام — یاں سے ہوا جو کوچ تو ہے خلد میں مقام

کوثر پہ آبرو سے پہنچ جائیں تشنہ کام — لکھے خدا نماز گزاروں میں سب کے نام

سب ہیں وحیدِ عصر یہ غل چار سو اٹھے — دنیا سے جو شہید اٹھے سرخ رو اٹھے

انیس کو الفاظ اور ان کے استعمال پر پورا پورا قابو تھا اسی بند کو دیکھئے۔ بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ نگینے جڑے ہوئے ہیں۔ پھر غور کیجئے تو ہر ہر لفظ محل استعمال میں مخصوص معنویت کا حامل ہے۔ چنانچہ پہلے مصرع میں صبح کے ساتھ شام، دوسرے میں کوچ کے بعد مقام، تیسرے مصرع میں کوثر، آبرو اور تشنہ کام، چوتھے میں نام لکھنے کا محاورہ اور بیت میں وحیدِ عصر، شہید اور سُرخ رو کے الفاظ نہ صرف مزا دیتے ہیں، فصاحت و بلاغت کی بہترین مثالیں ہیں بلکہ اسی کے ساتھ معنی و مطالب سے بھی مالا مال ہیں، یہی ایک بند انیس کو خدائے سخن مان لینے کے لئے کافی ہے اردو زبان

کی لطافت، فارسی کی شیرینی، سلاست، تصویر نگاری کی معیاری مثال اور فن شعریت کے جوہر سب کچھ اس ایک بند میں موجود ہیں آیئے اب کسی قدر تفصیل سے مطالعہ کیا جائے۔

نماز صبح کا وقت ہے، امام حسین نے اپنے رفیقوں کو عبادت الٰہی کے لئے آمادہ کیا ہے، سب کی زندگی کا یہ آخری دن ہے۔ یہ بھی بتا چکے ہیں کہ یہ دن جدال و قتال کا ہے اور وہ خود مع اپنے تمام اقارب و انصار کے شہید کر دیئے جائیں گے، ایسی خبریں سننے کے بعد معمولی انسانوں کے دل فطری طور پر دھڑکنے لگتے ہیں۔ لیکن امام کے ساتھی آزمودہ کار مجاہد تھے اور وفا شعاری کا پیکر بھی۔ اُن کی وفا کے چرچے اب تک ہوتے ہیں اور ہمیشہ ہوتے رہیں گے۔ ایسے اصحاب با صفا اور شہسواران میدانِ وغا کو جوش شجاعت دلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کو اگر ہو سکتی تھی تو صرف آنا جانے کی فکر ہوگی کہ اُن کی شہادت کا مآل کیا ہوگا؟ امام نے ان کے اسی تجسس کو پورا کر کے ہر فکر سے آزاد کر دیا۔ فرماتے ہیں۔

آج کی صبح ایسی ہے جس کی شام مبارک ہے یہ قافلہ روانہ ہوگا تو سیدھا جنت میں جائے گا۔ امام حسین اپنے ساتھیوں کو جنت کی بشارت دیتے ہیں اور کچھ دعائیں بھی دیتے ہیں۔ وہ دعائیں یہ ہیں۔ تشنہ کام آبرو کے ساتھ کوثر پہ پہنچ جائیں یعنی یہ کہ یہ سارے رفقاء جو تین دن کے بھوکے پیاسے ہیں آبرو سے کوثر پر پہنچ جائیں۔ پیاسوں کو پانی کی حاجت ہے لہٰذا پانی ملے اور وہ بھی آبرو کے ساتھ۔ آبرو مرکب لفظ ہے آب اور رو سے آب کے معنی پانی ہیں جس کو پیاسوں سے نسبت ہے لیکن اسی مقام پر آب کے معنی 'چمک' ہے جو رو سے مل کر عزت کے معنی میں مستعمل ہے پھر اس دعا میں اس بات کا بھی شائبہ ہے کہ پیاسے اسی طرح پیاسے شہید ہوں اور اپنی آبرو پوری طرح برقرار رکھتے ہوئے کوثر پر پہنچ جائیں۔ اُن کی دوسری دعا یہ ہے کہ میرے ان سب رفیقوں کے نام خدا نماز گزاروں میں لکھے۔ نماز پڑھنا ایک فعلِ حسنہ ہے لیکن نماز گزار ہونا بالکل دوسری چیز ہے۔ اس کا تعلق ایمان ایقان، عقیدہ اور عمل سے ہے۔ نماز گزار ہونے میں بہت سے خصوصیات شامل ہوتی ہیں۔ ہر شخص نماز پڑھتا اور پڑھ سکتا ہے لیکن نماز گزار اسی کو کہیں گے جس کا ایمان مستحکم ہو اور جس کے عمل میں خلوص ہو، انیس نے اس منزل کو اور بلند کر دیا ہے۔ ہم نماز گزار ہو بھی جائیں لیکن یہ ضروری نہیں

کہ خدا بھی ہم کو نماز گزاروں میں شامل کرلے۔ یوں تو سب ہی اس کے بندے ہیں لیکن اُس بندے کا کیا کہنا جس کو خدا خود اپنا بندہ کہے۔ اُسی طرح منزلت اسی نماز گزار کی ہے جس کو خدا نماز گزار مان لے۔ امام نے اپنے رفقا کو یہی دعا دی ہے کہ خدا تم سب کو نماز گزار مانے اور نماز گزاروں کی فہرست میں تمہارے نام لکھے جائیں۔ یہ دعا امام کی زبان سے دلوا کر انیس نے امام اور ان کے رفقا کی سیرت کا بہترین مرقع پیش کیا ہے۔ تیسری دعا جو سلسلۂ بیان کو معراجِ کمال تک پہنچاتی ہے بیت میں ہے۔

اسی مقام پر ضمناً یہ تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ متقدمین سابقین نے مرثیہ گوئی کے لئے کسی مخصوص صنفِ شاعری کا تعین نہیں کیا تھا۔ بعض نے دو مصرعوں کی بیتوں میں، بعض نے مثلث میں اور بعض شعرا نے چار مصرعوں میں قطعات کی شکل میں مرثیے کہے ہیں۔ آخر میں مسدس کی شکل اختیار کی گئی جس کو انیس نے چار چاند لگا دیئے۔ مسدس میں بیت یعنی پانچواں اور چھٹا مصرع کہنا مشکل ہے کیونکہ بیت کی یہ تعریف ہے کہ پہلے چار مصرعوں سے تسلسل اور تیسرے یا چوتھے مصرع سے ربط ہو معنی کے اعتبار سے بیت میں اصل مفہوم معراجِ کمال تک پہنچ جانا چاہیئے۔ انیس کو بیت کہنے میں ملکہ حاصل تھا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کے یہاں جتنی چست اور بلند بیتیں ہیں ان کی مثال کسی دوسری جگہ نہیں ملتی زیر نظر بند کی بیت ہی کو لے لیجئے۔ امام کا اپنے اصحاب کو کوثر پر آبرو کے ساتھ پہنچ جانے اور خدا کا نماز گزاروں میں ان سب کا نام لکھنے کی دعائیں دینے کے بعد کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آگے کیا کہا جا سکتا ہے مگر انیس نے سلسلۂ کلام کو آگے بڑھایا اور بہت بلند کر دیا۔ اس بیت کو پڑھ کر یہ بات سامنے آگئی کہ نجات اخروی کے ساتھ فلاح و نیک نامی دنیا بھی ضروری ہے اور یہ فلاح و نیک نامی صحیح معنوں میں ان کو حاصل ہے جو پاک و پاکیزہ اور عالی مرتبت ہیں۔ امام اپنے اصحاب کو دعا دیتے ہیں کہ تم کو دنیا میں وحیدِ عصر ہونے کی شہرت حاصل ہو اور اس دنیا سے ہر ہر شہید سرخرو اٹھ جائے۔ اب اُن الفاظ کی لذت اور معنویت پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے تا کہ انیس کی فصاحتِ بیانی کا بھی کچھ اندازہ ہو سکے۔

پانچویں مصرع میں "وحیدِ عصر" بجا معنی خیز الفاظ ہیں۔ عصر کے معنی شام ہیں۔ قرآن مجید میں منجملہ دوسری قسموں کے عصر کی بھی قسم کھائی گئی ہے۔ اسی وقت امام حسین درجۂ شہادت پر فائز ہوئے تھے اور

کربلا کی وہ غیر متوازن جنگ جس میں ایک طرف ریگِ صحرا کی طرح دشمنوں کی تعداد لاتعداد تھی اور دوسری طرف امام کے چھوٹے بڑے سب ساتھی صرف بہتر ۷۲ تھے۔ اور جو بظاہر شکست لیکن حقیقتاً فتح تھی اسی وقتِ عصر ختم ہوئی تھی۔ ایسی ساعت کو جتنا بھی محترم قرار دیا جائے صحیح ہوگا۔ انیسؔ نے انہیں حالات کے تحت لفظ "عصر" کو اپنایا اور اصحابِ حسین کو "وحیدِ عصر" قرار دیا عصر کے معنی "زمانہ" بھی ہیں۔ وحیدِ عصر یعنی نایابِ روزگار۔ زمانہ کی بہترین ہستیاں۔ اصحابِ حسین یقیناً اپنی آپ مثال تھے لیکن امام حسین انیسؔ کی زبان میں ان کو یہ دعا دیتے ہیں کہ "سب ہیں وحیدِ عصر یہ غل چار سو اٹھے"۔ فضیلت کی منزل صرف فضیلت مان لینے پر ختم نہیں بلکہ یہ تمنا ہے کہ چار سو اس فضیلت کا اعلان بھی ہو، دنیا بھر میں دھوم مچ جائے اور ایک ایک کی زبان سے یہ بالا اعلان کہا جائے کہ یہ سب وحیدِ عصر ہیں۔ "غل چار سو اٹھے" کی لذت اور چاشنی کے مزے دل لے سکتا ہے۔ زبان بیان کرنے سے قاصر ہے۔ نکونامی اور نکونامی پر دنیا بھر کی مہرِ تصدیق اور پھر اس کا اعلان، ایک مصرع میں معنویت کا سمندر لہریں مار رہا ہے۔

نکونامی کی اس اعلاترین فضیلت پر بھی انیسؔ کا وجدانی ذوق تسکین حاصل نہیں کرتا وہ چھٹے مصرع میں نجاتِ اُخروی کو بھی سمیٹ لیتے ہیں۔ عبادت میں رنگِ شہادت بھرنے کی گلکاری اسی ایک بیت میں پوری تابانی کے ساتھ ضوفشاں ہے۔ امام حسین کی زبان سے یہ دعا کہ "دنیا سے جو شہید اٹھے سرخرو اٹھے" اصحابِ حسین کی سرخروئی کو معراجِ کمال پر پیش کرتی ہے۔ شہید وہ ہے جو خدا کی راہ میں اپنی جان نثار کر دے۔ شہید ہو جانا ہی انسان کی اعلاترین منزلت ہے لیکن اصحابِ حسین کے لئے شہادت کے ساتھ سرخروئی کی فضیلت بھی شامل ہے۔ کیوں کہ امام کی یہی دعا ہے ظاہر ہے کہ جو شہید ہوگا اس کا چہرہ اپنے خون سے یقیناً رنگین ہوگا۔ اس طرح شہید کیلئے سرخرو ہونا لازمی ہے مگر "دنیا سے جو شہید اٹھے" کہہ کر یہ مطلب ادا کیا گیا ہے کہ امام حسین نے اپنے اصحاب کو دنیا میں نکونام اور آخرت میں عالی مرتبت ہونے کی دعائیں دی تھیں ——— فنِ شعر کا یہ کمال ہے کہ مسدس میں ہر مصرع کے بعد دوسرا مصرع بلند اور چست ہوتا جائے۔ یہ بند اس فیصلے کے اعلیٰ ترین کمال کی واضح مثال ہے۔

آخر میں یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ چھٹے مصرع میں لفظ "جو" کا استعمال قابلِ غور اور اس کی معنویت قابلِ لحاظ ہے امام حسین کے ساتھیوں میں جو سب کے سب میدانِ کربلا میں روزِ عاشورہ شہید ہوئے، ان کے فرزند، بھائی، بھتیجے، بھانجے اور دیگر اقرباء کے علاوہ ان کے دوست، اصحاب، انصار سب شامل تھے۔ ان تمام رفیقوں میں مختلف قبیلوں کے نمائندے تھے، متعدد شیوخ اور سردار تھے، کم سن بچے بھی اور بوڑھے بھی، جن میں ایک چھ ماہ کا شیر خوار بچہ بھی تھا اور ایک ایسا بوڑھا مجاہد بھی جس نے میدانِ جنگ کا رخ کرنے کے قبل اپنی آنکھوں کے اوپر سے پلکیں اٹھا کر ماتھے پر پٹی باندھی اور جھکی ہوئی کمر کو پٹکے سے خوب کس کر باندھا تھا، تب اس قابل ہوا تھا کہ گھوڑے کی پشت پر سوار ہو سکے۔ اس بہتر افراد پر مشتمل مختصر سپاہ کے لیڈر امام حسین تھے جن کی نظر میں دنیا کے تمام انسان بحیثیت انسان کے برابر کا درجہ رکھتے تھے اور جو اپنے رفقا میں بلا امتیازِ نوع و نسل، بلا تفریقِ مذہب و ملت اور بلا لحاظ سن و سال سب ہی سے یکساں طور پر محبت فرماتے تھے۔ امام کے اس نظریئے اور اس طریقِ کار کی وضاحت انیس نے اپنی سحر بیانی سے صرف ایک لفظ "جو" استعمال کر کے پوری طرح فرما دی۔ "دنیا سے جو شہید اٹھے" کی میزان میں ہر شہید امام کی دعاؤں سے فیضیاب ہونے کا یکساں طور پر مستحق قرار پاتا ہے۔ ایک لفظ "جو" میں خیالات اور نظریات کی دنیا کھینچ کر آ گئی ہے۔

امام اپنے اصحاب کو فریضۂ سحری کی ادائی پر جب اسطرح آمادہ کرتے ہیں تو ان نیک نہاد اور پاکباز ساتھیوں کا تذکرہ بھی شاعر کے لئے ضروری ہو جاتا ہے انیس اس مقام پر اصحاب حسین کی نماز کے لئے تیاری اور خود ان کے کردار و اوصاف بیان کرتے ہیں۔ فرد ہو یا جماعت روشناس کرانے کے لئے وضع قطع، لباس و پوشاک، رفتار و گفتار، صورت و سیرت اور طور طریقوں کی ترجمانی ضروری ہوتی ہے۔ ان تمام لوازمات کو مندرجہ ذیل پانچ بندوں میں پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔

(۴) یہ سن کے بستروں سے اٹھے وہ خدا شناس — اک اک نے زیبِ جسم کیا فاخرہ لباس
شانے محاسنوں میں کیے سب نے بے ہراس — باندھے عمامے، آئے امام زماں کے پاس
رنگیں عبائیں دوش پہ، کمریں کسے ہوئے

مشک و زباد و عطر میں کپڑے بسے ہوئے

(۵) سو کھے لبوں پہ حمد الٰہی رخوں پہ نور   خوف و ہراس و رنج و کدورت دلوں سے دور
فیاض، حق شناس، اولوالعزم، ذی شعور   خوش فکر و بذلہ سنج و ہنر پرور و غیور
کانوں کو حسن صوت سے حظ وافر ملا ملے
باتوں میں وہ نمک کہ دلوں کو مزا ملے

(۶) ساونت، بردبار، فلک مرتبت، دلیر   عالی منش، سبا میں سلیمان، وغا میں شیر
گردانِ دہر ان کی زبردستیوں سے زیر   فاقوں سے تین دن کے مگر زندگی سے سیر
دنیا کو ہیچ و پوچ سراپا سمجھتے تھے
دریا دلی سے بحر کو قطرہ سمجھتے تھے

(۷) تقریر میں وہ رمز و کنائے کہ لاجواب   نکتہ بھی منہ سے گر کوئی نکلا تو انتخاب
گویا دہن کتابِ بلاغت کا ایک باب   سوکھی زباں شہد فصاحت سے کامیاب
لہجوں پہ شاعرانِ عرب تھے مرے ہوئے
پستے لبوں کے وہ کہ نمک سے بھرے ہوئے

(۸) لب پر ہنسی گلوں سے زیادہ شگفتہ رو   پیدا تنوں سے پیرہن یوسفی کی بو
غلمان کے دل میں جن کی غلامی کی آرزو   پرہیزگار، زاہد و ابرار و نیک خو
بہتر میں ایسے لعل صدف میں گہر نہیں
حوروں کا قول تھا یہ ملک ہیں بشر نہیں

انیسؔ نے اصحابِ حسینؑ کی خدا پرستی کی طرف خدا شناس کہہ کر اشارہ کیا ہے اور "بستروں سے اٹھے" کہہ کر ان کے اطمینان قلب کی مکمل تصویر پیش کر دی ہے۔ شب قتل ختم ہوئی تھی اور شہادت کا دن آگیا تھا۔ ان حالات میں بستروں پر آرام سے لیٹ جانا ہی اطمینانِ قلب ثابت کرنے کے لئے کافی تھا ان لوگوں کو امام نے یہ کہہ کر دعا دی ہے کہ "دنیا سے جو شہید اٹھے سرخرو اٹھے" اس دعا کا مستجاب

ہونا لازمی تھا اس لئے اصحاب میں ظاہری طور پر بھی سکون و اطمینان کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ وہ بستروں سے اٹھ کر فاخرہ لباس پہنتے ہیں "فاخرہ" سے مراد قیمتی لباس نہیں ہے بلکہ وہ پوشاک ہے جو بظاہر پاک و پاکیزہ تھی اور ساتھ ہی ان کی دلی مسرتوں کو بھی نمودار کر رہی تھی۔ جسم پر لباس پہن لینے کے بعد داڑھیوں کو کنگھی کر کے سنوارا جاتا ہے۔ عرب والوں کے لئے میدان جنگ میں داڑھیاں بہت زیادہ کارآمد ہوتی تھیں بوقت الضرورت کوئی ہاتھوں سے اور کوئی دانتوں میں داڑھی دبا لیتا تھا۔ انیس نے اس موقع پر بے ہراس کہہ کر یہ واضح کیا ہے کہ یہ لوگ ایسے نہیں تھے جو میدان میں جا کر ڈر جائیں، یہ صرف اس لئے داڑھیاں سنوار رہے تھے کہ ان کو دانتوں میں دبا کر اپنی شجاعت کے جوہر دکھائیں گے اس کے بعد یہ لوگ عمامے باندھتے اور امام کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں لیکن کس شان سے؟ کاندھوں پر رنگین عبائیں پڑی ہیں جہاد کے لئے کمریں کسے ہوئے ہیں لیکن اس مرنے کی آمادگی پر بھی اُن کے کپڑے بہترین خوشبوؤں میں بسے ہوئے ہیں۔ انہوں نے یہ خوشبو اسی وقت استعمال نہیں کی تھی بلکہ ان کے کپڑے پہلے سے بسائے گئے تھے یعنی یہ کہ یہ تیاری قبل ہی سے کر لی گئی تھی۔ اس بند کی بیت یہ خیال پیش کرتی ہے کہ اصحاب کو مرنے کی خوشی تھی، وہ روز قتل کو عید سمجھ رہے تھے اسی لئے رنگین عبائیں کاندھوں پر ڈالے اور خوشبوؤں میں بسے کپڑے زیب جسم کئے ہوئے تھے۔ اسی مرثیہ میں آگے چل کر ایک بند کا چھٹا مصرعہ یہ ہے کہ "باہم معانقے تھے کہ مرنے کی عید تھی" اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جس خیال کی ابتدا یہاں ہوئی تھی اُسی کا تکملہ اس مصرع میں ہوتا ہے اور ایک کیفیت کی مکمل ڈرامائی تصویر ہماری آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔

اس ظاہری نمود کا تذکرہ ہونے کے بعد ان کے کردار اور اطوار بیان کر دینا بھی ضروری تھا یہ لوگ امام حسین کے ایسے جلیل القدر بزرگ کے مخصوص دوستوں میں ہیں لہٰذا فطری طور پر ان میں بھی امام ہی کی سیرت کا پر تو پڑنا ضروری تھا، بالخصوص ایسی حالت میں جب امام نے اُن کو "رفیقوں" کے لقب سے یاد کیا تھا، چنانچہ انیس انھیں محاسن و محامد کا ذکر کرتے ہیں تین دن کی بھوک پیاس میں لبوں پر حمد الٰہی اور چہرہ پر نور ہے، دل ان کے تمام بری خصلتوں سے پاک و صاف ہیں، عادتیں سب ذی جاہ

جو ایک بلند کردار، خوش اطوار اور رہ اولوالعزم انسان میں ہونا چاہئے، سب سے بڑھ کر یہ فضیلت ہے کہ اُن کے تمام اطوار رفتار و گفتار سب پسندیدہ ہیں۔ اور یہی پسندیدہ خصائل شرافت اور انسانیت پر دلالت کرتے ہیں اور چونکہ ان تمام اچھے خصائل کے حامل ہیں اور ان میں خوش گفتاری کی بھی صلاحیت ہے اس لئے سننے والوں کے کانوں کو برملا حظ ملتا ہے اس بند میں اصحابِ حسین کے جو خصائل بیان کئے گئے ہیں وہ سب ایسے ہی ہیں جو رفقائے حسین میں مجتمع ہونا ضروری تھے۔ انیس نے اپنے جلیل القدر ہیرو کے ساتھیوں کی تعریف بھی ویسی ہی کی ہے جیسا کہ ان کو حقیقتاً ہونا چاہئے۔ کردار نگاری اور سیرت عکاسی کی یہ بند بہترین مثال ہے۔ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ انیس نے مرثیہ میں ڈرامائی انداز شامل کر کے اس صنف کلام میں رزمیہ شاعری کے تمام خصوصیات شامل کر دیئے تھے۔ انھیں خصوصیات میں سیرت نگاری کو بڑی اہمیت حاصل ہے

رزمیہ شاعری میں ہیرو کی مرتبت قدم قدم پر ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دوسرے بند میں امام حسین نے اپنے رفقا کو "غازیو" کے لقب سے یاد کیا تو چھٹے بند میں ان غازیوں کی مکمل تصویر پیش کر دینا بھی لازمی قرار پایا۔ امام حسین کے اصحاب جری اور بہادر بھی تھے۔ اور ان کے کردار بھی بہت بلند تھے۔ ان تمام مراتب کو پیش نظر رکھ کر ان کا بیان ہونا ہے، ان کو شجاع، جری اور بہادر کی حیثیت سے انیس سامنے لاتے ہیں لیکن اس کا پوری طرح لحاظ رکھتے ہیں کہ شجاعت کی صفت مقام مدح تک محدود ہو اور اس میں کسی قسم کی بے اعتدالی کا شائبہ نہ آنے پائے یعنی یہ کہ شجاعت کا دامن تہور کے داغ سے پاک و صاف ہے لہٰذا "غازیوں" کی تعریف میں اُن کو سادت، دلیر وغا میں شیر بتانے کے علاوہ جہاں یہ کہا کہ "گردان دہر اُن کی زبردستیوں سے زیر" تو اسی کے ساتھ "بردبار، فلک مرتبت، عالی منش، سباہیں سلیمان کے ایسے اوصاف پیش کر کے مقام شجاعت کو بلند سے بلند تر کر دیا۔ پھر یہ بات تو تمام دوسری فضیلتوں سے بھی کہیں زیادہ اہم تھی کہ یہ ہمراہان خستہ ہجا امام حسین کے ساتھ اور ایمان کے اعلاترین درجہ پر فائز ہیں۔ اس عظیم ترین فضیلت کی وضاحت چھٹے بند کے آخری تین مصرعوں میں ہو جاتی ہے یعنی یہ کہ تین روز سے فاقوں میں ہیں مگر نیتوں کے سیر ہیں اور جب کوئی

خواہش نہیں ہے تو یہ لوگ "دنیا کو ہیچ و پوچ سراپا سمجھتے ہیں" اور جب فلک رتبت ہیں تو بحر کو قطرہ سمجھنا بھی آسان ہے ظاہر ہے کہ دریا دلی کے آگے بحر کو قطرہ سمجھنا کوئی دشوار بات نہیں چوتھے مصرع کی مناسبت سے بیت اور دریا دلی کے ساتھ بحر و قطرہ کا لگاؤ انتہائی حسین و دلکش طرز بیان ہے جس پیرائیں کو معراج کمال حاصل ہے۔

کہا جاتا ہے کہ انسان کا کردار اس کی گفتگو سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ اصحاب حسین کے طرز تکلم کے بارے میں پہلے یہ کہا تھا کہ "باتوں میں وہ نمک کہ دلوں کو مزا ملے" مگر کچھ ایسا پتہ چلتا ہے کہ اتنا ہی کہہ دینے سے انیس کے فکر و نظر کو سیری نہیں ہوئی لہٰذا ایک علیحدہ بند صرف لہجہ اور طرز تکلم کے بارے میں کہہ ڈالا اور اس ذیل میں جتنی خوبیاں ہوتی ہیں ان سب کو انتہائی اختصار کے ساتھ حسین ترین پیرایہ میں پیش کر دیا ہے۔ یعنی یہ کہ اُن کی تقریریں لاجواب رموز کنائے ہیں۔ اور جب اس انداز کی گفتگو ہو تو ہر نکتہ جو منہ سے نکلے انتخاب ہونا ہی چاہیئے۔ اس صفت کے حامل کا ذہن کتاب فصاحت کا ایک باب کہلانے کا ہی مستحق ہوتا ہے لیکن انیس نے اس مقام پر بھی ان کی پیاس کو یاد کر کے اپنا زور کلام دکھلا دیا جس کو ہم شاعری کا معجزہ کہنے پر مجبور ہیں۔ بات کرنے والے پیاسے ہیں ان کی زبانیں خشک ہیں مگر شاعر ان کی شیریں زبانی دیکھ کر ان سوکھی ہوئی زبانوں کو بھی تر محسوس کرتا ہے اور وہ تری اس کی نظر میں شہد فصاحت سے کامیابی کا نتیجہ ہے۔ اس بلندی خیال تک ہر شاعر کے پر پرواز نہیں پہنچ سکتے۔ یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ ان رفیقوں کی باتوں کا ذکر اوپر بھی ہو چکا ہے۔ مگر وہاں یہ کہا گیا تھا کہ "باتوں میں وہ نمک کہ دلوں کو مزا ملے" یہ تعریف مزے کی ہے لیکن نمکینیت میں عظمت کا شائبہ بہت کم ہے۔ اس کمی کو اس بند کی بیت میں ماحیانِ زبان سے مقابلہ کر کے پورا کر دیا ہے شاعرانِ عرب کو اپنے زبان و بیان پر ناز تھا لیکن ان لوگوں کے طرزِ تکلم میں وہ بات تھی کہ شاعرانِ عرب بھی ان کے لہجوں پر مرے ہوئے تھے۔ وہ بھی اِن لوگوں کے طرزِ گفتار پر فریفتہ تھے اور اُس کی جلالتِ قدر کا احترام کرتے تھے۔ یہاں تک تو کوئی فنکاری نہیں تھی لیکن انیس لکھنؤ کی تہذیب و نفاست کے نمائندے تھے۔ یہاں نزاکت و لطافت کو زندگی کے ہر شعبہ میں دخل تھا اس لئے شاعرانِ عرب کے مخصوص طرز ادا پر ان کی فکر رسا قناعت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ان

اصحاب حسین کے لبوں کو جن سے کلام کے چشمے پھوٹتے تھے پستوں سے متابہ قرار دیتے ہیں۔ اور پستے بھی وہ جو نمک سے بھرے ہوئے تھے، نزاکت، نفاست، رنگینی اور نمکینیت سب کو ایک مصرع میں جمع کر دیا ہے۔ سچ پوچھیے تو یہی نمکینی وفصاحت کی جان ہے۔ انیس نے خود اپنی تعریف میں ایک دوسرے مرثیہ کا مطلع اس طرح نذر درج کیا ہے کہ" نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری"

اس تمام سیرت نگاری کے بعد فنکاری کا یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ آخری جملہ میں ان تمام اوصاف کا فشردہ انتہائی اجمال لیکن پوری وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا جائے چنانچہ آٹھواں بند اسی خصوصیت کا حامل ہے۔ ساتھ ہی ساتھ شعریت ایک ایک مصرع بلکہ ایک ایک لفظ میں کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے پہلا مصرع شباہت کا جمیل وحسین مرقع ہے دوسرے مصرع میں خوشبوؤں میں بسے ہوئے لباس اور معطر جسم کی یاد تازہ کرائی ہے۔ چوتھے مصرع میں انصار حسین کی پاکیزگی کو پیش کیا ہے اور یہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں کا جواب زمین و آسمان میں کہیں پیدا نہیں ہوا پتھر نے ایسے لعل اور صدف نے ایسے گہر کبھی پیدا نہیں کئے۔ فلک مرتبت ایسے ہیں کہ غلماں کے دلوں میں ان کی غلامی کی آرزو ہے اور حوریں یہ کہتی ہیں کہ یہ لوگ حقیقتاً فرشتے ہیں ان کو انسان نہیں سمجھنا چاہیے حقیقت امر یہ ہے کہ یہ بند اجمال و وضاحت کی تمام خوبیاں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے متذکرہ بالا پانچوں بند سیرت نگاری کے کمال میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فنکاری میں یہ سلیقہ انیس کے علاوہ اور کسی کو نصیب نہیں ہوا۔

اسی مقام پر آگے کے دو بند اور پیش کر دینا ہمارے تبصرہ میں مزید لطف پیدا کرنے کا موجب ہوگا۔ امام نے اپنے اصحاب کو مخاطب کر کے یہ فرمایا تھا کہ" اٹھو فریضۂ سحری کو ادا کرو" لہٰذا ڈرامائی تسلسل برقرار رکھنے کے لئے اس فریضۂ سحری کی تیاری کا تذکرہ بھی ضروری قرار پاتا ہے۔ فریضۂ سحری سے مراد نماز صبح ہے اور نماز کی تیاری وضو کی شکل میں ہوتی ہے۔ یہاں پانی نہیں تھا اس لئے وضو کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لہٰذا انصار حسین نے وضو کا بدل تیمم کیا تھا اسی تیمم کی خاک ان کے چہروں پر بھری ہوئی تھی اور وہ اسی حالت میں امام کے سامنے آئے تھے۔ اس لئے

انیس نے اس واقعہ اور اس کیفیت کو بھی اصحاب کی سراپا نگاری کا جزو قرار دیا اور بجا طور سے قرار دیا لیکن یہ بات کہنے میں ضرور آتی ہے کہ اس سراپا نگاری میں بھی پیکر تراشی کا اسلوب پوری طرح برقرار ہے جو انیس کے ایسے عدیم المثال شاعری کا طرۂ امتیاز ہو سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

(۹) پانی نہ تھا وضو جو کریں وہ فلک مآب   پر تھی رخوں پہ خاک تیمم سے طرفہ آب
باریک ابر میں نظر آتے تھے آفتاب   ہوتے ہیں خاکسار غلامِ ابو تراب

مہتاب سے رخوں کی صفا اور ہو گئی
مٹی سے آئینوں میں جلا اور ہو گئی

(۱۰) خیمے سے نکلے شہ کے عزیزانِ خوشخصال   جن میں کئی تھے حضرتِ خیر النسا کے لال
قاسم سا گلبدن علی اکبر سا خوش جمال   اک جا عقیل و مسلم و جعفر کے نونہال

سب کے رخوں کا نور سپہر بریں پہ تھا
اٹھارہ آفتابوں کا غنچہ زمیں پہ تھا

بات صرف اتنی کہی ہے کہ ان آسمان مرتبت لوگوں کو پانی نصیب نہیں تھا لہٰذا انھوں نے تیمم کیا، اس تیمم کی خاک سے ان کے چہروں پر چمک آگئی اور ان کے چہرے خاک کی پرت کے نیچے آفتاب کی طرح دمک اٹھے اور ان آئینہ وار چہروں میں جو چاندنی کی طرح روشن تھے مٹی کے مس ہو جانے سے اور زیادہ جلا ہو گئی لیکن یہ خیال جن لفظوں میں ایک مخصوص ترکیب کے ساتھ ادا کیا گیا ہے وہ خود اپنی جگہ پر جواہرات کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ پہلے مصرع میں فلک مآب کہہ کر آفتاب، مہتاب اور روشنی کا تخیل قاری کے ذہن میں اجاگر کیا۔ پھر خاکِ تیمم سے رخوں پر آب آنے کا نقشہ پیش کر کے دفعتاً چہرہ کو "طرفہ آب" کے وسیلہ سے آفتاب قرار دیا۔ آفتاب کے مقابلہ میں خاک بہرحال ایک پست چیز ہے اور انصارِ حسین کے لئے پستی کا تخیل بھی ذہن میں نہیں آسکتا۔ لہٰذا ان کے خاک آلودہ چہرہ کی عزت ظاہر کرنے کے لئے یہ بات کہنا ضروری ہوئی کہ ابو تراب کے غلام خاکسار ہوتے ہیں۔ ابو تراب یعنی مٹی کا باپ جو حضرت علی کا لقب تھا۔

اور رسولِ اسلام نے اُن کو تفویض کیا تھا۔ امام حسین علیؑ کے بیٹے اور رسول کے نواسے تھے۔ لہٰذا یہ چوتھا مصرع ان انصار کو خاکسار ہوتے ہوئے بھی فلک مآب قرار دیتا ہے اب انھیں چار مصرعوں کی ربط سے بیت ہے اور ایسی بیت ہے جس نے پورے بند کے مجموعی لطف کو دوبالا کر دیا۔ نشستِ الفاظ کا جائزہ لیجئے تو فلک مآب، خاک، تیمّم، طرفہ آب، باریک ابر، آفتاب، خاکِ زر، غلامِ ابوتراب، مہتاب، صفا، مٹی، آئینوں، جلا، کے سارے الفاظ ایسی ظاہری اور معنوی مناسبت رکھتے ہیں جس کو شعریت کی جان بلکہ شعریت ہی کہنا پڑتا ہے۔ انیسؔ نے ان الفاظ کو ایک دوسرے سے ربط دے کر اس طرح جڑ دیا ہے کہ اس کو مرصع سازی ہی کہا جا سکتا ہے۔

رفقائے حسین نمازِ صبح کے لئے حاضر ہیں امام نماز پڑھاتے ہیں اس باجماعت نماز میں عزیزوں کا شامل ہونا ضروری ہے چنانچہ وہ بھی خیمہ سے نکل کر آتے ہیں۔ اس مقام پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ امام کا اپنے اصحاب سے تخاطب تین بندوں میں نظم کیا گیا ہے پھر اس کے بعد رفقار کا تذکرہ چھ بندوں میں آتا ہے لیکن اعزاو کے بارے میں صرف ایک بند پر اکتفا کی گئی۔ یہ اعتراض بظاہر وسیع ہے۔ لیکن اس بند کے اجمال میں معنویت پر غور کیجئے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ انیسؔ نے جو کچھ کہہ دیا اُس سے زیادہ تفصیل بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ انھوں نے پہلے مصرع میں "عزیزانِ خوشخصال" کہکر ان گرانقدر ہستیوں کا تعارف کرایا۔ دوسرے مصرع میں "خیر النساءؑ کے لال" یعنی رسول کی پیاری بیٹی فاطمہ زہراؑ کی اولاد کہکر انکی پیدائشی بزرگی اور عصمت کیطرف اشارہ کیا اور چوتھے مصرع میں "عقیل و مسلم و جعفر کے نونہال" فرماکے ان بزرگوں کی عظمت، شجاعت اور ان تمام خوبیوں کا مالک ٹھہرایا جو عقیل و مسلم و جعفر کی میراث تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ "نونہال" کہکر یہ بھی ظاہر کر دیا کہ ان عزیزوں میں کمسن بچے بھی تھے۔ خیر النساءؑ کے دو فرزند گرامی امام حسنؑ اور امام حسینؑ تھے۔ ان دونوں کے ایک ایک صاحبزادے یعنی قاسم اور علی اکبر کے نام تیسرے مصرع میں آتے ہیں قاسم کا سن نو برس اور علی اکبر کی عمر اٹھارہ برس کی تھی دونوں خانوادۂ رسالت کے چشم و چراغ بالخصوص امام حسینؑ کے صاحبزادے علی اکبر ہو بہو رسولِ اسلام

کی تصویر تھے ۔ ان دونوں نوجوانوں کے حسن و جمال کی تفصیل صرف ایک لفظ "سا" میں اتنی فصیح و بلیغ ہے کہ اس کا جواب ہی نہیں ہو سکتا ۔ غالباً اس سے بہتر یا اس سے زیادہ کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا تھا' اور کچھ زیادہ کہا جائے تو وہ محض فاضل ہوگا ۔ یہ سب بزرگ جن کا رشتہ رسول سے تھا اور جو امام حسین کے "عزیزانِ خوشخصال" میں داخل تھے مجموعی طور پر صرف اٹھارہ تھے بیت میں انھیں اٹھارہ عزیزوں کا تذکرہ ہے جن میں ہر ایک کو آفتاب سے تشبیہ دی اور ایک ایک کو پنکھڑی قرار دے کر ایک حسین و جمیل غنچہ تیار کیا ہے جو زمین کو اپنی مہک سے معطر کر رہا تھا اور آسمان پیران کا نور صعود کر رہا تھا

اس تمام تجزے اور تبصرے کا نتیجہ یہ ہے کہ انیسؔ کے یہاں تفصیل میں اجمال' اجمال میں تفصیل' تشبیہات و استعارات میں مناسبت لفظی' تخیل کی بلندی' طرزِ ادا میں بلا کی خوبی' بندش الفاظ و چستی بیان' محاکات و معنویت اور سب سے بڑھ کر لحاظِ مراتب اور سیرت نگاری کی خوبیاں اتنی بہتات سے ملتی ہیں جن کی مثال ہم کو کسی عظیم ترین غزل گو یا قصیدہ گو شاعر کے یہاں بھی نہیں ملتی ہیں مندرجہ بالا دس اشعار کا دقیق مطالعہ ہی ہم کو انیسؔ کی فنی عظمت و کمال کے آگے سر جھکا دینے پر مجبور کر دیتا ہے ۔

عروج کی تین مجلسیں

اس حقیقت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ میر انیس مرحوم نے مرثیہ گوئی کے فن اور مرثیہ خوانی کے ہنر کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا تھا۔ انھوں نے اس صنف سخن کو جو رسمی رجز خوانی اور بینیہ بیان تک محدود تھی۔ رزم و بزم، ابر و بہار، فنکاریوں اور جلوہ طرازیوں کے بہترین حسین جواہرات سے آراستہ و پیراستہ کر دیا اسی طرح مرثیہ خوانی میں مصوری و نقاشی کے عدیم المثال نمونے دنیا کے سامنے پیش کئے تھے۔ اُن کے اٹھ جانے کے بعد بھی ایک مدت تک انھیں کا فیض اُن کے اخلاف میں نمایاں رہا اور کم سے کم نصف صدی تک یہ حضرت مجلس ذمبر کی زینت بنے رہے انیس کے بعد ان کے فرزند ارجمند میر خورشید علی نفیس نے اپنے پدر عالی مقدار کا نام برقرار رکھا۔ میر نفیس مرحوم نے بحر محنت میں مرثیے کہہ کر زورِ کلام کا مظاہرہ کیا اپنی علمی قابلیت کو نمایاں کر کے اس سنگلاخ میدان کو سر کیا اور اپنی فطری جسمانی طاقت کے بل بوتے پر خواندگی کے ایسے مظاہر کئے جن کی مثال پھر کہیں نہیں ملی۔ انھوں نے بیسوی صدی کے اوائل میں انتقال فرمایا اور مرثیہ خوانی کے فن کو زندہ رکھا۔

عارف مرحوم اپنی زبان و بیان کے طرز میں انیس کے حقیقی معنوں میں جانشین تھے۔ لیکن اُن کا مخصوص طرۂ امتیاز ان کے پڑھنے کا طریقہ تھا جس کے وہ خود ہی موجد تھے۔ انھوں نے مرثیہ پڑھنے میں "بتلانے" کا چلن رائج کیا تھا۔ جسمانی اشاروں سے مصوری فرماتے

تھے اور سامعین کو چشم و ابرو سے مسحور کر لیتے تھے۔ ان کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے مرثیہ میں "ساقی نامہ" کہنے کا دستور ایجاد کیا تھا۔ لڑائی کا منظر بیان کرتے ہوئے مقام جنگ میں ساقی نامہ بے حد خوبی کے ساتھ نظم کرتے تھے۔ بڑی محفلوں میں اسی ساقی نامہ پر مجلس ختم کر دیا کرتے تھے اور اسی مقام کو سننے کے لئے بہت سے سامعین ہمہ تن مشتاق رہتے تھے۔ عارف صاحب ایک بلند پایہ شاعر ہونے کے علاوہ جید عالم اور فقیہ بھی تھے۔ تفسیر قرآن اور احادیث پر بہت اچھی دستگاہ تھی۔ طبیعت میں نفاست اور بہت سے کمالات کے مالک تھے۔ ان کا کلام اور پڑھنا بھرپور شباب پر تھا کہ دفعتاً حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب سے ۱۹۱۶ء میں انتقال فرمایا ان کے بعد ممبر مجلس پر دولھا صاحب عروج مہر درخشاں کی طرح جلوہ گر ہوئے۔

سید خورشید حسین عرف دولھا صاحب المتخلص بہ عروج، میر نفیس مرحوم کے صاحبزادے تھے لیکن اپنے والد محترم کی حیات میں مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی طرف انہوں نے کوئی خاص توجہ نہیں فرمائی ان کو بعض دوسرے فنون لطیفہ سے قلبی لگاؤ تھا۔ اور ان کا زیادہ وقت انہی مشاغل میں صرف ہوتا تھا۔ اپنے والد مرحوم کے انتقال کے بعد انہوں نے اس میدان میں قدم رکھا مرثیے کہے اور پڑھے حضرات لکھنؤ نے جو شعر و ادب پر گہری نظر رکھتے تھے بلا تاخیر فیصلہ کر لیا کہ عارف صاحب مرثیہ کہہ دیتے ہیں اور دولھا صاحب اسی کو ممبر پر پڑھ دیتے ہیں مرثیہ کی خوبیوں اور کلام کی پختگی و بلندی کی تعریفیں ہوتی تھیں۔ مگر تعریفوں کا سہرا عارف مرحوم کے سر ہی باندھا جاتا تھا۔ عارف مرحوم ان بے محل تعریفوں سے زچ ہوتے تھے لیکن کوئی موثر تدبیر ان کے امکان میں اس لئے نہیں تھی کہ سامعین اپنے فیصلے پر اٹل تھے۔ اور وہ خود غیر معمولی طور پر خاموش طبیعت کے برگزیدہ انسان تھے۔ یہاں تک کہ ان کا قبل از وقت انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات کے بعد عروج کے جوہر دیکھ کر چمک اٹھے اور سننے والوں کو یقین آ گیا کہ عروج نے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میراث میں پائی ہے۔ ان کی معجز بیانی اور سحر طرازی کرامت وہبی ہے۔ اکتسابی نہیں ہے۔

عروج نے انیس کی شیریں زبانی، سلاست و روانی اور طرز ادا کی تمام خوبیاں اپنے

حقیقی ورثہ میں پائی تھیں۔ اپنے والدِ محترم میر نفیس کے مخصوص فنی کمالات بھی ترکہ میں پائے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے پیش نظر عارف مرحوم کے ساقی نامے اور مرثیہ خوانی میں تبلانے کی فنکاریاں بھی تھیں۔ اس تمام ماحول و وراثت کے یہی اثرات ہونا بھی چاہئیے تھے کہ عروج مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں ایک بلند پایہ فنکار کے مرتبے پر پہنچ گئے۔ ان کے کلام میں جا بجا انیس کی سادگی زبان اور بے ساختگی بیان کے نمونے ملتے ہیں۔ خیالات کی وسعت و بلندی میں بزرگوں کی تقلید نظر آتی ہے۔ مرثیہ پڑھتے وقت ان کے اعضاء و جوارح کی حرکت اور قدرت اور آواز کی بلندی کی بدولت نفیس کے برسرِ منبر ہونے کی تصویریں سامعین کی آنکھوں کے سامنے آجاتی تھیں۔ ساقی نامہ بھی خوب خوب کہے گئے اور تبلاتے کے طرز میں عارف کی تمام خوبیاں پوری طرح اپنالی تھیں۔ حقیقت امر تو یہ ہے کہ دولہا صاحب عروج نے بزمِ مجلس کو پوری طاقت کے ساتھ روشن رکھا تھا اور اپنی زندگی بھر اپنے بابا نفیس اور دادا انیس کی یاد تازہ رکھی۔ ان کی مجلسوں میں بلا تفریق مذہب و ملت ایک کثیر مجمع ہوتا تھا۔ اردو کے پرستار ان سے زبان و بیان سے لطف اندوز ہوتے۔ ادیب و شاعر سخن دانی اور کمالِ فن کی داد دیتے اور جو جاہل ہوتے وہ بھی دولہا صاحب کے نام پر ان کو دیکھنے اور ان کو سننے مجلسوں میں جمع ہو جایا کرتے تھے۔ عروج کے پڑھنے کی آخری مجلسوں میں ایک مجلس تاریخی اہمیت کی حامل تھی۔ یہ مجلس سید ابو محمد صاحب مرحوم نے پبلک سروس کمیشن یو۔ پی سے سبکدوش ہونے کے بعد امام باڑہ آصفی میں منعقد کی تھی۔ مجلس کے رقعے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں علیحدہ علیحدہ شائع ہوئے تھے۔ امام باڑہ کے وسیع ترین ہال مجمع کی کثرت سے چھلک رہے تھے۔ دولہا صاحب کی عمر بھی ستر برس کے قریب تھی لیکن انہوں نے بھرپور شباب کے تیوروں سے حضرت قاسم کے حال کا مرثیہ پڑھا تھا۔ شہر لکھنؤ میں یہ مجلس یادگار سمجھی جاتی تھی اور اس کو یاد کر کے راقم کے ایسے شعر و ادب اور طرزِ خوانندگی کے پرستار مدتوں سر دھنتے رہے تھے۔ ان پرستاروں میں بکثرت ہندو اور عیسائی صاحبان کے علاوہ بعض اینگلو انڈین

بھی تھے ـــــــ

شعر و ادب کا پرستار اور خاندانِ انیسؔ کا دلدادہ ہوتے ہوئے راقم نے دولہا صاحب عروؔج کی پڑھنے والی بکثرت مجلسوں میں شرکت کی تھی لیکن ان میں تین مجلسیں ایسی تھیں جن کے تاثرات کو وقت بھی نہیں بھلا سکا اور اُن کے نقشے اب تک حافظے کے افق پر ابھرتے رہتے ہیں۔ ان میں کی پہلی مجلس اپنے عنفوانِ شباب میں بمقام امام باڑہ جواہر علی خاں فیض آباد کی تھی۔ اس وقت وہ بھی جوان تھے۔ یہ مجلس انہوں نے عارفؔ صاحب مرحوم کی حیات میں پڑھی تھی۔ دونوں بزرگ ایک ساتھ فیض آباد تشریف لے گئے تھے۔ ایک روز قبل عارفؔ صاحب نے اجودھیا میں مجلس پڑھی تھی۔ دوسرے روز عروؔج امام باڑہ مذکور میں رونق افروز ممبر ہوئے تھے۔ اس زمانہ میں مجھے انیسؔ کے اُس مرثیے کا جس کا مطلع ہے "نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری" ابتدائی نصف حصہ قریب قریب حفظ تھا۔ عروؔج نے غالباً اسی مرثیہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مرثیہ کہا تھا جس کا مطلع تھا "عندلیبِ چمنستانِ فصاحت ہوں میں" انیسؔ نے مرثیہ کے چہرہ میں اپنے بزرگوں کی ثنا خوانی کی ہے۔ عروؔج نے بھی بجا طور پر اپنے آباء کو سراہا ہے اور اس مقام پر انیسؔ کا رنگ پوری طرح برقرار رکھا ہے۔ مقام مفاخرت میں کہتے ہیں "پھول اب تک تو چنا کرتے ہیں چننے والے" اسی منزل مباہات میں جب یہ احساس ہوتا ہے کہ زبان دیان کا حق ادا نہیں ہوا اور انیسؔ کی برتری یاد آجاتی ہے تو یہ فرماتے ہیں کہ

اُن کے دم تک تو بہت کچھ تھا یہ گلشن آباد ۔۔۔ اب بھی پھر فضلِ خدا سے نہیں ایسا برباد

انیسؔ ہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے انہیں کی زبان میں فرماتے ہیں ایک بند کا چوتھا مصرع اور بیت یہ ہے :۔

بلبلیں لیتی تھیں آ آ کے گلستاں کا سبق

مدح شہ سننے کو آتی تھیں جو گلزار دں سے ۔۔۔ ورقِ گل پہ لکھا کرتی تھیں منقاروں سے

"بلبلیں پھول گرا دیتی تھیں منقاروں سے" کا کوئی جواب اگر ہو سکتا ہے وہ اسی بیت میں

ملتا ہے ــــــ

اس تشبیب کے بعد گریز ہے اور اصل مرثیہ کی طرف آتے ہیں۔ اس مقام کے دو بند مثالاً پیش کئے جاتے ہیں۔

خودستائی مجھے منظور نہیں ہے زنہار | اصل جو امر تھا میں نے وہ کیا ہے اظہار
میں کوئی شے نہیں اسکا ہے مجھے خود اقرار | پر خدا کو تو کوئی امر نہیں ہے دشوار

گو کہ ناچیز تھا اک ذرۂ بے قدر تھا میں
اس کی ادنیٰ نظر مہر ہوئی بدر تھا میں

سنئے اب حال شہنشاہِ امم تھوڑا سا | مل کے ہم آپ کریں شاہ کا غم تھوڑا سا
قتل سادات ہوں کیا ہے یہ ستم تھوڑا سا | پانی چوبیس پہر ہو نہ بہم تھوڑا سا

بھوک میں پیاس میں کوثر کے کنارے جائیں
امتی شاد ہوں سادات جو مارے جائیں

اس گریز کے بعد امام حسین کے اصحاب اور اعزا کی لڑائی نظم کی ہے۔ اس میں بھی اسی طرح اختصار ملحوظ رکھا ہے جو انیس کے متذکرۂ بالا مرثیہ کا طرۂ امتیاز تھا۔ یہ مرثیہ حضرت عباس کے حال میں تھا جو کربلا میں امام حسین کے لشکر کے علمبردار اور امام کے بھائی تھے۔ اس مناسبت سے اصحاب واعزا کی جنگ اس بیت پر ختم کی جاتی ہے ؎

بہہ گئیں خوں کی شطیں اہل جفا ہار گئے
مرتے مرتے بھی ہزاروں کو جری مار گئے

مرثیہ کہنے والوں نے بالخصوص انیس کے خاندان نے حضرت عباس کے حال میں مرثیہ کہنے میں بڑے بڑے التزام کئے ہیں حضرت عباس کی تلوار ان کا گھوڑا، ان کے علم سب کے خصوصیات کربلا کے دوسرے شہیدوں کے ساز و سامان سے علیحدہ کر کے بیان کئے ہیں اس لئے کہ ان کی شجاعت میں کوئی دوسرا ان کا ہمسر نہ تھا۔ امام حسین کے ساتھ ان کی وفاداری اور رفاقت اپنی آپ مثال تھی۔ امام حسین بھی ان سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے اور اصحاب حسین ان کا احترام

کرتے تھے۔ دولھا صاحب عروج نے بھی اس مرثیہ میں بعض اہم خصوصیات بیان کرنے میں نئے نئے پہلو نکالے ہیں حضرت عباس کے دو صاحبزادے تھے باپ کی رخصت کے وقت وہ بھی اپنی ماں سے اذنِ جہاد کے طلبگار ہوتے ہیں تاکہ اپنے والد گرامی کے ہمراہ جا کر میدان میں دغا کریں یہ مقام غالباً عروج کے علاوہ کسی اور بڑے مرثیہ نگار نے نظم نہیں کیا۔ اس موقع کے تین بند مثالاً پیش ہیں۔

ماں بیاں سے ہے یہ ہم دونوں کا مطلب اماں　　نہر پر جائیں گے پانی کے لیئے بابا جان
ہم کے لشکر نے کو دریا سے چلیں گے جس آں　　ہے یقیں ہم کو لڑائی بھی بڑی ہوگی وہاں
بند پانی کئے سب فوج جفا ہوئے گی
جنگ تشنگی سے ترائی میں سوا ہوئے گی

اور یاں پیاس سے معصوموں کی حالت ہے تباہ　　گر مناسب ہو تو کر دیجئے ہم کو ہمراہ
کم سنی گو ہے ہماری مگر انشاء اللہ　　ہمتیں ہوں گی ذرا بھی نہ ہماری کوتاہ
زرہیں چھوٹی سی ہمیں لا کے پنھا دو اماں
تیغچے دو کہیں رکھے ہوں تو لا دو اماں

جوڑ کر ہاتھوں کو پھر ماں سے یہ بولے وہ غیور　　خود غرض ہوں نہیں یہ ہیں اہلِ وفا کا دستور
ذہن میں اپنے نہ شاید کہیں سمجھیں یہ حضور　　کہ انھیں پیاس بجھانا ہے خود اپنی منظور
خادم شاہ ہے جو لختِ جگر اس کے ہیں
ختم ہے جس پہ وفا ہم بھی پسر اس کے ہیں

حضرت عباس اذنِ جہاد لے کر میدان کو جانے وقت امام حسین کے فرزند علی اکبر سے مکالمہ کرتے ہیں۔ ایسے موقع پر ایک وفادار مجاہد کو جو کہنا چاہئے وہ عروج کی زبان سے سنیئے۔

کر کے تسلیم شہِ دیں کو بصد عز و وقار　　آئے ہمشکلِ پیمبر کے قریں با دلِ زار
رو کے اکبر سے یہ بولے کہ چچا تم پہ نثار　　مرے بھائی اب شہِ ذیجاہ سے رہنا ہوشیار

عزم فرمائیں تو میدان میں نہ جانے دینا
ابن زہرا پہ کوئی آنچ نہ آنے **دینا**

حضرتِ عباس کی میدان کو روانگی دوسرے مجاہدوں سے یقیناً مختلف رہی ہوگی۔ حضرت عباس گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں۔ عروج اس آن بان کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

زلفِ حورِ چمنستانِ جناں ہاتھ میں لی ۔۔۔ داب کر رانوں میں گھوڑے کو عناں ڈھیلی کی

انیس کے منضبط کردہ اصول پر مرثیہ کے اجزائے ترکیبی میں چہرہ، رخصت، میدان کو روانگی، رجز، گھوڑے کی تعریف، تلوار کی تعریف، لڑائی، شہادت اور بین داخل ہیں۔ میدان کو روانگی کے وقت مرثیہ کے ہیرو کا سراپا بھی نظم کر دیا جاتا ہے۔ گھوڑے کی تعریف روانگی کے وقت کبھی جدال کے موقع پر کی جاتی ہے۔ یہی صورتِ حال تلوار کی تعریف کی بھی ہے۔ کبھی کبھی گھوڑے اور تلوار کی تعریف دونوں مواقع پر یعنی روانگی اور لڑائی کے وقت بھی کی جاتی ہے۔ انیس نے ان تمام اجزائے ترکیبی کو خوب خوب کہا ہے۔ اور بعض مقامات پر یہ تمام لوازمات اتنے اچھے نظم کئے ہیں کہ اپنا جواب ہی نہیں رکھتے اور یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ انیس کے بعد ان ضروریاتِ مرثیہ کو از سرِ نو نظم کرنا صرف انھیں کے اخلاف کا کام تھا۔ عروج نے اس مرثیہ میں رخصت کے فوراً بعد یعنی میدان کو روانگی کے وقت گھوڑے کی تعریف نظم کی ہے۔ مثالاً چند بند درج ذیل ہیں:

باگ لیتے ہی اڑا صورتِ آہو گھوڑا ۔۔۔ لے چلا مثلِ صبا دوش پہ خوشبو گھوڑا
بن گیا راہ میں چلتا ہوا جادو گھوڑا ۔۔۔ فرق کرتا نہیں تیزی میں سرِ مو گھوڑا
گر اسی حال سے یہ صاحبِ دل جائے گا
دم میں اب لشکرِ کفار سے مل جائے گا

جست یوں کرتا ہے میدان میں غازی کا سمند ۔۔۔ صید کو دیکھ کے جس طرح بھرے شیرِ زغند
چوکڑی بھرنے میں آہو سے سوا ہے وہ چرند ۔۔۔ تیز رو ایسا کہاں ہے نہ کبھی جس کو گزند

اپنے راکب کا اشارہ جو پا جاتا ہے

پتلیاں پھاڑے ہوئے شکل ہوا جاتا ہے

ایسا جاندار تو گھوڑا نہیں دیکھا اب تک   برچھوں اڑتا ہے جھپکتی ہے جو راکب کی پلک

سوئے پستی کبھی آتا ہے جو برچھو کے فلک   تا سمک جاتی ہے رہوار کے قدموں کی دھمک

اثر نقش قدم داں بھی عیاں سارے ہیں

پشت ماہی پہ ٹاپوں کے نشاں سارے ہیں

حضرت عباس گھوڑے پر سوار ہیں۔ ان کی شان اس طرح پیش کرتے ہیں :۔

جلوہ گر گھوڑے پہ ہیں بازوئے سلطان امم   سر پہ ہے سایہ فگن فوج حسینی کا علم

رو میں ڈالے ہوئے رہوار رواں ہیں ضیغم   بر میں ہے چست قبا ڈاب میں شمشیر دو دم

سر بسر شوکت و نصرت بھی ہے اقبال بھی ہے

پشت پر مہر نبوت کی طرح ڈھال بھی ہے

اسی مقام پر عروج کے مرثیہ پڑھنے کا طرز بیان کر دینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ گھوڑے کی تعریف میں متذکرہ بالا تینوں بند اس طرح پڑھ دیے تھے کہ ان کے ہاتھوں کی حرکت سے گھوڑے کی رفتار کا سماں بندھ گیا تھا اور آخری مصرع "پشت پر مہر نبوت کی طرح ڈھال بھی ہے" اس طرح پڑھا تھا کہ پوری تصویر کشی کر دی تھی۔ ممبر پر گردن سینہ تک جھکا کر مرثیہ پشت پر اتار رکھ لیا تھا۔ مرثیہ کے نیچے کا زیر بند اوپر تھا جو بالکل ڈھال نظر آ رہا تھا۔ زیر بند اس چمڑے کے چمکتے ہوئے ٹکڑے کو کہتے ہیں جس پر مرثیہ رکھ کر مرثیہ خواں پڑھا کرتے تھے زیر بند رکھ لینے سے مرثیہ کے اوراق مرثیہ خواں کے ہاتھ میں سیدھے رہتے ہیں الٹ پلٹ نہیں ہوتے۔ زیر بند گہرے لال یا کالے رنگ کا ہوتا تھا، اس روز کالے رنگ کا تھا۔ عروج نے اسی زیر بند کو کام میں لاکر ڈھال کی تصویر کھینچ دی تھی۔

عباس علمبردار راہ میں ہیں۔ اس طرف پیک برابر ان کے آنے اور راہ طے کرنے کی

خبریں دشمن کی فوجوں کو پہنچا رہے ہیں۔ قرینہ یہ ہے کہ ترائی کی طرف رخ ہے۔ لہذا خبردار خبر دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ "آگ برسے گی ترائی میں خبردار رہو"۔ پھر حضرت عباس میدان جنگ پہنچے اور رجز پڑھتے ہیں۔ ایک بند کی بیت یہ تھی :-

بھوکے پیاسے کے ستانے کا مزہ دیکھو تو
کس طرح کرتے ہیں لاکھوں سے وغا دیکھو تو

پھر شمشیر آبدار غلاف سے نکلتی ہے، ملاحظہ ہو :-

تیغ رخشاں صفت شعلۂ روشن نکلی
کینچلی جھاڑ کے اڑتی ہوئی ناگن نکلی

لڑائی شروع ہوتی ہے اور چونکہ فوج حسینی کے بہترین بہادر سپاہی کی لڑائی ہے اس لئے اسی مقام پر عروج ساقی نامہ کہہ ڈالتے ہیں۔ مثالاً صرف ایک بند ساقی نامہ کا پیش کیا جاتا ہے۔

ساقیا بادۂ گلرنگ سے ہاں بھر ساغر
دے دل آرام و مصفّیٰ و معطر ساغر
جلد آب آتش سیال سے کر تر ساغر
کب ہے میرے لب خشک پہ ساغر ساغر
سب ہیں مشتاق کہ مہر خم صہبا ٹوٹے
سال بھر بعد تو ہم رندوں کی توبا ٹوٹے

ساقی نامہ کے بعد لڑائی شروع ہوتی ہے اسی لڑائی میں تلوار کی تعریف بھی نظم کرتے ہیں ایک بند مثالاً پیش ہے۔

ہوش اڑیں دیکھ کے پرتو کے سجاوٹ ایسی
مل لے دشمن کے گلے سے بھی لگاوٹ ایسی
ناز سے چلتی ہے تھم تھم کے رکاوٹ ایسی
کبھی تابت نہ بگڑنا ہو بناوٹ ایسی!
خاتم اس کے لئے حسن خداداد کا ہے
تن جھریرا تو ہے بے شبہ پہ فولاد کا ہے

لڑائی کے بعد شہادت اور بین پر مرثیہ ختم ہوتا ہے۔ آخری تیئس بند اپنے والد مرحوم خورشید علی نفیس کے اس مرثیہ سے جس کا مطلع "طبع روشن ہے مری شمع شبستان سخن" لے کر

شامل کر لیتے ہیں اور مرثیہ انہیں بندوں پر ختم ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ مرثیہ از ابتدا تا انتہا مرصع ہے اور مرثیہ کے تمام اجزائے ترکیبی بڑی خوبی کے ساتھ نظم کئے ہیں جو جگہ جگہ انیس کی یاد تازہ کر دیتے ہیں اور جس طرح یہ مرثیہ پڑھا گیا تھا۔ اُس کا نقشہ الفاظ میں پیش کرنا محال ہے۔ جو مقام پڑھا تھا اس کی ویسی ہی تصویر پیش کر دی تھی۔ اُس زمانہ میں دولہا صاحب عروج کا جسم توانا اور آواز بھاری بھرکم تھی ساتھ ہی ساتھ آواز پر اتنا قابو تھا کہ جہاں چاہتے گداز پیدا کر لیتے اور جس مقام پر ضرورت ہوتی گرج آجاتی تھی۔ آنکھوں کی حرکت میں جادو اور ہاتھوں کی جنبش میں طلسم تھا۔

دوسری گراں قدر مجلس عارف صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد میں نے سنی تھی ۲۵ رجب المرجب والی سالانہ مجلس تھی۔ جو عارف صاحب مرحوم امام باڑہ سید تقی صاحب واقع عقب مسجد تحسین علی خاں چوک لکھنؤ میں پڑھا کرتے تھے۔ اس بار عروج نے نو تصنیف مرثیہ پڑھا اور اپنی اہلیت وصلاحیت کا سکہ حضرات لکھنؤ پر جما کر ان سے خراج تحسین حاصل کیا جلیم متے آغا صاحب فاضل طبیب حاذق تھے اور بہت عمدہ شاعر اور ادیب بھی مجلس ختم ہونے کے بعد عروج کی تعریف میں یہ کہہ اٹھے کہ یہ مرثیہ انہوں نے کہا ہے یا انیس لکھ کر سرہانے رکھ گئے۔ اس مجلس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ عارف کی یاد تازہ تھی، اُن کے انتقال کو تھوڑا ہی وقت گزرا تھا اور دولہا صاحب نے اُن کی علالت اور وفات کا حال مرثیہ کے چہرہ میں نظم کر کے نہایت درد بھری آواز میں پڑھا تھا۔ اس سانحہ سے وہ خود بھی بہت متاثر تھے۔ اس لئے محسوس کر کے پڑھا اور محسوس کرا کے منبر سے اترے چند بند جن کو حقیقتاً عارف مرحوم کا مرثیہ کہنا چاہیئے درج ذیل ہیں۔

ہمیشہ چرخِ کہن رنگ نو دکھاتا ہے کہ ہر گھڑی یہ نیا ایک گل کھلاتا ... ہے
عروج کب کبھی انساں کا اس کو بھاتا ہے سروں پہ طرفہ بلائیں یہ چن کے لاتا ہے
سوائے دشمنِ جاں دوست کب کسی کا ہے
غرض کہ اس کا سدا سے یہی طریقا ... ہے
ابھی کا ذکر ہے یاد آئیگا بھی ہلنو گا فرد گئے جہاں سے کس طرح عارفِ مغفور ... !

چلے تھے پڑھنے کو وہ مجلسِ امام غیور　　کرناگہاں اجل آنے سے ہو گئے مجبور
دل و جگر میں خدنگِ ملال پیٹھ... گئے
اٹھا جو درد، کلیجا پکڑ کے بیٹھ.. گئے

افاقہ اس مرضِ سخت سے ہوا بھی نہ تھا　　کہ ایک دوست کو فوراً خدا نے بھیج دیا
سنبھالا بڑھ کے انہوں نے یہ حال جو دیکھا　　وہیں تھا ایک مطب اُن کو لے گئے اُس جا
تمام جسم تھا ڈوبا ہوا پسینے میں
مزاج پوچھا تو بتلایا درد سینے میں

ذرا سی دیر میں تھوڑی بہت دوا بھی ہوئی　　مگر سکوں نہ ہوا جس قدر بھی کوشش کی
مکاں پہ لے کے چلیں سب کی رائے یہ ٹھہری　　کہا جو اُن سے کہ چلئے کہا تمہاری خوشی
اٹھائے کوئی، کیا رخ نہ ایسی باتوں پر
وہ اٹھ کھڑے ہوئے خود زور دے کے ہاتھوں پر

چلے بھی اٹھ کے قدم بھی بڑھا کے اک رکھا　　ہوا وہ درد مگر جس سے زور چل نہ سکا
زبان بند ہوئی ڈھل کے رہ گیا منکا　　نہ پاؤں دوسرا لیکن جگہ سے اپنے ہلا
تعلق ان کو نہ پھر کچھ جہانِ زشت میں تھا
قدم تھا ایک یہاں، دوسرا بہشت میں تھا

چہرہ میں عارف مرحوم کا حال نظم کرنے کے فوراً بعد امام کی مدح اور کربلا کا تذکرہ آجاتا ہے اس تذکرہ میں روزِ قتلِ امام یعنی روزِ عاشورہ کی گرمی نظم کی ہے۔ انیس کے اُس مرثیہ کے بعد جس کا مطلع ہے جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" اس مضمون پر قلم اٹھانا صرف عروج کا حصہ تھا۔ انہوں نے گرمی کا سماں اس طرح نظم کیا کہ مرثیہ گوئی کے فن میں اپنا مقام بنا گئے چند بند ملاحظہ ہوں :-

کہاں وہ دشتِ بلا اور کہاں شہِ صفدر　　کہاں وہ گرم ہوا اور کہاں علی کا پسر
گرمی وہ دھوپ ہے جس سے کہ موم ہو پتھر　　غضب تو یہ ہے کہ بچے بھی ساتھ ہیں اکثر

حرم سمیت شہِ مشرقین پیاسے ہیں!
جہاں میں آگ لگی ہے حسین پیاسے ہیں

بیان کیجئے کیا حال گرمیٔ عاشور — زمین جل رہی تھی کربلا کی شکلِ تنور
کیا فلک پہ بخارات ارض نے جو عبور — ہوا شعاع کی چلمن میں مہر بھی مستور
اداسی چھا گئی رنگ جہاں بدلنے لگا
یہ دوپہر کی تپش تھی کہ دن بھی ڈھلنے لگا

فلک سے آگ برستی تھی رن میں سرتاسر — نہ چین تھا کسی ذی روح کو کہیں دم بھر
اُمس تھی ایسی کہ رکتی تھی سانس رہ رہ کر — غبارِ دشت بلا تھا کہ آتشیں چادر!
مثالِ نارِ براہمن زمین جلتی... تھی
کہ دن کو دھوپ میں ذرّوں سے لَو نکلتی تھی

تپش سے کھولتا تھا آبِ فرات بھی یکسر — نمی نہ رہا تھی زمیں کی جبیں پسینے سے تر
ذرا نہ تہہ سے اُبھرتی تھیں مچھلیاں باہر — کلیجہ پھنکتا تھا پانی کا پڑتا تھا جو بھنور
وہ حال اب نہیں دریا کی بھی روانی کا
نہ ٹپکی بوند جو دامن نچوڑا پانی... کا

اس کے بعد کربلا کے میدان میں رفقاء و اعزائے امام کی شہادت بالاختصار نظم کرتے ہیں اور امام حسین کے شش ماہے فرزند علی اصغر کی شہادت کسی قدر تفصیل سے آتی ہے۔ پھر امام حسین آمادۂ جہاد ہوتے ہیں لڑائی شروع ہوتی ہے اور ساقی نامہ کہہ کر مرثیہ نامکمل رہ جاتا ہے۔ اس مرثیہ میں صرف ۲۷ بند ہیں اور یہ سب بند عروج نے پوری طاقت اور فنکاری کے ساتھ پڑھے تھے۔ مآلِ مجلس اگر صرف گریہ کو بھی قرار دیا جائے تو اس لحاظ سے بھی یہ مجلس بہت کامیاب تھی۔ روزِ عاشورہ کی گرمی کے متعلق متذکرہ بالا بندوں میں پہلے بند کی بیت یعنی

حرم سمیت شہِ مشرقین پیاسے ہیں — جہاں میں آگ لگی ہے حسین پیاسے ہیں

کچھ اس طرح پڑھی تھی کہ مجلس الٹ پلٹ ہوگئی تھی۔ گریہ کا یہ عالم تھا کہ بہت دیر تک سامعین پر رقت طاری رہی۔ جو لوگ اندر والے دالان میں بیٹھے تھے انہوں نے دیواروں سے اور درمیانی درجہ والوں نے کھمبوں سے سر پٹک پٹک کے اس بیت کی داد دی تھی۔ دولہا صاحب غم کی تصویر بنے ہوئے دیر تک خاموش رہے۔

تیسری یادگار مجلس عروج کے فن مرثیہ خوانی کا ایک معجزہ تھا جب انہوں نے عام انسانوں کے طرزِ عمل سے بالا ہو کر وہبی کمالات کا مظاہرہ کیا۔ اس زمانہ میں مرثیہ خوانی کی دو بہت بڑی مجلسیں ہر سال ہوتی تھیں۔ ایک سید تقی صاحب کے امام باڑہ میں اور دوسری اکرام اللہ خاں کے امام باڑہ میں ماہِ شوال میں ہوتی تھی۔ اس مجلس کے بانی سید شہنشاہ حسین مرحوم تھے۔ دونوں مجلسیں خواندگی کے لحاظ سے خاندانِ انیس سے متعلق تھیں۔ اب نہ وہ مجلسیں ہیں، نہ وہ پڑھنے والے اور نہ اُن مجلسوں کے بانی۔ اکرام اللہ خاں کا امام باڑہ بھی جو پیادل والی گلی میں واقع تھا اب باقی نہیں۔ در و دیوار تک منہدم ہو گئے کچھ دنوں کے بعد نام بھی مٹ جائے گا۔ بہر حال یہ اکرام اللہ خاں والے امام باڑہ کی مجلس دولہا صاحب عروج کے پڑھنے کی تھی۔ وہ بیمار تھے۔ خود سے آئے نہیں بلکہ لائے گئے۔ سہارا دے کر ان کو منبر پر بٹھایا گیا۔ اس وقت ان کا مُنحنی چہرہ، ٹیڑھی گردن، ڈھلے ہوئے شانے اور گڑا ہوا سینہ دیکھ کر کسی کو یہ توقع بھی نہ تھی کہ وہ دس پندرہ بند بھی پڑھ سکیں گے۔ لیکن انہوں نے نحیف آواز سے رباعی اور سلام کے تین چار اشعار پڑھے پھر مرثیہ شروع کیا۔ ہر بند کے بعد آواز کھلتی گئی، رفتہ رفتہ سینہ کشادہ ہوا، گال پھول گئے، شانے بلند ہو گئے اور گلے سے پاٹ دار آواز نکلنے لگی اچھا خاصا طویل مرثیہ پوری طاقت سے پڑھ ڈالا اور اسی طرح پڑھا جو اُن کی امتیازی شان تھی۔

عروج نے یہ مرثیہ امام حسین کے بھانجوں، عون و محمد کے حال میں کہا تھا اور بظاہر اپنے والد محترم نفیس صاحب کے مرثیے "کیا جگر بند شہنشاہ رسالت کو ملے" کو سامنے رکھ کر کہا تھا لیکن بہت الگ ہو کر کہا تھا حالانکہ آخر کے سولہ بہتّر بند اسی مرثیہ سے لیکر اپنے مرثیہ میں شامل کر لئے تھے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ بند مرثیہ خوانی کے فن میں کمال کا مظاہرہ کرنے کے لئے جوڑ لئے گئے ہوں. نفیس کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے جیسا ان بینیہ بندوں کو پڑھا تھا ویسا مظاہرہ اُن سے بھی کہیں اور کسی مرثیہ میں نہیں ہو سکا۔ دولہا صاحب نے بھی ان بندوں کو اسی طرح پڑھا کہ سامعین کی نظروں میں جنھوں نے نفیس کو سنا تھا انھیں کا نقشہ پھر گیا. عروج نے بالکل اپنے والد کے طرز پر نہ صرف یہ بند بلکہ قریب قریب سارا مرثیہ پڑھا تھا۔ اس مرثیہ کے چہرہ میں یقیناً وہ تیور نہیں ہیں جو نفیس کے مرثیہ میں ہیں. لیکن بہت سے مقامات اپنا جواب نہیں رکھتے مثلاً عون و محمد کا سراپا بہت عمدہ نظم کیا ہے۔

اے زہے نور و جمالِ دلبرانِ حیدر — ماہ جھینپے جو کرے اُن کی جبینوں پہ نظر
کم نہیں مصحفِ رب سے کبھی رتبہ میں یہ سر — لیلۃ القدر سے ہیں قدر میں گیسو بڑھ کر
چہرے آغوش میں زلفوں نے جو لے رکھے ہیں
شبِ معراج میں قرآن کھلے رکھے ہیں

سورۂ قدر کے اترے ہیں بعینہ ابرو — ہیں مژہ زیر و زبر فرق نہیں ہے سرِ مو
دیکھیں ان آنکھوں کی شوخی تو خجل ہوں آہو — قامتیں وہ کہ فدا جن پہ ہو سروِ لبِ جو
بارور اب جگر و جانِ بتول آئے ہیں
ساتھ ان تازہ نہالوں کے یہ پھول آئے ہیں

ضوفگن ہوتے ہیں رخسارۂ نورانی جب — تاب سے آنکھ جھپک جاتی ہے خورشید کی تب
گو کہ سوکھے ہوئے ہیں پیاس کی شدت کے سبب — لعلِ اعجازِ مسیحا کو سمجھتے ہیں یہ لب
منزلت پیشِ خدا سب سے سوا اُن کی ہے
جو کرے مُردوں کو زندہ وہ دعا اُن کی ہے

ہیں چمن خال و لب و عارض و گیسو اُن کے — سینے حبِّ شہِ والا سے ہیں مملو اُن کے
رشکِ آئینۂ مہتاب ہیں پہلو اُن کے — ہیں بھرے زورِ یداللہ سے بازو اُن کے

پہلواں ہو جو نہ مرحب سا تو کیا زور کھلے
درِ خیبر ہو تو ان بازوؤں کا زور کھلے

چھوٹے چھوٹے سے عمامے کئی سر پر پردہ بھی ہیں   بر میں وہ چست قبائیں وہ سڈول انکے بدن
گل سے رخ، مشک سے منہ، غنچہ سے لب، پھول سے تن   کم سنی، بھولا پنا، غیظ سے ترچھی چتون
ہونٹھ دانتوں میں دبائے ہوئے استادہ ہیں
جان لینے پہ بھی دینے پہ بھی آمادہ ہیں

دونوں جراروں کے چہروں پہ یہ کیسی رونق   دھوپ کی ہے نہ انہیں پیاس کی پروا مطلق
سامنے انکے جگر شیروں کے ہیں خوف سے شق   دونوں آ کر نہ الٹ دیں کہیں لشکر کا ورق
جنگ کو کھیل سمجھ کر یہ دلیر آتے ہیں
بچے آتے ہیں کہ بپھرے ہوئے شیر آتے ہیں

متذکرہ بالا بندوں میں زورِ کلام ظاہر ہے۔ اس زورِ کلام کے ساتھ دولہا صاحب کا زورِ بیان اور ان کی بھاری بھرکم آواز مجلس کو تہ و بالا کر دینے کے لئے ضرورت سے زیادہ سامان تھا۔ اس مرثیہ میں بہت سے ایسے مقامات تھے جن میں استادی کے جوہر چمک رہے تھے۔ تلوار کی تعریف، گھوڑے کی تعریف، لڑائی، ہر مقام اپنی آپ مثال تھا۔ یہ مضامین انیس مرحوم کے روندے ہوئے تھے۔ اس کے بعد نفیس نے مشقِ سخن میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ کہنا پڑتا ہے کہ عروج نے فرسودہ منازل میں اپنے خداداد کمال سے نئی ترکیبیں استعمال کیں اور نئی راہیں نکالیں۔ ان کی انفرادیت نے مرثیہ کے وقار کو گرنے نہیں دیا اور اسی منزل پر برقرار رکھا جہاں انیس چھوڑ گئے تھے مرثیہ کے علاوہ انہوں نے سلام اور رباعیاں بھی اپنے رنگ میں کہی تھیں۔ مرثیہ خوانی کی ابتدا میں رباعی اور سلام پڑھنا لازمی سمجھا جاتا تھا دولہا صاحب بھی اسی مسلک پر گامزن رہے راقم کو رباعیات اور سلاموں کے زیادہ اشعار نہ یاد ہیں اور نہ کہیں تحریراً محفوظ ہیں۔ البتہ دو سلاموں کا ایک ایک شعر یاد آ رہا ہے جو انہیں متذکرہ بالا مجالس میں کہیں ان کی زبان

سے سنا تھا۔ ایک سلام کا مطلع ہے!

غریبوں کو بھی جھک کر مل ذرا اے کرّ و فر والے　　تکبر چلتی پھرتی چھاؤں پر کرتا ہے زر والے

ایک دوسرے سلام میں یہ بیت شعر جو حضرت علی اصغرؑ کی شہادت سے متعلق ہے یاد آ رہا ہے۔

گلا بچے کا نازک تن میں رعشہ در د بازو میں　　نکالا کانپتے ہاتھوں سے شہ نے تیر کیوں کر سے

عروج کے مراثی کا مجموعہ اپنے باپ اور دادا کے مقابلہ میں بہت مختصر ہے حقیقت امر تو یہ ہے کہ انھوں نے تعداد میں بہت کم مرثیے کہے تھے اور جو تصنیفات تھے اُن میں بھی بکثرت نا تمام رہ گئے۔ وہ مجالس میں پڑھنے کے لئے مرثیے کہتے تھے، جتنا کہہ پاتے وہی پڑھ دیتے اور اس کے بعد نا مکمل مرثیوں کو تمام کرنے کی فکر نہیں کرتے تھے۔ لیکن اس اختصار میں بھی بہت کچھ ادبی معلومات اور زبان و بیان کے کرامات فراہم ہیں سلاستِ زبان، لطافتِ بیان، نازک خیالی، قادر الکلامی، تشبیہات و استعارات، تراکیب و محاورات اور ان تمام خصوصیات کے ساتھ مرثیہ کے تمام مدارج اور سارے مراتب بھی ملحوظ رکھے ہیں۔ انیس و نفیس کے خیالات کا تتبع کرتے ہوئے بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔ اُن کے اس مختصر مجموعہ پر بھی تبصرہ کرنے اور مثالیں پیش کرنے کے لئے دفتر درکار ہوں گے۔ راقم نے اپنے بیان کو صرف اُن تین مجالس میں پڑھے ہوئے مرثیوں تک محدود رکھنے کی کوشش کی ہے جن میں اُس نے بہت سے تاثرات حاصل کئے تھے۔

دولہا صاحب عروج خاندانِ انیس کی آخری یادگار تھے۔ اور شہر لکھنؤ کی مٹتی ہوئی معاشرت کی آخری نشانی تھے۔ وہ بے حد مہذب اور شائستہ انسان تھے۔ بے انتہا خوش اخلاق اور خوش گفتار شاعر تھے اور غیر معمولی طور پر منکسر المزاج تھے۔ اُن سے ملنے، ملاقات کرنے اور بات کرنے میں مزا ملتا تھا۔ وہ اپنے گھر پر ہر وقت حقہ پیا کرتے تھے اور حقہ میں فیض آباد کا خوشبودار تلخ ترین بھوا تمبا کو نوش فرماتے تھے۔ اُن کے حقے کے دو کش گھسیٹ لینا بھی ہر ایک کیلئے آسان نہیں ہوتا تھا۔ وہ حقہ پیتے جلتے اور باتیں کرتے رہتے تھے۔ ایک طرف خوشبو تو دوسری طرف ان کی خوش گفتاری، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سننے والا پھولوں کی آغوش میں بیٹھا ہوا ہے۔ بیاس بے حد

شفاف اور سادہ پہنتے تھے۔ اچکن پرانے طرز کی پہنتے تھے جو ہماری شیروانی سے مختلف ہوتی تھی گول آستینیں، چست کمر اور گھیر دار دامن اس زمانہ کی اچکن کا طرز ہوتا تھا۔ گرمیوں میں جامدانی کا انگرکھا پہنتے تھے۔ سر پر مخملی رامپوری یا دہلی ٹوپی پہنتے تھے۔ البتہ بڑی اور مخصوص مجالس میں چوگوشہ ٹوپی ضرور پہنتے تھے۔ وفات کے کئی برس قبل سے صحت خراب ہو گئی تھی کبھی سنبھل جاتے کبھی پھر گر جاتے۔ بالآخر ۱۹۳۰ء میں اکہتر برس کی عمر میں انتقال فرمایا اُن کی وفات کا مصرع تاریخ یہ نکالا گیا تھا ع

عالی مقام زینت عمر عروج بود

حکیم صاحب عالم

لکھنوی تہذیب کی آخری یادگار!

حکیم صاحب عالم مرحوم کا نام سنتے ہی نظروں کے سامنے ان کی صورت اور حافظے کی سطح پر ان کی خوبیاں اور خصوصیات ایک ایک کرکے نمودار ہونے لگتے ہیں، گول چہرہ گورا رنگ بڑی بڑی آنکھیں خشخشی داڑھی، کتری ہوئی مونچھیں، دہرا جسم، پستہ قد، جسم پر شیروانی، چوڑی دار پاجامہ، سر پر دوپلی یا کالی ٹوپی، ایک ہاتھ میں چھڑی دوسرے ہاتھ میں تسبیح، بیٹھنے میں متین، راستہ چلنے میں ہمہ تن شرافت، یہ تھا ظاہر اس بزرگ ہستی کا جس کا نام تھا سید محمد قاسم اور عرف تھا صاحب عالم۔ اس شہر کے عمائدین زیادہ تر اپنے عرف سے مشہور تھے، یہ بھی صاحب عالم ہی کہلائے اور اسی نام سے پکارے جانے لگے۔ سیرت و کردار میں محاسن اخلاق کا مجموعہ تھے۔ سلامت روی سے چال چلتے، میٹھی بولی بولتے تھے۔ گراں گوش تھے مگر صاحب فہم و بصیرت تھے۔ محبت سے بھرا دل اور تفکر و تعقل سے دماغ لبریز تھا۔ خدا ترسی و خدا پرستی سے قریب اور عصبیت و تنگ نظری سے دور تھے "با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا" ان کا شعار تھا۔ بیحد متواضع تھے اور ہر ایک کے ساتھ برادرانہ تعلقات رکھتے تھے۔ لکھنؤ کے کلچر کی وہ یقیناً آخری یادگار تھے۔ راقم سے عزیزداری بھی تھی مگر ہم عمر تھے، لڑکپن سے باہمی ملاقاتیں تھیں اس لئے بے تکلف اور پرخلوص دوست بھی تھے۔

حکیم صاحب کا آبائی پیشہ طبابت تھا۔ ان کے والد مرحوم حکیم سید فضل علی مرحوم نہ صرف مجسمۂ شرافت و انسانیت بلکہ طبیب حاذق بھی تھے۔ وہ بھی اپنے عرف سے مشہور تھے حکیم میرن صاحب کہلاتے

تھے۔ ان کی حیات میں بھی ان کا اصل نام بہت کم لوگ جانتے تھے اور آج تو شاید ان کے حقیقی نام سے کوئی بھی واقف نہ ہوگا مگر حکیم میرن صاحب اور ان کا طبیب حاذق ہونا دنیائے طب کو تسلیم ہے۔ حکومت برطانیہ سے شفاء الملک کا خطاب ملا تھا۔ مگر انہوں نے خطاب یافتہ ہونے پر کبھی فخر نہیں کیا۔ حکیم میرن صاحب کی وضعداری میں وقت کی پابندی بھی داخل تھی۔ وہ نماز صبح اول وقت پڑھتے تھے اور اندھیرے منہ اپنے مکان مسکونہ واقع چاہ کنکر سے ٹہلنے کے لئے چوک کمپنی باغ تک ہر روز جاتے تھے اور طلوع آفتاب کے قبل ہی واپس آجاتے تھے جاتے اور واپس آتے ہوئے برابر تلاوت کلام ربانی بہت بلند آواز میں فرماتے تھے تاکہ تمام ملحقہ آبادی اور محلوں سے بلائیں دور رہیں اور رحمت خداوندی کا نزول ہوتا رہے۔ حکیم صاحب عالم نے انسانی ہمدردی کی یہ خصلت بھی دوسرے اوصاف و محامد کی طرح اپنے والد مرحوم سے ترکہ میں پائی تھی۔ علمی قابلیت، فنی کمالات، محاسن اخلاق اور سیادت و شرافت و نجابت کی بنا پر ان دونوں بزرگوں کا رؤسا و عمائدین بلکہ شہر کے ہر طبقہ میں بے حد احترام ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں بھی ان دونوں صاحبان کے کردار و سیرت پر کبھی کوئی نکتہ چینی نہیں ہوئی اور نہ انھوں نے کسی کو کبھی کسی شکایت کا موقع دیا۔ ان کی سب سے بڑی یہ خصوصیت تھی کہ عمائدین شہر اور خوشحال گھرانے سے متعلق ہوتے ہوئے بھی کبھی کوئی ایسا شوق نہیں کیا جو کسی زمانہ بھی قابل اعتراض یا فعل قبیح قرار دیا جا سکے۔ ان کے اوقات ایسے تفریحی مشاغل سے ہمیشہ پاک و صاف رہے جن کو تضیع اوقات کہا جا سکے یا لہو ولعب میں شامل کیا جا سکے۔

صاحب عالم مرحوم نے کچھ مدت تک سلطان المدارس میں عربی تعلیم اور فقہ و اصول کے مدارج طے کئے تھے مگر ان کی اصل تعلیم و تربیت اپنے گھر ہی میں ہوئی تھی۔ درسی کتب اور فارسی و عربی ادب کے علاوہ طب کی کتابیں بھی اپنے والد مرحوم ہی سے پڑھی تھیں معلم بھی شفیق تھا اور درس لینے والا بھی صلاحیت و اہلیت کا مالک تھا اس لئے صاحب عالم اپنے عنفوان شباب ہی میں نہ صرف علوم دادبیات بلکہ فن طب میں بھی اعلا تعلیم مکمل کر چکے تھے اور اپنے والد مرحوم کے ہمراہ اپنے دواخانہ موسومہ معدن الادویہ واقع محلہ نخاس میں مطب کرنے لگے تھے۔ بہت جلد ان کا شمار بھی اطبائے

حاذق میں ہونے لگا تھا۔ اس کے علاوہ ان میں حسن انتظام کا بھی بہترین سلیقہ تھا۔ ان کا دواخانہ ملک بھر میں مشہور و ممتاز تھا اور یہ ترقی و نمود صرف حکیم صاحب عالم مرحوم کی کاوشوں اور جانفشانیوں کی بدولت تھی۔ دواخانہ کی اس ترقی سے ان کی مالی حالت بہت بہتر ہو گئی تھی

اس زمانہ کے ممتاز اطبا عام مریضوں سے مطب کے علاوہ ان کے گھروں پر جانے کی بھی فیس نہیں لیتے تھے۔ طب کا پیشہ خدمت خلق کے لئے مخصوص تھا۔ اور اس خدمت کا معاوضہ درگاہ شافی مطلق سے حاصل کرنے کی توقع پر منحصر رہتا تھا۔ مگر رؤسا و امراء کے درباروں اور محلوں میں جانے پر فیس کے علاوہ دوسرے ناموں اور طریقوں سے معاوضہ پیش ہوتا اور قبول کیا جاتا تھا۔ حکیم صاحب عالم اس داد و دہش سے بھی ہمیشہ محفوظ رہے ان کے دوستانہ تعلقات تمام اونچے گھرانوں سے تھے۔ بعض عمائدین سے بے تکلفانہ دوستی تھی۔ ان حالات میں رسم زمانہ کے تحت دو خوشحال دوستوں میں خواہ ان میں کتنی ہی گہری ملاقات کیوں نہ ہو کسی معاوضہ یا نذر قیمت کا سوال ہی نہیں ہوتا تھا۔ بسا اوقات دوستانہ تعلقات کی بنا پر دوائیں بھی بلا قیمت پیش کر دی جاتی تھیں۔ راقم کے علاوہ ان کے بہت سے دوسرے دوست ایسے تھے جن کو وہ قیمتی سے قیمتی دوائیں تجویز کر کے پیش کر دیتے تھے۔ اور ان کی قیمت لینا کبھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح حضرات علمائے کرام کے کئی بڑے بڑے خاندان ایسے تھے جن سے دواؤں کی قیمت ملنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ غرباء کو بلا قیمت دوائیں دینے کا بالاعلان طریقہ تھا۔ اس اعلان کی وجہ سے ان کے مطب میں غریبوں کا انبوہ لگا رہتا تھا اور ان سب کے لئے مفت دوائیں وقف عام تھیں۔ ان تمام طبقوں کے علاوہ طالب علموں کے ساتھ بھی رعایت ہوتی تھی۔ علم دین حاصل کرنے والوں کے لئے قیمت ادا کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی دوسرے طالب علموں کے لئے بھی زیادہ تر بخشش و کرم ہی جاری رہتی تھی مختصر یہ کہ دواخانہ سے معتد بہ مقدار میں دوائیں مفت نکل جانے کے باوجود بھی مرکبات اور شربتوں وغیرہ سے وافر آمدنی ہو جاتی تھی۔

حکیم صاحب کو فلاح عامہ کی بڑی فکر رہتی تھی اور ادبی مذاق بھی بہت بلند تھا۔

اسی شوق میں انہوں نے ایک ماہوار رسالہ فن طب اور مختلف امراض کے معالجات سے متعلق جاری کر دیا تھا۔ اس ماہنامہ میں بہترین مضامین اور بہت سی تشریحی تصاویر شائع ہوتی تھیں۔ لیکن اس رسالہ کے گراں قدر ہونے کے باوصف یکار و بار بہت دنوں تک نہیں چل سکا۔ جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ زیادہ تعداد مضامین کی خود انھیں کو لکھنا پڑتی تھی۔ مطب کرنے اور دواخانہ کی نگرانی کے بعد ان کے پاس اتنا وقت ہی نہیں بچتا تھا کہ وہ مضامین نویسی کی طرف زیادہ توجہ کر سکیں دوسرے یہ کہ ان کے مزاج میں بہت زیادہ مروت تھی۔ رسالے کے چندے باقی رہ جاتے اور خسارہ پر خسارہ ہوتا رہتا تھا مفت دوائیں تقسیم کرنے کے بعد اس نقصان کا مزید تحمل ان کے امکان میں نہیں رہا لہٰذا اس علمی اور ادبی شغف کو ترک کر دینا ہی انہوں نے مناسب سمجھا۔

ان کے تفریحی مشاغل میں سب سے زیادہ ان کا رجحان شعر و سخن کی طرف تھا۔ سخن فہم بھی تھے اور شاعر بھی۔ طبیعت بہت زیادہ موزوں تھی اور بہت جلد شعر کہہ لیتے تھے مگر قصیدوں کے علاوہ اور کسی صنف سخن کی طرف توجہ نہیں کی۔ ان کا رنگ تغزل قصائد کی تشبیب میں صرف ہو جاتا تھا۔ یہ قصیدے نعت و منقبت میں ہوتے تھے۔ پڑھنے کا طرز بے حد سادہ تھا مگر لطف لے کر پڑھتے تھے۔ ان صحبتوں کے علاوہ خود اپنے دوستوں کو مخصوص طور پر مدعو کر کے اپنے قصیدے بہت شوق سے سناتے تھے۔ کبھی کبھی مطب ہی میں دو چار دوست آجاتے تو مریضوں سے فراغت کر کے قصیدہ خوانی کی محفل گرم ہو جاتی تھی۔ اپنی طلب کردہ مخصوص صحبتوں میں نیز ان اتفاقیہ اجتماعات میں جو مطب میں ہو جاتے تھے حکیم صاحب کے لئے اپنے دوستوں کو کھانا کھلانا بعد ضروری ہوتا تھا۔ بغیر کھانا کھلائے رخصت ہونے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ ظاہر ہے کہ قصیدہ خوانی میں بہت زیادہ وقت صرف نہیں ہوتا تھا۔ صرف وہی ایک قصیدہ سناتے جو زیادہ سے زیادہ ساٹھ ستر اشعار کا ہوتا تھا مگر ان کے یہاں ایسی مختصر صحبتوں میں بھی گھنٹوں وقت خرچ ہو جاتا تھا کیونکہ بات میں بات نکلتی اور بہت سے ادبی مباحثے اور مذاکرے نکل آتے تھے۔ ان کے سامعین بھی سب پڑھے لکھے اور بہترین ادیب ہوتے تھے۔ جن میں خصوصیت کے ساتھ علی عباس حسینی، علامہ اخترعلی

تلہری اور مولانا ثاقب حسین کا ہونا ہمیشہ ضروری قرار پاتا تھا۔ اگر کسی مخصوص دعوت میں قصیدہ خوانی ہوتی تو صدر محفل جوش ملیح آبادی ہوا کرتے تھے حکیم صاحب کے ان قصائد کا مجموعہ بہت ضخیم تھا مگر ہمارے ملک میں ان کا کوئی قصیدہ کبھی طبع نہیں ہوا۔ ان کی طبیعت نام و نمود کی خواہش میں بالکل پاک و صاف تھی اس لئے قرینہ یہی ہے کہ ان کے کسی قصیدے نے اشاعت حاصل نہیں کی اور وہ سارا کلام یقیناً تلف ہو گیا ہوگا۔

دوستوں کی ملاقاتوں کے سلسلہ میں ان کی دعوتوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ وہ خود معدودے چند احباب کے گھروں پر صرف ملاقات کی غرض سے جانے کے خوگر تھے۔ عید وغیرہ یا تقریبات کے مواقع پر ہر جگہ مدعو ہونے پر جاتے تھے۔ لیکن ملاقات کرنے کی غرض سے صرف دو چار دوستوں کے یہاں کبھی کبھی چلے جاتے تھے۔ دوستی کے علاوہ عزیز داری کہیے یا یہ کہ ہمارے درمیان کوئی روحانی ارتباط تھا جس کی کشش سے وہ میرے یہاں قریب قریب ہر روز شام کو میں موجود ہوں یا نہ ہوں مگر میرے گھر میں ضرور آتے تھے۔ یہ شرف کسی اور کو کبھی حاصل نہیں ہو سکا۔ البتہ ان کا یہ اصول تھا کہ جب ملاقاتوں کو یا کسی مخصوص دوست کی ملاقات کو دل چاہتا تو وہ سب دوستوں کی دعوت گھر دیا کرتے تھے۔ ان کے ایسے دوستوں کی تعداد کبھی ایک درجن یا ڈیڑھ درجن سے زیادہ کبھی نہیں بڑھی۔ ان دوستوں میں ادیب، غیر ادیب اور ہر مذاق کے مہذب اور تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ حکیم صاحب کا ذوق کھانوں کے بارے میں بہت بلند تھا۔ خود بھی ہر روز بہت لذیذ اور عمدہ کھانے کھاتے تھے اور دعوتوں میں انتظامات و التزامات اور زیادہ وسیع ہو جاتے تھے ان کے دستر خوان پر لکھنؤ کے مخصوص اور اپنے اصلی و صحیح طرز پر پکے کھانے ملتے تھے۔ یہ دعوتیں کبھی دن کو اور کبھی رات کو ہوتی تھیں۔ ہر دعوت میں قریب قریب سب دوستوں کی شرکت ضروری ہوتی تھی البتہ ادیبوں کی صحبتوں میں یک رنگی کا خیال رکھا جاتا تھا اور ایسے مدعو کردہ لوگوں میں اگر کوئی نہ آسکتا تو اگلی دعوت تک جب کبھی سامنا ہو جاتا اور یہ سامنا دوسرے اور تیسرے دن ہو جانا لازمی ہوتا تھا' اس سے شکایتیں کرتے تھے۔ ابتداً رات کی دعوتوں میں جوش صاحب

کو باوجود انتہائی خلوص و محبت کے مدعو نہیں کرتے تھے اس لئے کہ ان کے رات والے معمولات حکیم صاحب کے متشرع اور مقدس طبیعت پر بہت گراں گزرتے تھے مگر رفتہ رفتہ ان کے ساتھ خلوص و محبت میں اتنی فراوانی ہو گئی تھی کہ تقدس و ورع کے حدود میں بھی جوش کے لئے جگہ نکل آئی تھی بہر حال ان دعوتوں میں وقت کے تناسب سے کھانے کھلائے جاتے تھے۔ مثلاً یہ کہ دن کو پوریاں ہوتی تھیں تو رات کی دعوت میں زعفرانی پراٹھے۔ دن کو سادہ پلاؤ یا مٹر پلاؤ کھلاتے تو رات کو دو گوشتہ مٹر پلاؤ یا جو گوشتہ پلاؤ ہوتا تھا۔ شیریں غذاؤں میں دن کو یا فوتی تھی تو رات کو متنجن یا شاہی ٹکڑے اور بالائی ہوتی تھی۔ اُن کی اہتمام بالشان تواضع کا حال طشت از بام ہو چکا تو ہر دوست کے ساتھ اس کے دو ایک دوست بھی ہمراہ جا کر شریک دسترخوان ہو جایا کرتے تھے مگر ان کا خوانِ نعمت اتنا وسیع تھا کہ وہاں کبھی قلت یا کمی محسوس نہیں ہوئی۔ زندگی کے آخری دور میں اپنی گرتی ہوئی صحت کو سہارا دینے کے لئے انہوں نے رات کا کھانا ترک کر دیا تھا۔ اسی کے ساتھ رات کی دعوتیں بھی دن کے اوقات میں بدل گئی تھیں اور اب ہر چوتھے پانچویں روز یہ دعوتیں ہو جایا کرتی تھیں۔ پھر بھی اگر کوئی دوست اپنی کسی مصلحت کے تحت کبھی رات کی دعوت عائد کر دیتا تھا تو وہ اس کو بخوشی قبول کر لیتے تھے مگر ایسی دعوتوں میں اسی مخصوص دوست کے فرمائشی کھانے کھلائے جاتے اور اسی کی تجویز سے دوسروں کو بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ کھانے کھلانے کے بعد ہر دعوت میں سب ہی پان کھاتے تھے۔ حکیم صاحب کے یہاں کے پانوں کی شہر بھر میں شہرت تھی۔ وہ خود بہت اچھے پان دن بھر کھاتے اور کھلایا کرتے تھے۔

لکھنؤ کے دیسی دسوری پان ہمیشہ مشہور رہے ہیں رؤسا و عمائدین کے یہاں یہی پان تربیت دے کر فروخت کئے جاتے تھے۔ یہ تربیت بڑے ریاض اور بہت محنت کے بعد پایہ تکمیل کو پہنچتی تھی ایسے تیار کئے ہوئے پان بیٹی کہلاتے تھے کیوں کہ ان کا رنگ لیتہ سے ملتا جلتا ہو جاتا تھا۔ ان پانوں میں لذت لطافت اور نزاکت پیدا ہو جاتی تھی۔ پان بنانا بھی ہنر تھا۔ راقم نے اپنی ساری عمر میں صرف چار گھروں میں ایسے پان کھائے ہیں جن کا مثل و نظیر کسی دوسری جگہ نہیں ملا۔ اور یہ چاروں گھر بھی ایسے

نہیں تھے جہاں کسی دو مقامات پر یکسانیت ملی ہو چاروں گھروں کے چار مزے اور ہر مزہ اپنی جگہ پر لاجواب تھا۔ ایک گھر چودھراین کا تھا جہاں کے پان بڑے بڑے معززین اور معتقد لوگ فرمائشیں کر کے بنوا کر منگواتے تھے۔ چودھراین کے گھر میں چونا اور کتھا دونوں مخصوص طرز پر تیار کئے جاتے تھے۔ ان کے یہاں کے پانوں میں انھیں دونوں اجزا کی حکمت عملی کی وجہ سے لذت تھی۔ دوسرا گھر شیخ علی عباس مرحوم کا تھا۔ یہاں بھی کتھ اور چونا پر بڑا ریاض ہوتا تھا۔ مگر کوئی چیز ایسی شامل کر دی جاتی تھی کہ ذائقہ بدل جاتا تھا۔ تیسرا محل مرزا ابہاد مرزا محمد صادق علی خاں صاحب کا تھا جہاں کے پانوں کے بارے میں کبھی یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیسے بنائے جاتے ہیں کہ چونا ڈلی الائچی ہر چیز ہر جگہ بہتر بن ہوتی تھی وہی یہاں بھی تھا مگر پان بنانے کا یہ سلیقہ تھا کہ ہر حصہ پان تک برابر کا کتھ چونا اور یکساں مقدار میں باریک کٹی ہوئی ڈلی پہنچ جاتی تھی۔ اس کے علاوہ بہت بڑی گلوری بنتی تھی اور اس ہنرمندی سے بنائی جاتی تھی کہ کسی کو کھینچ کر ماردی جاتی تو پوری گلوری ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی مگر اپنی جگہ سے نہیں کھلتی تھی۔ حکیم صاحب کے یہاں گلوریاں چھوٹی اور ڈلی کم مگر الائچی زیادہ ہوا کرتی تھی ان کے یہاں کے پانوں میں سادگی، لطافت، نزاکت اور ذائقہ میں اعتدال ہوتا تھا۔ انہیں مثالوں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ لکھنؤ کلچر میں پان کی تربیت اس کے مسالوں کی تیاری اور گلوری بنانے کے کاروبار کو بھی فن کا مرتبہ حاصل ہو گیا تھا۔

صاحب عالم صاحب کی یہاں کی یہ دعوتوں والی نشستیں بڑی لمبی لمبی ہوتی تھیں۔ قصیدہ خوانی نہ بھی ہوتی تب بھی پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت میں بڑے اچھے، اچھے اور کارآمد تذکرے اور مباحثے ہو جایا کرتے تھے۔ البتہ اختلافی مسائل نہیں چھیڑتے تھے ان کی خود طبیعت مرنجان مرنج تھی اس کے علاوہ ان کا سارا طرز زندگی اور ساری معاشرت کا اندازہ لکھنؤ کے خالص کلچر میں ڈوبا ہوا تھا وہ ہر اختلاف سے دور رہنے کے قائل تھے یہی وجہ تھی کہ ان کی عملی زندگی میں سیاسیات کو بہت کم دخل تھا۔ ان کی سیاسی معلومات میں کوئی کمی نہیں تھی، ذاتی طور پر سیاسی رجحانات بھی رکھتے تھے، پکے نیشنلسٹ تھے اور ان کے مخصوص دوستوں میں بابو موہن لال سکسینہ اور بابو گوپی ناتھ سریواستوا

کے ایسے ممتاز کانگرسی رہنما بھی شامل تھے جن سے ان کو محبت بھی تھی گاندھی اور نہرو کا بے حد احترام کرتے تھے لیکن پھر بھی وہ سیاسیات سے اتنا عملاً دور رہتے تھے کہ سیاسی اختلافی مسائل میں نہ کبھی کوئی حصہ لیتے اور نہ کبھی کسی ایک پارٹی کی دوسرے کے مقابلے میں کھل کر تائید کرتے تھے۔ ان کی ہمدردیاں انفرادی رہتی تھیں جن میں ذاتی تعلقات کو بہت دخل رہتا تھا۔

حکیم صاحب عقائد کے پکے اور پابند مذہب بھی تھے۔ شریعت کا ہر قدم پر لحاظ و احترام کرتے تھے لیکن عصبیت و تنگ نظری سے بہت دور تھے۔ احکام شرع کے پابند عقلاً تھے رسماً نہیں تھے۔

ان کا دواخانہ کچھ مدت کے بعد نقصان سے چلنے لگا تھا اس خسارہ کو گھر کی آمدنی سے پورا کرتے رہے۔ ان کی اہلیہ بھی بہت خوشحال تھیں۔ آخر عمر میں گھر کا خرچ بھی انھیں کی آمدنی سے چل رہا تھا۔ جہاں تک مجھے اطلاع ہے کبھی کبھی مقروض بھی ہو جاتے تھے مگر نہ دریا دلی میں کبھی کمی آئی اور نہ وضعداری کا پاس ولحاظ کبھی جانے دیا۔ البتہ تواضع والی دعوتوں میں کسی قدر کمی ہو گئی تھی۔ پھر بھی وہ کمی ایسی نہ تھی کہ جس کو ہر شخص محسوس کر سکتا صرف انتہائی بے تکلف دوست اور پوری طرح مزاج داں احباب اس بدلی ہوئی صورتِ حال کو سمجھ سکتے تھے۔ مختصر یہ کہ حالات بدلنے پر بھی مخصوص دوستوں کے ساتھ جو برتاؤ تھا وہ بالکل اسی طرح برقرار رہا جو فارغ البالی اور خوشحالی کے زمانے میں تھا۔ جن دوستوں سے جتنا زیادہ خلوص تھا اور جتنی زیادہ محبت تھی اتنا ہی ان کے لئے ایثار و قربانی کا جذبہ بھی شدت رکھتا تھا۔ اس سلسلے میں جوش ملیح آبادی سے ان کے روابط قابل ذکر ہیں۔ جوش صاحب سے ان کی ملاقات دوستی کی منزل تک پہنچی اور پھر ان کو ایک طرح کا ان سے والہانہ قلبی لگاؤ ہو گیا۔ یہ قلبی تعلق اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ انہوں نے اپنے جذبۂ تقدس و ورع کو بھی ان کی خوشی کے لئے ان پر نچھاور کر دیا تھا حکیم صاحب کا جوش صاحب کے ساتھ یہ برتاؤ دوستی اور محبت کی دنیا میں قابل رشک مثال تھی۔

جوش صاحب سے ہم لوگوں کی ملاقات لڑکپن ہی کے زمانہ سے تھی۔ ان میں اسی وقت سے کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ جو بھی زیادہ قریب سے ملاقی ہوتا وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ انہوں نے نوعمری

سے شعر کہنا بھی شروع کر دیا تھا۔ حکیم صاحب کو بھی اسی زمانہ سے شعر کا اچھا ذوق تھا اس طرح ان دونوں آدمیوں میں اس یک رنگی مذاق نے ایک دوسرے سے منسلک کیا۔ جہاں تک میرا تعلق تھا میں جوش صاحب سے ایک منزل اور قریب تھا۔ اس زمانہ میں طوائف کچھ اور ہی چیز تھی اور اس کے کوٹھے پر شرفا کا جانا عیب نہیں تھا۔ چنانچہ ہم دونوں یعنی جوش اور میں ایک طوائف ظہیرن نامی کے یہاں ہر روز شام کو جانے لگے تھے ایک مرتبہ گرمی کے موسم میں شام کو پہنچے۔ وہ چوک میں پارک کی جانب مشرق بالاخانہ پر رہتی تھی۔ مغربی دروازہ کھلا ہوا تھا ڈوبتے سورج کی کرنیں ظہیرن کی پیشانی پر پڑیں عرق کے قطرات اس کے ماتھے پر دمکنے لگے۔ میں نے اور جوش نے اس کیفیت کو ایک ساتھ محسوس کیا۔ اور جوش نے اٹھ کر فوراً وہ دروازہ بند کر دیا۔ ظہیرن نے ماتھے کا پسینہ پونچھ ڈالا اور میری زبان پر بیساختہ بدر چاچ کے شعر کا یہ دوسرا مصرع آ گیا کہ "ہزار دانۂ پروین بر آفتاب چکید"۔ وہاں سے چراغ جلنے کے بعد ہم لوگ اٹھے تو نخاس میں حکیم صاحب کے مطب پہنچ گئے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد جوش نے حکیم صاحب سے مزاحاً کہا کہ "ہمارے مرزا نے (یعنی میں نے) ایک شعر کہا ہے" تم اس کے معنی بتاؤ اور مطلب سمجھاؤ"۔ اس کے بعد مجھ سے یہ کہا کہ پورا شعر اپنا کہہ کر سنا دو۔ حکیم صاحب گراں گوش تھے۔ ہم لوگوں کی سرگوشیاں دیکھ کر کچھ سمجھ نہ سکے اور مجھ کو حکم دیا کہ شعر سناؤں۔ میں نے شعر پڑھ دیا اور وہ فوراً کہنے لگے کہ "تم دونوں بدمعاش ہو، یہ شعر تمہارا نہیں، شعر ہے یا چیستان ہے"۔ مختصر یہ کہ اسی گفتگو کے دوران میں ان کو سارا واقعہ صحیح صحیح بتا دیا گیا۔ وہ خفا تو نہیں ہوئے البتہ جوش صاحب سے بے تکلفی بہت بڑھ گئی۔ ہم لوگ برابر ملتے رہتے اور اب حکیم صاحب سے ہم لوگ طوائفوں کے تذکرے بھی کر دیا کرتے۔ وہ کبھی مسکراتے اور کبھی ہم لوگوں پر خفا ہوتے۔ ان کا تقدس ان باتوں کو سننے کی بھی اجازت نہیں دیتا تھا مگر رواداری اور پرخلوص دوستی میں ان کے لئے چارہ بھی کیا تھا بجز اس کے کہ ہم لوگوں کی ان حرکتوں کو برداشت کریں۔ کچھ مدت کے بعد جوش ملازم ہو کر حیدرآباد چلے گئے۔

حیدرآباد میں ملازمت کے دوران کئی برس کے بعد جوش صاحب لکھنؤ آتے اور سیدھے

کو حکیم صاحب کے دواخانہ میں شعر و سخن کی محفل جما کرتی تھی۔ سیر چشمی کے ساتھ حکیم صاحب اپنے دوستوں کی چا اور خوا کہات وغیرہ سے تواضع کرتے اور نماز مغرب کے وقت تک یہ دلچسپیاں چلتی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی دوپہر کو بھی کھانے سے تواضع ہو جاتی تھی لیکن اس دور میں یعنی جوش کے حیدرآباد والے طویل وقفہ ملازمت میں وہ جب بھی آئے غالباً ایک بار بھی رات کو کوئی ان کی دعوت نہیں ہوئی ان کا خلوص برقرار تھا، وہ جوش سے اسی طرح محبت کرتے تھے اور ان کے کلام کے دلدادہ تھے۔ شعر اور اچھا شعر حکیم صاحب کے لئے بہت بڑی نعمت تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی محمد نواب صاحب مرحوم سرکار آصفیہ میں تھے۔ حکیم صاحب انہیں کی معرفت حیدرآباد سے جوش صاحب کا کلام حاصل کیا کرتے تھے اور جب بھی کوئی نئی نظم آجاتی اس کو پڑھ کر خود بھی مسرور ہوتے، دوسروں کو بھی سناتے اور مجھے تو خاص طرح سے بار بار سناتے۔

جوش صاحب حیدرآباد سے سبکدوشی حاصل کر کے کچھ مدت تک دلی میں رہے وہاں سے ایک ماہانہ رسالہ نکالا جو چند اشاعتوں کے بعد بند ہو گیا پھر لکھنؤ آکر مستقل طور سے سکونت پذیر ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت میرے علاوہ کوئی دوسرا بے تکلف دوست اُن کو فی الفور دستیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اس وقت بنارسی باغ میں رہتے تھے میں گولہ گنج میں اور حکیم صاحب وکٹوریہ اسٹریٹ پر رہتے تھے۔ میرا مکان ان دونوں مکانات کے عین وسط میں تھا۔ اس لئے یہی ٹھکانا مشترکہ اجتماع کے لئے موزوں تھا۔ حکیم صاحب بلا ناغہ روز ہر شام کو میرے یہاں آتے بھی تھے۔ ان کی یہ وضعداری مرض الموت میں مبتلا ہونے کی شام تک برقرار تھی۔ میری لڑکیوں سے بیحد مانوس تھے بالخصوص بڑی لڑکی کو جو اس وقت مشکل سے چھ، سات برس کی تھی بہت چاہتے تھے۔ لڑکی بھی اُن سے بہت ہلی ہوئی تھی اُن کو "آپ" کہہ کر پکارتی تھی۔ مختصر یہ کہ جوش نے اپنی شام کی نشست کے لیے میرا مکان پسند فرمایا مگر ان کی موجودگی میں حکیم صاحب کبھی نہیں ٹھہرتے تھے۔ جوش مشغلۂ بادہ خواری میں شدت کے ساتھ وقت کے پابند تھے۔ حکیم صاحب کو یہ حقیقت میری اہلیہ سے معلوم ہو گئی تو انہوں

نے یہ طے کر لیا تھا اور اسی پر عمل کرتے رہے کہ وہ بچوں کو دیکھ کر اور ہم لوگوں کے پاس ذرا دیر بیٹھ کر رخصت ہو جاتے تھے۔ جوش ان کو لاکھ روکنے کی کوشش کرتے مگر وہ نہ مانتے تھے۔ اس تبدیلی کے علاوہ اُن کے برتاؤ، اخلاق اور رکھ رکھاؤ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میری بدکاری بہر حال پردہ راز میں تھی۔ ایک شام کو جوش نے کہا کہ حکیم صاحب روزانہ بھاگ جاتے ہیں ان کو روکنا اور بٹھانا چاہیے۔ میں نے جواب دیا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ وہ مسکرائے ایک خاص انداز سے گردن ہلائی۔ گلاس منہ کو لگایا اور پھر رکھ کر استفساریہ طرز میں کہا "یہ نہیں ہو سکتا؟" میں نے پھر کہا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ وہ چپ ہو گئے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ دو یا تین روز کے بعد رخصت ہوتے وقت کہا کہ "کل دوپہر کو آجانا کچھ کاغذات دکھا کر مشورہ لینا ہے۔" میں نے وعدہ کر لیا۔

رات کو جو وعدہ کر چکا تھا اسی کے مطابق میں دوسرے روز جوش کے یہاں پہنچا۔ ان کے بھائی رئیس احمد خاں موجود تھے اور رندان بادہ آشام کی حوصلہ افزائی کے لئے موسم بھی سازگار تھا۔ یعنی یہ کہ فصل برشگال تھی، گھنگھور گھٹائیں گھر گھر کر آ رہی تھیں اور میرے وہاں تک پہنچتے پہنچتے بے اختیار یہ شعر زبان پر آ رہا تھا۔

فدائے شیوۂ رحمت کہ در لباس بہار بہ عذر خواہی رندان بادہ نوش آمد

مگر یہ بات بھی یقینی تھی کہ بادہ نوشی کا وقت نہیں آیا تھا۔ ہمارے دوستوں نے غروب آفتاب کے قبل مے نوشی کو کبھی جائز قرار نہیں دیا۔ جوش کا تو یہ قول تھا۔

جب مہر مبیں غروب ہو جاتا ہے پیمانہ بکف طلوع ہوتا ہوں ... میں

اس لیے میں تو یہ سمجھ کر پہنچا تھا کہ کاغذات دکھائے جائیں گے اور کچھ مشورہ ہوگا مگر وہاں دونوں بھائی ایک مکمل اسکیم تیار کر چکے تھے جو میری معیت میں چلانا تھی اور جو عین وقت تک مجھ سے بصد ہزار اہتمام مخفی رکھی گئی۔ جوش نے مجھ سے صرف اتنا کہا کہ اس موسم میں گھر میں بیٹھنے کو دل نہیں چاہتا۔ آئیے شام تک بھیگا جائے اور برسات کے مزے لوٹے جائیں۔ غرضیکہ

ہم تینوں آدمی تانگہ پر چلے، حضرت گنج گھومے پھر دریا کی طرف رخ کیا، میڈیکل کالج والی شاہ مینا روڈ تک پہنچے وقت بھی غروب آفتاب میں گھنٹہ بھر سے زیادہ کا وقت باقی تھا۔ وہاں سے آگے بڑھے شراب کی بوتل خریدی گئی اور تانگہ والے کو ہدایت دی گئی کہ تانگا اس کی طرف سے امین آباد چلو مگر وکٹوریہ اسٹریٹ پر حکیم صاحب کے مکان کے سامنے دفعتاً تانگہ رکوادیا گیا جوش صاحب تیزی سے اترے رئیس احمد بھی پیچھے پیچھے لپکے، میں خود یہ نہ جانتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اس لیے ساتھ ہولیا۔ بارش شدت سے ہو رہی تھی۔ ہم لوگ بھیگ کر شرابور ہو چکے تھے۔ جوش نے زور سے دروازہ پر دستک دی۔ ایک عورت باہر نکلی، جوش صاحب نے کہا کہ حکیم صاحب سے کہدو کہ مریض کی حالت خراب ہے اس کو دکھانے لائے ہیں۔ وہ گھر میں جا کر پھر آئی اور کہا کہ حکیم صاحب نے آپ کا نام پوچھا ہے۔ جوش نے کہلا بھیجا کہ کہدو "عبد الصمد آیا ہے فوراً آیئے، مریض جاں بلب ہے"۔ بیچارے حکیم صاحب چھتری لگائے گھبرائے ہوئے باہر نکلے تو ہم لوگوں کو دیکھ کر قہقہہ لگایا۔ جوش نے بھی اسی انداز میں ایک ٹھٹا مارا اور کہا کہ "جان من ہم بھیگے ہوئے ہیں، کپڑے شرابور ہیں۔ مطب چلو تو کپڑے نچوڑ لیں تب حواس درست کر کے بات کرسکیں گے"۔ حکیم صاحب اتنے سیدھے سادے فرشتہ خصلت انسان تھے کہ وہ یہ سوچ بھی نہ سکے کہ ان پر کیا جال ڈالا جا رہا ہے۔ میں خود اس وقت تک کچھ نہ سمجھ پایا کہ آخر ہوگا کیا۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ تم لوگ چلو میں آتا ہوں"۔ مختصر یہ کہ ہم لوگ آگے بڑھ کر مطب پر تانگہ سے اترے، تانگہ چھوڑ دیا گیا اور جوش صاحب بوتل دربغل کوٹھے پر چڑھ گئے جو مطب کے اوپر تھا اور جہاں دعوتیں ہوا کرتی تھیں۔ قبل اس کے کہ حکیم صاحب تشریف لائیں بوتل کھل گئی اور مے گساری کا شغل شروع ہوگیا۔ گلاس اور پانی وہاں موجود ہی تھا اور ہم لوگوں کے ہاتھوں میں جام دلبو اٹھانے کی سکت تھی اس لیے کسی ضرورت کے لیے کسی آدمی کو بھی آواز نہیں دینا پڑی۔ ہم سب کی زندگی میں یہ سب سے پہلا اور یقیناً سب سے آخر موقع تھا جو روز روشن میں سیاہ کاری کے گنہگار ہوئے تھے۔

تھوڑے ہی دیر کے بعد حکیم صاحب تشریف لائے اور اپنے کرہ میں ایسی بدعت شعاری دیکھ کر کچھ برہمی اور کچھ تلطف کی آواز میں فرمایا "ارے یہ میرے کمرہ میں! ...... خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اور کیا کہتا اور کیا کچھ کہنے والے تھے کہ جوشؔ نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا اور فی الفور اپنی وہ نظم اپنے مخصوص لحن میں پوری طاقت سے شروع کر دی جس کا مطلع یہ ہے ؎

اٹھا ساغر کہ انساں کشتۂ آلام ہے ساقی   یہ ساغر ہے وہ جس کے آگے خدا کا نام ہے ساقی

بلا لحاظ اس امر کے حکیم صاحب پر کیا گزر رہی ہے اور وہ کیا کیا سوچ رہے ہیں، جوشؔ اپنی نظم کے سب اشعار ایک ایک کر کے پڑھتے گئے۔ جب وہ اس شعر پر پہنچے تو حکیم صاحب کے چہرہ کی غصہ و برہمی والی سرخی ماند پڑ رہی تھی ؎

لڑکپن ضد میں روتا تھا جوانی دل کو روتی ہے   نہ جب آرام تھا ساقی نہ اب آرام ہے ساقی

اور جب یہ مقطع پڑھا تو حکیم صاحب کے مزاج کی کیفیت بدل چکی تھی اور وہ اپنے اصل موڈ میں آچکے تھے

ادب کر اس خرابی کا کہ جس کو جوشؔ کہتے ہیں   کہ یہ اپنی صدی کا حافظ و خیام ہے ساقی

جوشؔ نے اس نظم پر اکتفا نہیں کی بلکہ بلا توقف اور یکے بعد دیگرے اپنی نظمیں سناتے رہے۔ پے بہ پے جام چل رہے تھے اور تہ بہ تہ مصلحت وقت کے تحت نظمیں اور اشعار ڈھل رہے تھے۔ یہاں تک کہ جب ذیل شعر پر بوتل ختم ہوئی۔

خدا تیرے تخیل میں ہے قہار   بشر یاں رحمۃ للعالمیں ہے

اس نظم کو اس شعر پر ختم کیا تھا کہ

"صدا یہ دے رہا ہے عرش سے کون   کوئی کہہ دو مجھے فرصت نہیں ... ہے"

یہ رات ہماری زندگی میں ایسی پہلی اور آخری رات تھی جب بھیگے کپڑے ہمارے بدنوں پر سوکھے۔ جوشؔ نے مسلسل اور پوری طاقت سے تین گھنٹے سے زیادہ مدت تک غزل سرائی کی اور حکیم صاحب کا غصہ اس جملہ پر ختم ہوا کہ "اس مردود نے بھی میرے سامنے پی پی" اشارہ

میری طرف تھا مگر "مردود" کا لفظ پرخلوص محبت کے صدہا سمندر اپنی معنویت میں جذب کیے ہوئے تھا۔ محفل ختم ہونے کے قبل بازار کی پوریوں اور کباب سے ہماری تواضع ہوئی گھر کا کھانا نہیں منگایا البتہ برتن سب وہی تھے جو مخصوص دعوتوں میں استعمال کے لیے وہیں کوٹھے پر رکھے رہتے تھے۔ دوسرے روز صبح کو میں معذرت خواہی کے لیے حاضر ہوا تو فرمایا کہ اکرام مہمان شرعاً واجب ہے اس لیے تم لوگوں نے جو چاہا کر لیا میں برداشت کرتا رہا۔ رخصت ہوتے وقت آبدیدہ ہوکر مجھ سے بغل گیر ہوئے۔

جوشؔ ملیح آبادی کی رندی و میخواری اور حکیم صاحب کے تقدس و ورع میں اتنا شدید بنیادی اختلاف تھا کہ ان دونوں محترم ہستیوں کا بیک وقت اور اس حالت میں کہ ایک بجبہ و دستار اور دوسرا جام بکف ہو ایک جگہ مجتمع ہوجانا امر محال تھا۔ مگر جوشؔ صاحب نے حکیم صاحب کی ادب پرست کمزوری اور ان کے محبت بھرے دل کی گہرائی کا جائزہ لے کر ایک ایسی اسکیم بنائی اور ایک ایسا ڈرامہ کھیلا کہ وہ امر محال ایک کھلا ہوا ممکن بن گیا حکیم صاحب کا جذبہ اخلاص و تواضع نے ہماری سیاہ کاری گوارا کی اور "شاعر انقلاب" کی بادہ خواری کو قہراً سہی مگر خندہ پیشانی کے ساتھ انگیز کر لیا۔ دوسرے روز وقت مقررہ پر میرے یہاں آئے لیکن جب رخصت ہونے کا ارادہ کیا تو جوشؔ نے ہاتھ پکڑ کر اپنے پہلو میں بٹھا لیا اور وہ بیٹھ گئے اور دیر تک شعر و شاعری سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ روز آنہ اس طرح کی بہت دلچسپ صحبتیں گھنٹوں رہتی تھیں۔ جن کا سلسلہ برسوں چلا۔ جوشؔ صاحب کبھی سنجیدہ کلام کرتے، کبھی اپنا کلام سناتے، کبھی فحشیات پر اتر آتے اور یہ سب کچھ قریب قریب ہر روز ہوتا تھا اور ہر وقت حکیم صاحب شریک رہتے تھے۔ ہر ہفتہ میں صرف ایک رات شب جمعہ ہوتی تھی جب ان کی عدم موجودگی ہم سب بری طرح محسوس کرتے تھے۔ وہ شب ان کے لیے زیارات دیجا دار کے لیے مخصوص رات ہوتی تھی۔ قارئین کرام کے پیش نظر جوشؔ کا سارا کلام ہوگا اس لیے وہ کیا کیا پڑھا کرتے تھے کوئی شعر یا نظم مثالاً پیش کرنا بھی بے سود ہے، ان کے نثری لطائف و ظرائف

کو عن وعن نقل کر دینا بھی مشکل ہے۔ اسی طرح اُن کے فحشیات کا نمونہ پیش کرنے کا بھی یہ موقع نہیں ورنہ
اُن کے ایک خط کا پورا متن درج کیا جا سکتا تھا۔ یہ خط انہوں نے میرے احتشام مرحوم اور حکیم صاحب
کے بارے میں ایک بار تحریر فرمایا تھا۔ خط میرے نام تھا، پشت پر دوسری عبادت حکیم صاحب کے نام
تھی جو ان کو دکھا کر خط محفوظ کر لیا گیا۔ یہ خط بھی ان کے دوسرے خطوط کے ہمراہ میرے پاس
محفوظ ہے۔

زبانی تفریحی گفتگو میں جو بے تکلف دوستوں سے ہلکی پھلکی بات چیت میں ہوتی تھی فحشیات
کا اس تہذیب و متانت کی دنیا میں بھی رواج تھا مگر اس آزادی پر بھی پابندیاں تھیں۔ صحبت میں
کوئی بزرگ، کوئی خورد یا کوئی ایسا دوست یا ملاقاتی آ جاتا جس سے بے تکلفی زیادہ نہ ہوتی
تو گالی بکنا عیب میں داخل تھا۔ اسی طرح آپس میں دوستوں کو گالی دینے میں بھی یہ خیال رہتا
تھا کہ اس بدکلامی کی چھینٹیں مخاطب کے بزرگوں پر یا اس کے چھوٹوں پر نہ پڑیں۔ عمائدین کے
دربار میں انھیں اصولوں کے تحت مصاحبین آپس میں گالم گلوج کر لیا کرتے تھے لیکن
رئوسا ایک تبسم زیر لب سے زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کرتے تھے عالموں اور ثقات کی محفلوں
میں گالیاں تو درکنار رکیک اور پست باتوں سے بھی سختی کے ساتھ اجتناب کیا جاتا تھا۔ بازار
میں یا بالاعلان شرفا میں بھی فحشیات کا دستور نہیں تھا حکیم صاحب کا شمار اہل ثقات میں تھا اور
وہ تھے بھی۔ ان کی زبان سے کبھی کوئی مبتذل لفظ نہیں نکلا مگر جوش صاحب نجی صحبتوں میں
ہم ایسے بے تکلفوں کو خوب خوب سناتے تھے جس کو ہم سب بخوشی خاطر قبول کرتے تھے۔ میرے یہاں
رات کی صحبتوں میں متعدد بار ساری صحبت اسی قسم کے تفریحی خرافات میں ختم ہو جایا کرتی تھی
ایسی ساری باتیں نظم میں ہوتی تھیں اور ایسے اشعار زیادہ تر جوش صاحب ہی فی البدیہہ اُس کو
سناتے تھے جو موجود ہو۔ کسی غائب کے بارے میں ایسی باتیں کہنا نہ صرف معیوب بلکہ گناہ سمجھا
جاتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کو یہ واقعات سننا بھی ناگوار ہو مگر ہم ایسے پرانی تہذیب کے
پرستاران فحشیات کو انھیں سا کے مخصوص محل و مقام پر سن کر بہت لطف اندوز ہوتے تھے ہماری

شام کی نشستیں ایسے ہی فحشیات کے سبب سے اور زیادہ پر لطف اور دلکش ہو جاتی تھیں لیکن ایسی تفریحیں مرف جوش کی بدولت نصیب ہوتی تھیں۔ سنجیدگی اور متانت سے فکری اور ذہنی مذاکروں یا شعر و سخن کی گرمیوں میں حکیم صاحب کا بھی برابر کا حصہ تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ساری رونق جوش اور صاحب عالم کے دم سے تھی صاحب عالم کے شریک ہونے کے قبل ان انجمنوں میں شوریت تھی مگر لحن نہیں تھا' ہرا ہرا گلشن تھا مگر بہار نہیں تھی اس کے علاوہ اشعار کی داد زبان و عمل سے دینے والا حکیم صاحب کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ کئی دن وہ لذیذ غذاؤں سے تواضع کرتے تھے۔ یہ چیزیں مخصوص طور پر ان کے گھر سے پک کر آیا کرتی تھیں جن سے صرف بادہ کشانِ خوش کام ہی لذت اندوز ہوتے تھے۔ سامعین میں بڑی تعداد حضرات ثقات کی ہوتی تھی جو اس بزم میں صرف ضیافتِ گوش کے قائل تھے۔ لذت زبان ان کے عقیدۂ حرمت شراب نے ان پر حرام کر رکھی تھی۔ اسی سلسلے میں بے شمار دعوتوں میں سے ایک تواضع کا واقعہ دلچسپ بھی ہے اور حکیم صاحب کی کریم النفسی اور دریادلی کی بہترین مثال ہے۔ جوش صاحب قریب قریب ہر شام کو اپنا کلام سناتے تھے۔ سننے والے اگر صاحب مذاق ہوں اور ان سے شاعر کو صحیح داد ملنے کی توقع ہو تو اس کا دل بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنا اچھے سے اچھا کلام بہتر سے بہتر طریقے پر ایسے لوگوں کو سناتا ہے۔ یہی حال ہمارے یہاں تھا سننے والے سب ہی بلند ترین مذاق کے حامل تھے اور سخن فہمی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے جوش صاحب بھی پوری طاقت سے اپنا تازہ ترین اور بہترین کلام سنایا کرتے تھے۔ ایک شام کو انہوں نے اپنی وہ نظم پڑھی جس کے قوافی اور ردیف "جہاں میں تھا" "وہاں میں تھا" تھے۔ ساری نظم مرصع تھی مگر حاضرین اس شعر پر وجد میں آگئے۔

کنارِ آب جو میداں کے دھندلے کنارے پر محبت کا مکین کھوئے خراماں تھی جہاں میں تھا

حکیم صاحب نے بہت تعریف کی اور یہ شعر بار بار پڑھوایا اس نشست کی یہ آخری نظم تھی۔ جوش کی زبان میں جیسا کہ وہ اسی صحبت میں کہا کرتے تھے روحانیت ختم ہو کر مادیت کی باری آگئی تھی یعنی یہ کہ مے گساری ختم اور کھانا شروع ہونے کی منزل تھی دفعتاً جوش نے حکیم صاحب سے تفننِ طبع میں

کہا کہ کل کوئی اچھی چیز کھلاؤ تو اس سے بہتر نظم سناؤں گا حکیم صاحب بقرار ہو کر کرسی سے کھڑے ہو گئے اور کئی بار کہا "جو کہو وہ کھلاؤں گا" جوش نے برجستہ کہا "مرغ مسلم، فی کس ایک مرغ"۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ " فرمائش منظور لیکن یہ بھی بتا دو کہ کتنے مرغ آئیں گے اس لیے کہ یہاں کھانے والوں کی تعداد معین نہیں ہے کسی روز چھ سات ہوتے ہیں مگر کبھی کبھی بیس اکیس بھی ہو جاتے ہیں"۔ مختصر یہ کہ کافی غور و خوض کے بعد سات عدد مرغ مسلم کی تعداد طے ہو گئی۔ دوسرے روز حکیم صاحب نے صرف سات مرغ مسلم ہی پکوا کے نہیں بھیجے بلکہ ان کے ساتھ کثیر تعداد اور مقدار میں گاؤ زبانیں اور بالائی بہت عمدہ قسم کی بھیجی۔ بادہ آشاموں نے اس روز اپنے پیٹ کو اپنا پیٹ نہیں سمجھا اور انتقامی جذبہ کے ساتھ خوش خوراکی کی حد توڑ دی۔ حکیم صاحب اور دیگر حاضرین کی قسمت میں " دور کا جلوہ" شامل حال رہا۔

حکیم صاحب عالم مرحوم کی محبت و اخلاص اور جذبۂ تواضع کا بہت کچھ ذکر اوپر آ چکا لیکن ان کی شرافت نفس کا مختصر ذکر بھی مگر کچھ بیان آ جانا بھی ضروری ہے۔ ہم میں سے بعض بادہ نوش ایسے بھی تھے جو تنگ حوصلہ اور تنگ ظرف تھے ان کے لغویات کو جوش کنٹرول کرتے رہتے تھے پھر بھی وہ کبھی کبھی اتنے بد لگام ہو جاتے تھے جس کو متانت اور شرافت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ حکیم صاحب ایسے مواقع پر زبان سے کبھی کچھ نہیں کہتے تھے۔ البتہ شائستگی کے ساتھ اہل ورع ساتھیوں کی طرف مخاطب ہو کر انتہائی سادگی کے ساتھ جوش کی توجہ لغویات کی طرف مبذول کرا دیتے تھے ان کے اس مہذب کردار کی مثال ملنا بہت دشوار تھا۔ ایسی لغویات کے ہم لوگ بھی مجرم ہوتے تھے مگر صرف ایک مرتبہ جس کے نتیجے میں حکیم صاحب کو غیر معمولی زحمت اور ہم سب کو غیر معمولی خفت برداشت کرنا پڑی تھی۔ ایک رات کو نشست ختم ہونے کے بعد جب ہم ایک دوسرے سے رخصت ہونے لگے تو حکیم صاحب نے جوش سے کہا کہ تم لوگ کھانا کھاتے رہتے ہو۔ ہم دیکھا کرتے ہیں، جی چاہتا ہے کہ ایک وقت تمہارے ساتھ کھانا کھائیں" جوش صاحب نے فرمایا کہ جب کہو انہوں نے کہا کہ کل دوپہر کو ہی سہی،، جوش صاحب نے منظور کر لیا اور یہ بھی وعدہ ہو گیا کہ وہ

رئیس احمد خاں اور مجھ کو ساتھ لے کر ان کے یہاں ایک بجے دوپہر تک پہنچ جائیں گے۔ شومیٔ قسمت
سے اس گفتگو اور ایسے معاہدہ کا مجھے علم نہ ہوسکا اور جوش صاحب نے رات کی ساری بات
دن کو بھلا دی۔ انہوں نے اپنے گھر پر اور میں نے اپنے یہاں کھانا کھا کر فراغت حاصل کرلی
مگر حکیم صاحب مع اپنے دیگر احباب کے کھانا تیار کرائے برابر انتظار کرتے رہے بالآخر دو بجے
مجھے رقعہ لکھ کر حالات سے مطلع کیا۔ میں فوراً جوش کے یہاں گیا ان کو اور رئیس احمد کو ساتھ
لے کر حکیم صاحب کے یہاں پہنچا تو سہ پہر کے ۳ بج رہے تھے، دس بارہ حضرات جو مدعو تھے
بھوکے بیٹھے تھے اور حکیم صاحب خود بڑی پر تکلف دعوت کا انتظام کئے ہوئے بیحد ملول ہم لوگوں
کے انتظار میں مایوسی کی حد تک پہنچ چکے تھے۔ مگر واہ ری شرافت نفس اتنی بڑی لغویت کو
بھی انھوں نے ہم لوگوں کو دیکھ کر دو قہقہوں میں ٹال دیا۔ ہم بھی خجالت کے ساتھ حاضرین
سے معذرت خواہی کر کے مطمئن ہو گئے۔

اس گردش لیل و نہار میں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ چار ہم خیال، ہم مذاق اور ہم رنگ
دوست احباب ہمیشہ مل جل کر اور ہنس کے اپنی پوری زندگی گزار دیں، ہر بہار کے لئے خزاں اور
ہر وصال کا خاتمہ ہجر پر ہوتا ہے۔ پھر بھی ہماری یہ نشستیں اور ملاقاتیں بہت دنوں تک چلتی
رہیں مگر بالآخر ختم ہو کر رہیں۔ جوش کے لئے کسب معاش کی ضرورت سخت سے سخت تر ہوتی
گئی۔ حصول آزادی کے بعد جب حکومت قومی نمائندوں کو تفویض ہوئی تو ہر شعبہ کا انتظام
ہمارے ہاتھوں میں آیا۔ مرکزی حکومت کے ماہانہ اردو رسالہ کے لئے ایک اچھے مدیر کی
ضرورت پیش ہوئی اور اس جگہ پر جوش کا تقرر ہو گیا۔ وہ دلی چلے گئے۔ تخمیناً ایک سال کے
بعد کچھ دنوں کے لیے لکھنؤ آئے اور ہم لوگوں نے ایک بار پھر مل بیٹھنا مناسب اور ضروری سمجھا۔
اس صحبت میں سب پرانے دوست تھے اور بہت سے نو وارد بھی تھے۔ جوش صاحب کے چلے جانے
کے بعد میرے مکان کی ہیئت بدل گئی تھی وہ قطعۂ زمین جو پہلے سبزہ زار تھا اور جہاں شام کو ہماری
نشستیں ہوا کرتی تھیں اب میں نے اس کو زیر کاشت کر لیا تھا۔ مجھے ترکاریاں بونے کا شوق

بچپن ہی سے تھا جو عہد شباب میں عدیم الفرصتی کے سبب سے چھوٹ گیا تھا۔ جوشؔ کے چلے جانے کے بعد فراغت کی بہتات نے اس ذوق کی طرف پھر آمادہ کر دیا جس کے نتیجہ میں کل جہاں ہم رندانِ بے پروا خرام بیٹھا کرتے تھے آج منظم کیاریاں بنی ہوئی تھیں جن کو دیکھ کر کچھ لوگ خوش ہوئے مگر جوشؔ نے صاحبِ عالم کو مخاطب کر کے برجستہ یہ شعر پڑھا۔

بچھتی تھی شعر و بادہ کی جس جا کبھی بساط
اب وہ زمین کھیت میں تبدیل ہو گئی

حکیم صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور یہ بزمِ افسردگی کی فضاؤں میں شروع ہو کر بہت جلد ختم بھی ہو گئی۔ وہی شاعرِ انقلاب تھا اور وہی پہلے والے سامعین مگر جدائی کے ایک بہت طویل وقفہ کے بعد یہ وصال نصیب بھی ہوا تو اس طرح کہ بہت جلد منتشر ہو جانے کا خدشہ سامنے تھا۔ گذشتہ بزم آرائیوں کے تسلسل کا حسن مٹ چکا تھا اور آئندہ کے لیے اتنی توقع بھی نہ تھی کہ کل پھر ایک دوسرے کے ساتھ اسی جگہ اور اسی مقصد کے لیے مجتمع ہو جائیں گے۔ بہرحال چند گھنٹوں میں مایوسیوں سے جتنی بھی مسرتیں نچوڑی جا سکیں نچوڑی گئیں اور وہ محفل اس طرح ٹوٹی کہ پھر کبھی ایک بار بھی جمنا نصیب نہ ہو سکا۔ جوشؔ صاحب کا دلی سے آنا بھی دو ایک بار ہوا تھا اس طرح کہ آج آئے اور کل چلے گئے دو روز کے لیے آئے تو ایک دن ملیح آباد میں گزارا اور دوسرے روز فرداً فرداً لکھنؤ کے دوستوں سے ملاقاتیں کر لیں۔ بالآخر وہ اُدھر ہی سے پاکستان منتقل ہو گئے۔ حکیم صاحب باقی رہ گئے مگر ان کے لیے دوسرا سفر مقدر ہو چکا تھا۔

حکیم صاحب کی وضعداری بھی اپنی آپ مثال تھی۔ میں نے جنوری ۱۹۴۲ء میں اپنے موجودہ مکان میں سکونت اختیار کی تھی اسی دن سے شاید ہی کوئی شام علاوہ ایامِ عزا یا کسی خاص معذوری کے ایسی رہی ہو جس دن وہ نہ آئے ہوں۔ جوشؔ کی محفلیں بند ہونے کے بعد بھی وہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ضرور قیام فرماتے تھے۔ آخری آنا ایسا تھا کہ نصف گھنٹہ سے زیادہ نہ ٹھہرے اس مختصر دورانِ قیام میں وہ زیادہ تر خاموش رہے اور آخر میں خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گئے۔ ان کے بدلے ہوئے حالات کو نہ صرف میں نے بلکہ میری کم سن لڑکی نے بھی محسوس کیا تھا۔ اس نے

اپنی ماں سے فی الفور یہ جملہ کہا کہ "آپ آج کچھ بہت پریشان ہیں۔ میں نے طے کیا تھا کہ صبح کو جا کر تنہائی میں تفکر و تردد کی وجہ دریافت کروں گا مگر رات ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ دو بجے جگا دیا گیا۔ حکیم صاحب بیمار تھے اور مجھے فوراً یاد کیا تھا میں بلا تاخیر پہونچا تو دیکھا کہ درد دل کی وجہ سے شدید کرب میں تڑپ رہے تھے ڈاکٹر آتے گئے۔ انجکشن لگتے گئے، دوا علاج ہوتا رہا مگر نہ مرض گیا اور نہ کوئی قابل لحاظ افاقہ ہوا۔ ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ مرض جان کے ساتھ رہے گا، قلب کے سسٹم کو جو نقصان پہنچ چکا ہے اس کا ازالہ کرنا ناممکن ہے۔ خود بھی حکیم تھے اپنی حالت اچھی طرح سمجھتے تھے اس لئے دنیا کو ہر وقت خیرباد کہنے کے لئے آمادہ رہنے لگے۔ پھر نہ کبھی چہرے پر بشاشت آسکی اور نہ ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ میل ملت کا وہ دلدادہ جو ہر وقت دوستوں کی صحبت کا متلاشی رہتا تھا اب دائمی طور پر گھر کی چار دیواری اور تنہائی میں مقید رہنے لگا تھا عیادت کرنے والوں سے بھی دو چار جملوں سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ گھر میں ان کے علاوہ صرف ایک دائمی مریض ان کی اہلیہ رفیقۂ حیات تھیں ان کے صاحبزادگان پاکستان میں برسر ملازمت تھے۔ اُن کو یہاں کے حالات معلوم ہوئے تو وہ لوگ آکر اپنے والدین کو ساتھ لے گئے۔ کچھ دنوں کے بعد یہ خبر ملی کہ حالت رو باصلاح ہے۔ مگر بہت جلد یہ بھی سن لیا کہ اچھے خاصے تھے، جوش ملیح آبادی جو بہت پہلے سے پاکستان منتقل ہو چکے تھے، ان سے ملنے آئے، ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ دوران گفتگو میں کسی بات پر ایک قہقہہ مارا اور فوراً حرکت قلب بند ہو گئی۔ یعنی یہ کہ ہنس بول کر اس دنیا سے چھلانگ ماری اور دوسری منزل آباد کر لی۔

پاکستان جانے کے بعد ہمارے درمیان صرف ایک بار مراسلت کا موقع مل سکا تھا انہوں نے تحریر فرمایا تھا کہ پاکستان خرستان ہے یہاں دل نہیں لگتا، کوئی معقول صحبت نہیں ہے پھر اسی لئے میں نے اپنی قومیت نہ بدلی ہے اور نہ بدلنے کا ارادہ ہے۔ قسمت نے ساتھ دیا اور اچھا ہو گیا تو پھر آؤں گا اور تم لوگوں سے ملاقات ہو گی۔ یہ خط اس قلیل وقفہ میں لکھا تھا جب قدرے افاقہ محسوس کر رہے تھے بہر حال یہ ثابت ہے کہ ان کو اپنے وطن عزیز

سے تعلق خاطر تھا اور اُن کے دل میں ہندستان واپس آنے کی حسرت تھی مگر یہ تمنا اس لیے پوری نہ ہو سکی کہ ہمارے پرانے تمدن اور ہماری معاشرت کی اس آخری یادگار کو کراچی کی خاک کا پیوند ہونا تھا۔ وہ نہ صرف عمائدینِ لکھنؤ بلکہ شرفائے لکھنؤ کی بھی مکمل اور بے نقص تصویر تھے۔ ان کے ایک مخلص دوست اور ایک ہوشمند قدر داں کی حیثیت سے جب ان کی یاد کرتا ہوں تو اُن کی خوبیوں کا احاطہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ واقعات اس تیزی کے ساتھ حافظہ میں ابھرتے ہیں کہ ایک پر پوری طرح نظر جمنے نہیں پاتی کہ دوسرے محاسن سامنے آجاتے ہیں۔ یہ سوچ کر عقل دنگ ہو جاتی ہے کہ ایک چھوٹے سے انسان کے دل میں کتنی وسعتیں تھیں اور اس کی محبت میں کتنی گہرائیاں تھیں، کہنا پڑتا ہے کہ۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ڈاکٹر ہکّو

پنڈت ہری ہر ناتھ ہکّو شہر لکھنؤ کے ان ممتاز ڈاکٹروں میں تھے جن کی یاد ایک مدت تک تازہ رہی۔ وہ غریبوں کے ڈاکٹر کہلاتے تھے اور ان کا رہن سہن، اخلاق و کردار، وضع قطع، رفتار و گفتار سارے طور طریقے ایسے تھے کہ لکھنؤ کا باشندہ نہ ہوتے ہوئے بھی ان کو لکھنؤ کلچر کا نمائندہ بجا طور سے سمجھا جاتا تھا۔

۷ فروری سنہ ۱۹۵۷ء کا وہ منحوس دن مقاجب شہر فیض آباد میں شام کے وقت مجھے نیشنل ہیرالڈ موصول ہوا تو پہلے ہی صفحہ پر میری نظریں ڈاکٹر ہکّو کی تصویر اور ایک ایسی خبر کی طرف کھنچ گئیں جس کو میرا دل کسی طرح بھی یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ڈاکٹر ہکّو قتل کر دیئے گئے، مجھ پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا اور فالج کی طرح کی ایک کیفیت پیدا ہو گئی۔ کچھ لمحوں کے لئے تو ایسا محسوس ہوا تھا کہ قلب کی حرکت بھی بند ہو گئی ہے۔ کیا یہ خبر غلط ہے! یا یہ کہ جن ڈاکٹر ہکّو کو قتل کر دیا گیا ہے وہ کوئی اور تھے۔ میرے ڈاکٹر ہکّو نہیں ہو سکتے! مگر ڈاکٹر ہکّو حقیقتاً قتل کر دیئے گئے تھے۔ بالآخر دل کی گہرائیوں سے آنکھوں کے راستے، جن کی روشنی میرے لرزتے ہوئے ہاتھوں والے اخبار نے چھین لی تھی، بے تحاشہ بہتے ہوئے آنسوؤں نے یہ بات سمجھا دی کہ میرا غم صحیح تھا اور ڈاکٹر ہکّو اپنے دوستوں اور پرستاروں کے درمیان یقیناً باقی نہیں رہ گئے تھے۔ اس یقین کے بعد ایک طرح کی گم شدگی چھا گئی جس نے میرے احساسات کو کافی دیر تک معطل رکھا۔ گھنٹوں کے بعد میں ٹوٹے ہوئے دل کو قابو میں لا سکا اور دکھ رسیدہ دماغ کی پریشان صلاحیتوں کو مجتمع کر سکا۔

مجھے یہ کہنے میں ذرہ برابر بھی باک نہیں ہے کہ ساری عمر میں ایسا دکھ کبھی نہیں اٹھایا تھا جتنی اذیت اس روز ہوئی۔ وقت تمام زحمتوں کو محو کر دیتا ہے۔ اور زمانے کی تیز رفتاری کے ساتھ انسان کی بڑی بڑی تکلیفیں بھی زائل ہو جاتی ہیں۔ لیکن میری عمر کا جو حصہ باقی رہ گیا ہے وہ اتنا قلیل ہے کہ یہ زخم شاید ہی کبھی مندمل ہو سکے یا یہ اذیت کبھی بھی دماغ سے پوری طرح بھلائی جا سکے۔ کیونکہ ہر خوش و ناخوش مواقع پر ان کی یاد آجانا ناگزیر رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں ڈاکٹر ٹھکو کے ایسے دوست اور ایسے انسان کو کبھی بھی نہیں بھلا سکتا اور نہ ان کی جدائی کا داغ کبھی بھی مٹ سکے گا۔ اس لئے تسکین خاطر صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ میں گذشتہ ان بتیس ۳۲ سال کے واقعات کی یاد تازہ کروں جس زمانہ میں میری ان سے پہلی بار ملاقات ہوئی پھر میرے اور ان کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم ہوئے اور مجھے ان کو نہ صرف ایک قابل طبیب بلکہ ایک جلیل القدر انسان ہونے کی حیثیت سے دیکھنے اور سمجھنے کے مواقع ملتے رہے۔

ڈاکٹر ٹھکو سے میری ملاقات ۱۹۲۲ء میں پہلی بار ہوئی جب انہوں نے لکھنؤ آکر طبابت کا پیشہ نیا نیا شروع کیا تھا اور میں بی۔ اے فائنل کا طالب علم تھا۔ اس زمانے میں طالب علموں کو نہ صرف کورس کی کتابوں کے مطالعے سے شغف رہتا تھا بلکہ دوسرے علوم و فنون کی معلومات جاننے رہنے کا بھی ذوق ہوتا تھا۔ چنانچہ مجھے غالباً اس لئے کہ اپنے وقت کے حاذق ترین طبیب کا نواسہ ہونے کا شرف حاصل تھا، مختلف انسانی بیماریوں کے اسباب، علامات، ابتدائی تدارک اور علاج جاننے اور سیکھنے کا بے حد شوق تھا۔ میرے لئے ڈاکٹر ٹھکو کی ملاقات نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ وہ جاہلوں کو بھی پیچیدہ اور دقیق باتیں سکھانے میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کا مطب ایک لکچر روم ہوتا تھا جہاں وہ اپنے مریضوں کو حفظان صحت کے اصولوں کی تعلیم دینے اور مختلف بیماریوں سے بچنے کے ابتدائی طریقے سکھایا کرتے تھے۔ میں نے مسلسل تین برس تک ان کے مطب میں روزانہ از ابتدا تا انتہا حاضری دی اور بہت کچھ ان سے سیکھ لیا۔ اس کے بعد میں نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا مگر پھر بھی جب مجھے فرصت ملتی یا میں اپنے ذوق کو آسودگی فراہم کرنے کے لئے وقت نکال سکتا تو ایسے

وقفے انھیں کے مطب میں یا انھیں کی ملاقاتوں میں صرف کر دیتا تھا۔ سنہ ۱۹۲۲ء سے لے کر سنہ ۱۹۵۴ء تک شاید ہی کبھی ایسے مسلسل دس دن گزرے ہوں جب میری ملاقات ان سے نہ ہوئی ہو۔ اگر کسی عذر معقول کی بنا پر میں نہ جا سکتا تو وہ خود آتے تھے۔ اس طرح یہ میری خوش نصیبی تھی کہ مجھے اُن کی سیرت کو بہت قریب سے دیکھنے کا پوری طرح موقع ملا۔ یہ شرف غالباً بہت کم لوگ حاصل کر سکے اس لئے کہ باوجود انتہائی خوش اخلاق ہونے کے ڈاکٹر ٹھکو سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کا بہت کم لوگوں کو موقع ملا تھا۔ اول تو وہ بہت کامیاب طبیب تھے، پیشہ کی مصروفیت سے ملنے ملانے کے لئے وقت نکالنا دشوار تھا۔ دوسرے یہ کہ طبیعتاً دیر آشنا تھے۔ یہی سبب تھا کہ ان کی ملاقاتیں صرف معدودے چند دوستوں سے ہو جایا کرتی تھیں۔

ان بتیس ۳۲ برسوں کے تعلقات اور دوستی کے زمانے میں وہ مجھ پر ہمیشہ مہربان رہے۔ حقیقی بڑے بھائی کی طرح شفیق اور ایک پرخلوص دوست کی سی محبت رکھتے تھے۔ بہرکیف میں اس موقع پر ان خصوصیات کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتا جو مجھے ان سے حاصل تھے اس لئے کہ یہ سارا موضوع ذاتیات سے متعلق ہو جائے گا۔ میں صرف اُن کے سوانح حیات سے چند ایسے واقعات پیش کر دینا چاہتا ہوں جن کے تجربہ کے بعد میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر ٹھکو ایسی شخصیت کے مالک تھے جس کی مثال انتہائی شریف النفس اور مقتدر ترین ہستیوں میں بھی کم ملتی تھی۔ موجودہ مادّی دور میں جب آدمی صرف اپنی ضروریات کو بھی مشقت کر کے بہ مشکل پورا کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر ٹھکو یہ مثال قائم کر گئے ہیں کہ آدمی کو بنی نوع انسان کی برادری کا ایک جزو ہوتے ہوئے اپنی مشقت کی کمائی میں غربا و مستحقین کو بھی شریک رکھنا چاہیے اور اپنی ضروریات کو پورا کرنے میں دوسروں کے ضروریات کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے اور انسانی ہمدردی کے اس جذبہ کو مذہب ملت، ذات پات اور اسی قسم کے کسی اختلاف سے متاثر نہ ہونے دینا چاہیے۔

ڈاکٹر ٹھکو نے طبابت شروع کرتے ہی آمدنی کے بہت سے ذرائع اپنے اوپر بند کر لئے تھے۔ وہ مطب میں اپنی کسی خدمت کا معاوضہ نہیں لیتے تھے۔ پیشاب وغیرہ کا معائنہ، انجکشن لگانا، چھوٹے

آپریشن کر دینا، اپنے مریضوں کو جائز اور صحیح سرٹیفکٹ دینا، یہ سب کام بلامعاوضہ کرتے تھے۔ جھوٹا اور غلط سرٹیفکٹ ان سے کسی حالت اور کسی قیمت پر بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ گھروں پر جاکے جن مریضوں کو دیکھتے تھے ان میں ڈاکٹروں، حکیموں، ویدوں، ہر مذہب کے مذہبی لیڈروں، طالب علموں اور ایسے تمام مریضوں سے جن کو وہ غریب جانتے یا سمجھتے تھے کوئی فیس قبول نہیں کرتے تھے۔ فیس اور بلا فیس والے تمام مریض ان کی توجہ میں برابر کے حقدار رہتے تھے۔ انھوں نے اُن کے درمیان کبھی کوئی امتیاز نہیں برتا۔ کبھی کسی امیر کی جیب پر نظر نہیں رکھی اور ہمیشہ اپنے ہر مریض کو جلد تر اچھا کرنے کے فکرمند رہے۔ پیچیدہ امراض والوں کے لئے یہ فکر مندی اور زیادہ شدید رہتی تھی۔

غریبوں پر ڈاکٹر ٹھکو کی دلجویانہ توجہ خصوصیت کے ساتھ زیادہ ہوتی تھی۔ اس سلسلہ میں بعض واقعات آج کی دنیا والے غالباً آسانی سے باور نہ کریں گے لیکن یہ واقعہ ہے کہ اُن کا مطب، غریبوں کے لئے بہت بڑا سہارا تھا۔ وہ کبھی اس کو جائز نہیں سمجھتے تھے کہ اپنے غریب مریضوں کو چھوڑ کر فیس دینے والے مریض کو دیکھنے چلے جائیں صرف یہی ایک واقعہ ان کی عظمت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔ حالانکہ ایسے بکثرت واقعات آج بھی یاد آتے ہیں۔

مہاراجہ سر محمد علی محمد خان والی محمود آباد کے صاحبزادے علیل ہوئے۔ مہاراجہ مرحوم بہت بڑے اقتدار و منزلت کے مالک تھے اور جو صاحبزادے علیل تھے وہ چھوٹی مہارانی صاحبہ مرحومہ کے بڑے فرزند ارجمند محمود حسن خان سلمہ اللہ تعالیٰ تھے۔ یہ صاحبزادے تپ میعادی میں مبتلا تھے اور کہا گیا تھا کہ کچھ پیچیدگیاں بھی ہو گئی تھیں۔ شہر کے تمام ممتاز ڈاکٹروں کی ایک کانفرنس طبی مشورے کے لئے طلب کی گئی۔ انھیں ڈاکٹروں میں ڈاکٹر ٹھکو کو بھی بلایا گیا۔ آٹھ بجے صبح سے گیارہ بجے دن تک متعدد فرستادہ لوگ ڈاکٹر ٹھکو کو بلانے آئے اور ہر ایک کو انھوں نے یہی جواب دیا کہ وہ مطب ختم کر کے بلاتاخیر وہاں پہنچ جائیں گے۔ ساڑھے گیارہ بجے پھر ایک صاحب موٹر لے کر آئے اور یہ اصرار کیا کہ فوراً چلئے "سرکار ابھی یاد کر رہے ہیں"۔ ڈاکٹر ٹھکو نے

جواب دیا کہ سرکار سے بہت بہت آداب و تسلیمات کے بعد عرض کر دیجئے کہ "حضور والا بڑے آدمی ہیں
جس کو بھی آپ سولہ ۱۶، بتیس ۳۲، چونسٹھ روپئے دے دیں گے وہ آپ کے یہاں فوراً آجائیگا لیکن میرے لئے
یہ دشواری ہے کہ یہ بہت سے غریب جو چھکڑوں اور لڑھیوں پر دور دور سے میرے پاس آئے ہیں
ان کو میں یہاں کس کے سہارے چھوڑ دوں۔ ان کو دیکھ کر ہی آسکوں گا"۔ وہ صاحب یہ
جواب لے کر چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹیلیفون پر یہ ہدایت ملی کہ اب آپ زحمت نہ کریں۔
ڈاکٹر نے انتہائی خندہ پیشانی اور پورے اطمینان کے ساتھ یہ ہدایت گوارا کرلی۔ اس واقعہ
کے بعد اس ڈیوڑھی سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق ہو گیا

ان کی طبیعت بجد مستغنی تھی۔ لیکن اس استغنا اور ان قیود کے باوصف جو انہوں نے
اپنے اوپر از خود عائد کر لی تھیں۔ ایک زمانہ میں ان کی آمدنی بہت وافر تھی۔ آخر عمر میں جب
کہ خرابی صحت کی وجہ سے انہوں نے پیشہ کی مصروفیت میں کمی کر دی تھی تب بھی وہ شہر کے مشغول
ترین ڈاکٹروں میں تھے۔ اپنی بے پناہ استعداد، غیر معمولی ذہانت و ذکاوت، پیشہ میں پوری صداقت
کے ساتھ انہماک اور سب سے بڑھ کر اپنے اس مقدس جذبہ کی بدولت کہ بیمار اور دکھی انسانوں
کی خدمت ان کا فریضہ ہے، وہ نہ صرف لکھنؤ بلکہ پورے صوبہ میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک
ہو گئے تھے۔ یوں تو وہ ہر قسم کے بخاروں، عورتوں اور بچوں کے مخصوص امراض کے ماہر تھے۔
لیکن ان کو تمام بیماریوں کے علاج میں ملکہ ہو گیا تھا۔ اور صحیح تشخیص کے لئے غیر معمولی شہرت
کے مالک تھے۔

میرا شمار نہ ڈاکٹروں کے زمرہ میں کیا جا سکتا ہے اور نہ مجھے اس کا حق ہے کہ میں امراض اور
ان کے معالجے کے بارے میں کوئی بات بھی ذمہ دارانہ حیثیت سے کہہ سکوں لیکن اپنے گھر کا صرف ایک
واقعہ ایسا ضرور بیان کروں گا جس نے بڑے بڑے ڈاکٹروں کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ میرا برادر
نسبتی شدید ترین تپ دلرزہ میں مبتلا تھا اور ایک پیر میں سخت اینٹھن تھی۔ اس کے علاوہ
بیماری کی اور کوئی علامت نہ تھی۔ سب سے پہلے ڈاکٹر نگم نے دیکھا انھوں نے تشخیص کی کہ

مثانہ میں پھوڑا بن رہا ہے لہٰذا کسی سرجن کا علاج ہونا چاہئے۔ میرے خسر مرحوم نے اس کے بعد متعدد ڈاکٹروں کو بلایا جن میں سول سرجن کرنل ہنٹر بھی شامل تھے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ڈاکٹر ٹھکو کی رائے سے متفق نہ ہو سکا۔ ہر ایک نے علیحدہ علیحدہ تشخیص کی۔ کسی نے ملیریا، کسی نے ٹائیفائڈ تجویز کیا۔ کرنل ہنٹر کسی خاص نتیجہ تک نہیں پہنچ سکا اور صرف یہ مشورہ دیا کہ لڑکے کو فوراً اسپتال میں بھرتی کر دیا جائے۔ اس زمانے میں ہسپتال اور عمل جراحی کے مشورے ہمارے خاندان میں آسانی کے ساتھ منظور نہیں کئے جا سکتے تھے اس لئے چار پانچ دن اور دوسرے ڈاکٹروں اور حکیموں سے مشورہ حاصل کرنے میں گزر گئے۔ دفعتاً ایک شام کو پیشاب میں بکثرت مواد مریض نے خارج کیا جس کا سلسلہ رات بھر جاری رہا۔ اور اس کے بعد چوبیس گھنٹوں میں ڈاکٹر ٹھکو کی پینے کی دوا سے مریض بالکل صحت یاب ہو گیا۔ مجھے مبارکباد کا وہ ایک خط یاد ہے جو اس صحیح تشخیص کی قدر دانی میں کرنل ہنٹر نے ڈاکٹر ٹھکو کو لکھا تھا۔

ڈاکٹر ٹھکو کی تشخیص کے بارے میں یہی ایک واقعہ میرے علم میں نہیں ہے۔ بلکہ ایسے اور بہت سے دوسرے واقعات میرے حافظے میں تازہ ہیں جب کہ ان کی تشخیص نے کرنل ڈلو کرنل بکلے میجر ایبراسن اور انھیں کے ایسے دوسرے ماہرین فن اور مقتدر و مستند ڈاکٹروں کو حیرت میں ڈال دیا تھا اور ان باکمالوں نے ان کی اہلیت و قابلیت کا اعتراف بھی کیا تھا۔ لیکن میں اس کا اہل نہیں ہوں کہ ان کے کمالات پر فنی تبصرہ کر سکوں۔ میری اصل غرض صرف اس قدر ہے کہ میں ان کے فنی کمالات کا بھی اُن کی انسانی ہمدردی کے تحت تذکرہ کروں اسی لئے مجھے بار بار ان غریب مریضوں کے حالات یاد آ رہے ہیں جو اُن کو ہر وقت گھیرے رہتے تھے اور جن سے ان کو بیحد ہمدردی تھی۔ اُن کا لقب ہی پڑ گیا تھا۔ "غریبوں کا ڈاکٹر"

غریب مریضوں پر ہمدردانہ توجہ کے ساتھ ڈاکٹر ٹھکو ان میں یہ احساس بھی پیدا کر دیتے تھے کہ ان کا ٹھیک علاج ہو رہا ہے۔ غالباً یہی احساس اُن کے جلد شفا ہو جانے کا ایک وسیلہ

بھی ہو جایا کرتا تھا۔ وہ قیمتی سے قیمتی دوائیں بھی غریبوں کو مفت تقسیم کر دیتے تھے اپنے مرنے سے کچھ قبل یعنی ماہ جنوری کے آخر میں انھوں نے اپنے ایک غریب مریض کو جو کسی دور کے دیہات سے آیا ہوا تھا، کلوروما ئسٹین کی گولیاں، جو اُس زمانے میں بہت گراں تھیں، برابر مفت کھلائی تھیں اُس کو میعادی بخار میں پیچیدگیاں تھیں اس لئے انھوں نے اور زیادہ ہمدردی کر کے علاج کیا۔ دوا کے علاوہ دوسرے ضروری اخراجات کے لئے بھی خود ہی کفیل رہے ہے اور اُن کا حق الخدمت وہ مسرت تھی جو اس کو صحت یاب کر کے انھوں نے حاصل کی کہنا پڑتا ہے کہ غریبوں کے ساتھ ان کی ہمدردیاں حقیقتاً ان کے شریف و نرم احساسات کا مظاہرہ ہوتی تھیں جو وہ انسانوں کے دکھ درد کے لئے اپنے دل میں رکھتے تھے۔ دنیا کو ان کے اس قسم کے برتاوات کا پوری طرح علم بھی نہ ہو سکا۔ کیوں کہ انکے یہ احسانات غرباء کے شامل حال رہتے تھے جو ہر تن تشکر و امتنان ہوتے ہوئے بھی اُن کی نیک نامی و شہرت کے لئے کوئی موثر پروپیگنڈہ بھی نہ کر سکتے تھے محلہ لال کنواں میں ایک بوڑھے کاشتکار کا علاج کرنے کے لئے ڈاکٹر ٹھکو کو بلایا گیا تھا۔ میں اُن کے ہمراہ تھا۔ مریض زمین پر ایک ٹاٹ کے ٹکڑے پر پڑا تھا۔ اوپر جگہ جگہ نچے ہوئے چھپر کا سائبان تھا ایک پھٹی ہوئی بوسیدہ کتھری اوڑھے ہوئے تھا۔ وہ بوڑھا نمونیا کا مریض تھا۔ اس زمانے میں نمونیا بوڑھوں کے حق میں مہلک بیماری سمجھی جاتی تھی اور جو کارآمد زود اثر دوائیں آجکل فراہم ہیں اس زمانہ میں موجود نہیں تھیں مریض کا مرض اور تمام ماحول بیحد جان گداز تھا۔ ڈاکٹر نے سب سے پہلے ایک ٹوٹی ہوئی کھٹیا جو وہاں ایک کونے میں پڑی تھی، کسی نہ کسی طرح باندھ باندھ کے درست کی۔ پھر وہی ٹاٹ اور وہ کتھری جو وہ اوڑھے تھا بچھا کر مریض کو لٹایا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ اس موسم میں اُن کے موٹر میں عموماً دو کمبل ہمیشہ رکھے رہتے تھے جو قیمتی ہی ہوا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک کمبل آدھا بچھا کر بقیہ آدھے کمبل میں انھوں نے مریض کو لپیٹ دیا اور دوسرا کمبل بھی اسی جگہ چھوڑ دیا تاکہ رات کے وقت استعمال کیا جا سکے۔ اس مریض کی دوا و غذا کی کفالت انھیں کے ذمہ رہی اور تخمیناً پندرہ بیس روز

کی محنت کے بعد اس کی سفایابی میں انھیں بھرپور مسرت کی شکل میں حق الخدمت وصول ہوگیا۔

ایک اور واقعہ ایک دوسرے غریب مریض سے متعلق ہے جو پاٹا نالہ پر رہتا تھا۔ میری اہلیہ مرحومہ بیمار تھیں اور تقریباً ۱۲ بجے رات کو مجھے ڈاکٹر کو بلانے جانا پڑا وہ سو رہے تھے۔ میں نے جگایا اور ان کو سونے والے کپڑوں ہی میں لے کر روانہ ہو رہا تھا کہ ایک نوجوان نے آکر پاٹا نالہ پر ایک مریض کو جو اس کا باپ تھا دیکھنے کی استدعا کی یہ مریض ایک دوسرے ڈاکٹر کے زیر علاج تھا اور حالت دفعتاً خراب ہوجانے کی وجہ سے وہ لوگ علاج بدلنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر ہلکو نے دوسرے کی مریض کو اس ڈاکٹر کی عدم موجودگی میں اکیلے جاکر دیکھنے سے انکار کیا۔ وہ اس قسم کے طرز عمل کو فنی اخلاق کے منافی سمجھتے تھے۔ لیکن نوجوان لڑکے کی خوشامد اور اضطرب پر اُن کو ترس آگیا اور میں نے بھی متاثر ہو کر پہلے اسی مریض کو دیکھ لینے کی سفارش کی۔ وہ راضی تو ہو گئے مگر یہ بھی کہہ گئے کہ اس وقت میری فیس دونی ہوگی۔ لڑکے نے قبول کیا۔ وہاں پہنچ کر مریض کی حالت بہت خراب نظر آئی۔ ڈاکٹر نے مریض کا معائنہ کیا، نسخہ لکھا اور اس لڑکے کو ہدایت کی کہ فوراً دوا لائے تاکہ انجکشن دینے میں تاخیر نہ ہو۔ رات آدھی گزر چکی تھی، دواخانہ کھلوا کے دوا لاتے لاتے تخمیناً ایک گھنٹہ گزر گیا۔ ڈاکٹر نے یکے بعد دیگرے دو انجکشن لگائے اپنے ہاتھ سے دوا پلائی اور ہم لوگ وہاں سے کم و بیش دو گھنٹے کے بعد رخصت ہو سکے۔ چلتے وقت لڑکے نے حسب معاہدہ دونی فیس پیش کی لیکن ڈاکٹر نے یہ کہہ کر واپس کر دی کہ اپنے باپ کو پھل خرید کر کھلاؤ مجھے یہ خیال گزرا کہ غالباً مریض کا بچنا ناممکن ہے اس لئے اپنے اصول کے تحت فیس واپس کر دی ہوگی مگر میرے دریافت کرتے پر انہوں نے کہا کہ "گھر کی حالت دیکھ کر ترس معلوم ہوا۔ بہت دنوں تک علاج ہوگا تب اچھا ہوسکے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان لوگوں کو اُس علاج کے لئے گھر کے برتن تک بیچ ڈالنا پڑیں۔ اس کے بعد بھی انہوں نے اُس مریض کو متعدد بار اس کے گھر جا کر بلا فیس دیکھا اور اس کی شفایابی کے بعد بحد خوش و مسرور تھے۔

متذکرہ بالا واقعات مشتے نمونہ از خروارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر ہلکو کا دل بحید

درد مند تھا اور وہ ہر انسان کی تکلیف سے متاثر ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے مریضوں سے ہمدردانہ سلوک کرتے اور ہمیشہ یہ فکر رکھتے تھے کہ اُن کا مریض صحت یاب ہو جائے۔ ان کا پیشہ طبابت کا تھا لیکن اُن کو کسبِ زر سے زیادہ بیماروں کی جانیں بچانے کی فکر رہتی تھی۔ اُن کے بعض معاصر یہ کہتے ہوئے بھی سنے گئے تھے کہ ڈاکٹر مکو نے مریضوں کی ذہنیت خراب کردی ہے اور وہ ہر ڈاکٹر سے غیر ضروری توجہ کے خواستگار ہو گئے ہیں

اس عظیم المرتبت ہستی کا تذکرہ نامکمل رہ جائے گا اگر میں ان کی معاشرتی زندگی کو نظر انداز کردوں۔ اُن کے پاس پیشہ کی مشغولیت بہت تھی اس لئے وہ عام ملاقاتوں کے لئے وقت نہیں نکال پاتے تھے مگر وہ اس کمی کو وقت پڑنے پر پورا کر دیتے تھے۔ مریضوں کے یہاں ضرورت سے زیادہ وقت صرف کرتے تھے اور یہ زائد قیام عموماً سماجی معاملات اور عوام کے حالات سے متعلق تبادلۂ خیالات میں کارآمد ہوتا تھا۔ اُن کو پڑھے لکھے لوگوں اور سماجی کام کرنے والوں سے بہت انس تھا۔ انھیں لوگوں میں ان کے دوست اور پرستار ہوتے گئے، جس کا نتیجہ یہ ہو گیا تھا کہ وہ ملاقات جو مرض اور علاج کے سلسلے میں ہوتی آگے بڑھ کر دوستانہ تعلق میں مبدّل ہو جایا کرتی تھی۔ اُن سے بات کرنے میں مزا ملتا تھا۔ ان کا بلا تصنّع لب ولہجہ، اُن کی جبلی ہمدردی اور اُن کا فطری خلوص ہر اُس شخص کو جو ان سے ملاقی ہوتا اُن کا گرویدہ بنا لیتا تھا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ نہ صرف لکھنؤ بلکہ دور دور تک اُن کے پرستار اور بہی خواہ کثیر تعداد میں موجود تھے اور اُن کا دشمن، بجز اُس شخص واحد کے جس کی گردن پر اُن کا خون ناحق ہے، کوئی بھی نہ تھا۔

اُن کی خانگی زندگی بھی سادہ اور پاکیزہ تھی۔ اُن کی اہلیہ اور بچے کا انتقال اُن کے عنفوانِ شباب ہی میں، اُن کے ولایت بسلسلۂ تعلیم جانے کے قبل، ہو چکا تھا۔ انھوں نے دوبارہ شادی نہیں کی اور اپنی دو بھتیجیوں اور ایک بھتیجے کو مثل اپنی اولاد کے تربیت و تعلیم دی۔ شفیق باپ کی طرح دونوں لڑکیوں کی تعلیم سے فراغت کے بعد شادیاں کردی تھیں اور

بھتیجا بھی فارغ التحصیل ہو کر ولایت ہی میں برسرِ روزگار ہو گیا تھا۔ ان کا رہا سہا مختصر خاندان صرف اُن کی ایک ذات اور ایک ساٹھ سالہ بیوہ بہن پر مشتمل تھا۔ اس بیوہ بہن کی یہ بدنصیبی ہے کہ آج وہ اپنے پیارے بھائی کے غم میں سوگ نشیں ہے اور اس کو اب اللہ کے آسمان کے نیچے وہ آسائش اور ہمدردی کہیں نصیب نہ ہوگی جو اپنے عدیم المثال بھائی کی سرپرستی میں حاصل تھی۔

ڈاکٹر ٹھکو اپنے اس مختصر خاندان کے ساتھ اپنی زندگی کا آخری حصہ اپنی اس عالیشان کوٹھی میں گزار رہے تھے جس کے بارے میں ان کے پرخلوص دوست کبھی یہ نہ سمجھ سکے کہ انہوں نے اتنی بڑی عمارت کیوں بنوائی تھی۔ مرنے سے کچھ مدت قبل وہ ضرور یہ چاہتے تھے کہ کوٹھی کے مقابل اپنے باغ والی اراضی پر ایک چھوٹا ضرورت بھر بنگلہ بنا کر وہاں سکونت پذیر ہو جائیں اور اس کوٹھی کو رفاہ عامہ کے لئے مخصوص کر دیں۔ اس عمارت میں ایک ایسا کلنک قائم کرنے کا ارادہ تھا جہاں غریب مریضوں کے خون، پاخانہ اور پیشاب وغیرہ کے معائنے بلا فیس ہوتے رہیں۔ اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے نزول کے دفتر میں باغ کی اراضی پر بنگلہ بنانے کی اجازت حاصل کر لینے کے لئے درخواست بھی دیدی تھی اور تمام ابتدائی ضروریات کے لئے بقدر حاجت سرمایہ بھی اپنے پاس گھری میں محفوظ کر دیا تھا لیکن وہ کچھ چاہتے تھے اور ہونا کچھ اور تھا۔ نزول سے اُن کی خواہش کے مطابق حکم صادر ہو گیا لیکن قبل اس کے کہ حکم سے وہ مطلع ہوں قدر ناشناسیٔ زمانہ نے اُن کا خاتمہ کر دیا۔ ان کا منصوبہ دل ہی دل میں رہ گیا اور انکی جان کیساتھ وہ سرمایہ بھی جاتا رہا جو اپنی اس آخری تمنا کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے فراہم کیا تھا۔

ڈاکٹر ٹھکو کے قتل ہو جانے کے بعد یہ سمجھ میں آیا کہ کبھی کبھی بہت اچھا ہونا بھی بہت بُرا ہوتا ہے

پیشہ کے ضروریات سے فراغت کے بعد ہر روز گھر کے اندر ان کا مشغلہ کتب بینی

تھا یا باغوں کی نگرانی۔ ان کی املاک میں کوٹھی کے علاوہ ایک پائین باغ تھا جس میں پھل پھول اور ترکاریوں کا شوق پورا کرتے تھے اور دوسرا ایک بڑا باغ کوٹھی کے مقابل اور سرکاری سڑک کے دوسری جانب واقع تھا جہاں اجناس بھی بویا کرتے تھے۔ اسی باغ میں بنگلہ بنوانے کی حسرت تھی جو پوری نہ ہو سکی۔ یوں تو کبھی کبھی وہ شکار بھی کھیلا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شیر بھی مارا تھا اور چند مرتبہ کرکٹ بھی کھیلا تھا لیکن یہ سارے شوق وقتی تھے۔ البتہ باغبانی کا شغف بڑھتا ہی گیا۔ اس فن میں بھی ان سے میں نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ ترکاریاں بونے کا شوق بالخصوص ناسازگار آب و ہوا اور ماحول میں مخصوص ولایتی ترکاریاں پیدا کرنے کا ذوق ہم دونوں میں مشترک تھا۔ اس لئے یہ بات میرے ذاتی علم میں ہے کہ جہاں تک ترکاریوں کے بونے کا فنی معاملہ ہے اس ہنر میں ڈاکٹر ٹھکو کے تجربات و معلومات ہمارے بڑے بڑے ماہرین نباتات سے کہیں زیادہ تھے۔ بالخصوص ترکاریوں کو موسمی تبدیلیوں کا خوگر بنانے میں ان کو کمال حاصل تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ اس موضوع پر اپنے تجربات لکھ ڈالیں گے لیکن افسوس ہے کہ وہ اس کام کے لئے وقت نہیں نکال سکے۔

ان کی طبیعت کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ باوجود فارغ البالی اور متعدد ملازمین موجود ہونے کے وہ اپنے جوتوں پر خود پالش لگاتے تھے، اپنے غسل کے لئے خود پانی بھرتے تھے اور کبھی کبھی اپنے کمرے کی صفائی بھی خود ہی کر لیا کرتے تھے۔ اُن کو السیشین کتوں سے بہت رغبت تھی۔ اس نسل کے کتوں کا ایک جوڑا ہمیشہ پلا رہتا تھا۔ آخری جوڑا اُن کے مرنے کے چند روز قبل اغلباً مار ڈالا گیا تھا۔ یہ کتے اُن کے سونے کے کمرے میں رہا کرتے تھے۔ اور اُن کے جان و مال کے محافظ ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر ٹھکو نے ان کتوں کے غلیظ اور اُن کی گندگی کو صاف کرنے کی اجازت اپنے ملازمین میں سے کبھی کسی کو نہیں دی اور وہ خود ہی اس کام کو بھی انجام دے لیتے تھے مجھے یقین ہے کہ بہت

سے لوگ اس بات کو باور نہ کریں گے اور مبالغہ سمجھیں گے۔ اگر میں یہ کہوں کہ اپنے ملازمین کے ساتھ ڈاکٹر ذاکر کا برتاؤ اپنی آپ مثال تھا اُن کے عفو و درگزر کی کوئی انتہا نہ تھی اور ان کا حلم و رحم لا محدود تھا۔ جب سر سے پانی اونچا ہو جاتا تھا تو جو سب سے پہلی اور آخری سزا وہ دے سکتے تھے یہ ہوتی تھی کہ نوکر کا حساب کر دیا جائے اور اس سزا کی نوبت متعدد بار چوریوں، بے ایمانیوں اور طرح طرح کی تکلیفیں پہنچا دینے کے بعد ہی آتی تھی۔

ملازمین اور بعض دوسرے متعلقین کے ساتھ ان کے بے غرضی اور نا مناسب حسنِ سلوک پر ان کو بار بار اُن کے بعض بے تکلف دوستوں نے جن میں راقم بھی شامل تھا متنبہ اور متوجہ کیا تھا اور یہ حقیقت گوش گزار کر دی تھی کہ اُن کی اپنے مال اور جائداد کے بارے میں بے توجہی بہت خراب نتائج بھی پیدا کر سکتی ہے مگر وہ ایسی گفتگو کو ہنس کر ٹال ہی دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسی گفتگو کا نہایت سنجیدگی کے ساتھ انہوں نے یہ جواب دیا تھا کہ میں ایماندار ہوں اور ان کے ساتھ میرا برتاؤ ایماندارانہ ہے۔ میں ہر ایک کے دیر پھر وسہ کرتا ہوں اب اگر وہ مجھے دھوکا دیتے ہیں تو اپنے اس کردار کے لئے وہ خود گنہ گار ہوں گے۔ جہاں تک میرے ضمیر کا تعلق ہے اُس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا البتہ اگر مجھے کوئی نقصان پہنچایا جا سکتا ہے تو وہ مالی نقصان ہے۔ اول تو میں مال و متاع کی ہوس سے پاک و صاف ہوں دوسرے یہ کہ میری ضرورتیں پوری ہونے کے لئے خدا نے مجھے بہت کافی دے رکھا ہے اور وہی خدا مجھے اور دے گا اس لئے کہ میرا ضمیر پاک اور میری سیرت میں نیکی ہے۔ اسی اصول پر وہ کاربند رہے اور اپنی زندگی اسی طرز سے گزار لے گئے۔ اپنے دوستوں کو بھی وہ برابر "دیانت" اور "اخوت" کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ ان مقدس اصولوں سے وہ خود کبھی عمر بھر میں منحرف نہیں ہوئے۔ اُن کی ذہانت کا ہر وہ شخص قائل تھا جس کا اُن سے برائے نام بھی کسی قسم کا کوئی تعلق ہو البتہ اُن کے جذبۂ اخوت کے قدر شناس وہی خوش نصیب تھے جنھوں نے اُن کو قریب سے دیکھا اور متعدد ملاقاتوں کے بعد دوستانہ روابط کا شرف حاصل کیا تھا۔

دوستوں اور ساتھیوں سے پرخلوص گفتگو کرنا اور ہمدردانہ برتاؤ کرنا سہل ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عندالضرورت مدد کرنے والا دوست مل جائے، ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ محبت اور دوستی میں ایثار و نفس کشی کی صلاحیتوں والا غمخوار بہم ہو جائے جو اپنے دوست کا پریشان حالی و ماندگی میں دست گیر ہوتا رہے۔ یہ اور اسی قسم کے اوصاف رکھنے والے دوست اس گر گئے گزرے زمانے میں بھی کہیں کہیں اور کبھی کبھی مل جائیں گے لیکن ایک ایسا انسان پانا بہت مشکل ہے جو اپنے دوستوں کی ضروریات اور تکالیف کے بارے میں از خود اس لئے تجسس کرتا رہے تاکہ اُن کی ضرورتوں کو فراہم اور تکالیف کو دور کر سکے اور یہ خدمات اپنے کو اذیت اور نقصان پہنچا کر انجام دے۔ ڈاکٹر ٹکو ایسے ہی ایک دوست تھے اور یہ خصوصیت بھی انھیں کے لئے یادگار رہی کہ اُن کا قاتل بھی وہی نکلا جو برس ہا برس تک اُن کے الطاف و کرم سے زیر بار رہا تھا۔ اگر وہ احسان و کرم کا مجسمہ تھے تو یہ شخص بھی احسان فراموشی میں اپنی آپ مثال ثابت ہوا

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

احتشام ماہلی

پروفیسر سید احتشام حسین قصبہ ماہل ضلع اعظم گڈھ کے ایک محترم اور برگزیدہ نبی سادات گھرانے میں پیدا ہوئے اسی قصبہ کی روشنی میں آنکھیں کھولیں اور وہیں کی ہواؤں میں پہلی سانس لی۔ قصباتی ماحول میں، جو سیادت و شرافت، سنجیدگی اور حسن اخلاق سے متاثر تھا بچپن کے دن گزارے۔ تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو اعظم گڈھ گئے وہاں بھی ادبی ماحول تھا طبیعت کی فطری صلاحیتوں نے کسب علم کی طرف متوجہ کیا تو قسمت کی ناموافقت نے باپ کا سایہ سر سے اٹھا لیا۔ اُن کی پوری زندگی پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ قدرت نے صبر و تحمل کے جوہر اُن کے ضمیر میں کوٹ کوٹ کر بھر دیئے تھے۔ یہ سچ ہے کہ چچا کی شفقتیں کچھ کم نہ تھیں۔ سید ابو محمد صاحب بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ اپنے ہونہار بھتیجے سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ اور یہ لائق بھتیجا بھی اپنے چچا کا جن کو وہ بڑے بابا کہتا تھا ہمیشہ پرستار رہا مگر باپ کی فطری شفقتوں سے محرومی یقیناً ایک بہت بڑی مصیبت تھی اس لئے کہنا پڑتا ہے کہ اعظم گڈھ اور اس کے بعد الہ آباد میں طالب علمی کا زمانہ سکھ سے نہیں گزرا ہوگا اور اسی زمانہ میں جو دکھ اٹھائے اُن کی آگ میں یہ سونا تپ کر ذہب خالص بن گیا۔ ابھی الہ آباد سے فارغ التحصیل ہو کر نہیں نکلے تھے کہ لوگوں کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ آنے والے درخشندہ دور کی تابانی اُن کی پیشانی میں اسی وقت سے جھلک رہی تھی۔

الہ آباد یونیورسٹی سے۔ ایم۔ اے پاس کرنے کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی

میں ملازمت مل گئی۔ گو کہ طالب علمی کا زمانہ الٰہ آباد ہی میں ختم ہوا تھا مگر اُن کے دل میں لکھنؤ سے نادیدہ کشش تھی۔ اس لئے ملازمت ملنے اور لکھنؤ میں ملازمت ملنے کی بیحد مسرت تھی لیکن اس مسرت کا مظاہرہ ان تعیش پرستیوں میں کبھی نہیں ہوا جس کے لئے یہ شہر معروف تھا۔ اُن کے اوقات کا مصرف یونیورسٹی میں تعلیم دینے، شاعروں اور ادیبوں سے ملاقاتیں کرنے اور لکھنے پڑھنے تک ہمیشہ محدود رہا۔ دماغ میں بلا کی ذہانت اور دل میں علم و ادب کے حصول کا لہریں مارتا ہوا سمندر ہمیشہ موجزن رہا۔ ان صلاحیتوں کی بدولت کتب بینی اور تصنیفات و تالیفات میں نہ دقت ہوتی تھی اور نہ زیادہ وقت صرف ہوتا تھا اس قسم کے کام جو دوسرے مہینوں میں کرتے احتشام مرحوم گھنٹوں اور دنوں میں مکمل کر لیتے تھے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ لکھنؤ یونیورسٹی میں چند برسوں کی مدت کے اندر ہی اُن کی تصنیفات اچھی خاصی تعداد میں مکمل ہو گئی تھیں۔ اور ان کی قابلیت اور لیاقت کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا۔ ہندوستان کے باہر بھی ان کی علمی شہرت پہنچ چکی تھی۔ امریکہ کا سفر اسی زمانہ میں ہوا تھا۔ ساحل و سمندر کی تکمیل ہونے کے بعد الٰہ آباد کے سنگم نے ان کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ پھر بھی راقم ذاتی معلومات کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہے کہ انہوں نے بادل ناخواستہ لکھنؤ کو خیر باد کہہ کر الٰہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسری کی جگہ کو قبول کیا تھا۔ یہاں انکی حق تلفی ہوئی اور اس کو انہوں نے اپنی حلیم و متحمل طبیعت کے سہارے انگیز کیا۔ مگر الٰہ آباد کی پروفیسری قبول کرنے میں بھی کوئی حرص و طمع یا کسی قسم کا بھی جذبہ حصول اقتدار و منفعت شامل نہیں ہوا۔ اگر ان کو مجبور نہ کر دیا گیا ہوتا تو وہ لکھنؤ یونیورسٹی کا عہدہ لکچرار الٰہ آباد یونیورسٹی میں منصب پروفیسری کے لئے ہرگز ہرگز نہ چھوڑتے۔ ان کی اولوالعزم فطرت میں بلا کی قناعت بھری ہوئی تھی۔

الٰہ آباد جا کر وہ خوش نہیں رہے۔ حالات مزاج کے مطابق نہیں رہے۔ جتنا جتنا وقت گزرتا گیا اُن کے تفکرات میں اضافہ ہوتا گیا مگر بہت کم ایسے مواقع آئے جب اُن کی زبان سے کوئی کلمہ شکایت نکلا ہو۔ وہ اپنا دکھ درد زبان سے کہنے کے قائل نہیں تھے یہی سبب تھا کہ درد دل کے شدید ترین کرب کی حالت میں بھی اُن کے لبوں کو بقدر اُف حرکت نہیں ہوتی

اور کوئی علاج مرض الموت میں نہ ہو سکا۔ بیماری کا وقفہ بہت کم تھا اور وہ صبر و سکون کے ایک ہمالہ پہاڑ تھے جو بڑی سے بڑی تکلیف سے متزلزل نہ ہو سکا۔ ان کی اس صفت کو ملحوظ رکھتے ہوئے الہ آباد میں کشمکش بلا وجہ کی صعوبت کو ان کا جھیل لینا سمجھ میں آتا ہے مگر ان کے اس کارنامے کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے کہ اُن کا علم و ادب کی خدمت میں بھرپور انہماک ہر حالت میں برقرار رہا۔ درس و تدریس میں کبھی کمی نہیں ہوئی تصنیف و تالیف کا شغل جاری رہا سماجی اور خانگی فرائض کی ادائی میں کوتاہی نہیں آئی، اور دوستوں عزیزوں شاگردوں اور کسب فیض کرنے والوں سے ملاقاتیں بھی بدستور چلتی رہیں پریشانی آئی مگر ہونٹوں کی مسکراہٹ اور چہرہ کی بشاشت میں کبھی فرق نہیں آیا کبھی کسی ملاقات کرنے والے نے یہ اندازہ نہیں کیا کہ یہ شخص جو اتنی پر مغز اور پر کیف گفتگو کر لیتا ہے افکار سے بھرا ہوا دماغ اور الجھنوں میں مبتلا دل بھی رکھتا ہے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے انسان اپنی داستانِ غم دوسروں کو سنا دیتا ہے۔ احتشام بھی انسان تھے۔ ان کو بھی کچھ ایسے لوگوں کی قدر تھی جو ان کے آلام سنتے اور ان کو سہارا دیتے تھے مگر ایسے لوگوں کی تعداد اتنی کم تھی جن کا شمار انگلیوں پر کیا جا سکتا تھا۔ انہیں ہمدردوں میں راقم بھی شامل تھا اور میں اپنے ذاتی تجربات کے بنا پر بلا خوفِ تردید اور پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایسے مواقع پر احتشام چند جملوں سے زیادہ اور کچھ زبان سے نہیں کہتے تھے ان کے دل کی تکلیف کا اندازہ کرنے کے لئے ہم کو اُن کے حالات کا بیرونی وسائل و ذرائع کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ یہی نہیں اُن کا یہ بھی وطیرہ تھا کہ داستانِ غم چند جملوں میں ختم کرنے کے بعد فوراً کوئی ایسا مضمون شروع کر دیتے یا کچھ ایسی باتیں کرنے لگتے جن کے سبب سے سننے والے کا تنغص یا ہمدردانہ تکلیف دماغی فی الفور دور ہو جاتی اور باہمی گفتگو میں فرحت و انبساط کی ایک لہر ضرور آجاتی تھی اُن کا یہ طرزِ عمل اُن کی رجائیت کا آئینہ دار ہو جاتا تھا

یہ بات بہر حال مسلم الثبوت ہے کہ وہ ایک گراں مایہ ادیب اور فن تنقید کے مجدد تھے۔ اردو زبان سے ان کی محبت اور اردو کی فلاح و بہبود و ترقی کے لیے اُن کی عمر بھر جد و جہد ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس

موضوع پر اب تک بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آئندہ بھی مدتوں تک بڑے بڑے ادیب اور فنکار لکھتے رہیں گے مگر میں جب ان کو یاد کرتا ہوں تو ان کی انسانیت، شرافت، مروت، محبت، مہر و وفا اور اُن کی سادہ پر خلوص گھریلو زندگی کے واقعات یکے بعد دیگرے حافظے میں ابھرتے اور دل کو مجروح کرتے رہتے ہیں۔ اُن کو اپنے تمام عزیزوں سے بے پناہ محبت تھی۔ اُن کا ہر دوست بھی ان کی محبت کا معترف تھا۔ ظاہر ہے کہ جس کا لطف و کرم اتنا عام ہو وہ اپنے عزیزوں کے ساتھ کتنی ولی قربت رکھتا ہو گا! چنانچہ میں نے خود دیکھا ہے کہ ماہل سے جب کوئی آجاتا تھا تو اُن کا دل باغ باغ ہو جاتا تھا۔ ان آنے والوں میں بکثرت قریبی رشتہ دار نہیں ہوتے تھے لیکن ماہلی ہونے کا ناتہ ان کے نزدیک بہت قوی تھا۔ اور وہ اپنے کو احتشام ماہلی لکھتے تھے اور اس طرح تخاطب کئے جانے پر خوش ہوتے تھے۔ یوں تو ہر انسان اپنے وطن یعنی مولد کا گرویدہ ہوتا ہے۔ لیکن احتشام ماہلی کے دل میں ماہل سے ایک ہمہ گیر رغبت تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ماہل کا نام سن کر یا ماہل سے آنے والوں کو دیکھ کر اُن کو اپنا بچپن اور اُس کی معصوم تصویر اُن کے سامنے پھر جاتی ہو۔ عزیزوں اور ہمسایوں کے ساتھ اتنا خلوص رکھنے والا اپنے خاندان والوں کے لئے کتنا شفیق و رفیق تھا اس کا حال وہی جانتے ہیں جنھوں نے ان کو قریب سے دیکھا ہی نہیں بلکہ اچھی طرح پرکھا بھی تھا۔

لکھنؤ یونیورسٹی کی دوران ملازمت ان کا عقد مناکحت قصبہ نگرام کے ایک معزز سید گھرانے میں ہو گیا تھا شادی کے بعد اُن کا بہت زیادہ وقت گھر کے اندر ہی صرف ہوتا تھا۔ ان کی رفیقۂ حیات بھی بہت جلد مزاج داں ہو گئی تھیں اس لیے دونوں کی زندگی بیحد خوشگوار گزرتی تھی۔ ایسی مثالیں دوسری جگہ بھی ملتی ہیں جہاں زن و شو کے جذبات و خیالات میں ہم آہنگی ہو اور دل سے دل مل کر حقیقی معنوں میں یگانگت ہو جائے مگر احتشام ماہلی کو کتب بینی اور تصنیف و تالیف سے قلبی لگاؤ منزل عشق تک پہنچا ہوا تھا ان دو محبوبوں کو جس طرح انہوں نے نباہا وہ کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں ہو سکتی ہے۔ انہوں نے ابتدا ہی سے اپنے حجلۂ عروسی کو اپنا کتب خانہ بنا لیا تھا

وہیں پڑھتے لکھتے تھے اور بسا اوقات پلنگ پر لیٹے لیٹے پڑھتے اور بیٹھ کر لکھتے تھے۔ ان کے بہترین تصنیفات اسی کمرہ میں لکھے گئے تھے۔ اُن کی یہ عادت زندگی کے آخری دن تک برقرار تھی مگر شادی ہونے کے فی الفور بعد اس کاروبار کو انہوں نے کیسے چلایا اس کو سمجھنا بھی دشوار ہے اور اپنی اہلیہ کو اس شغلہ میں کس طرح شریک کیا اس کا بھی پتہ آج تک نہیں چل سکا۔ البتہ یہ بات پورے اطمینان کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے دونوں محبوبوں کو برابر خوش رکھتے رہے۔ نہ کبھی اُن کی رفیقۂ حیات کو کوئی شکایت ہوئی اور نہ تصنیف و تالیف کے شغف میں کوئی کمی ہوئی ان دونوں میں کبھی کسی کو ایک دوسرے کے خلاف رقابت نہیں پیدا ہوئی۔ ذاتی طور سے میں اُن کے اس کمال کا ہمیشہ معترف رہا اور معترف رہوں گا کیوں کہ ایسی کوئی دوسری مثال نہ دیکھی ہے اور نہ دیکھنے کی کوئی امید ہے۔

شادی ہو جانے کے بعد اولاد کی نعمت سے بہرہ ور ہوئے۔ اس دارِ فانی سے چار لڑکوں اور دو لڑکیوں کو چھوڑ کر رخصت ہوئے۔ احتشام صاحب کے ایسے گھر میں پیدا اور پروان ہونے والے بچوں کو سلیم الطبع، خوش خلق اور رشید و سعید ہونا ہی چاہئے تھا۔ بچوں کو باپ سے اور باپ کو بچوں سے جو فطری علاقہ ہوتا ہے وہ یہاں بھی تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ احتشام صاحب اپنی طبیعت کی خصوصیات کی وجہ سے اپنے بچوں پر دوسروں کے مقابلے میں زیادہ شفیق تھے لیکن دنیا میں یہ بھی ہوتا ہے کہ باپ کی شفقت تمام اولاد کے ساتھ بعینہٖ ایک ہی درجہ کی نہیں ہوتی۔ عموماً کسی بچے کے ساتھ باپ کی محبت نسبتاً کم درجہ کی ہوتی ہے یہ طرزِ عمل انسانی فطرت کا تقاضا ہے جس کا مظاہرہ انبیا اور اولیا کے خاندانوں میں ہوا ہے اور دیکھنے والوں نے مدارجِ محبت کے اس امتیازی فرق کو دیکھ کر اس کا اندازہ بھی کر لیا ہے۔

احتشام صاحب بھی انسان تھے مگر دیکھنے والوں نے اس امتیازی شان کو ان کے یہاں بہت کم دیکھا حالانکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ ہر بچہ کے لیے بے پناہ محبت رکھتے ہوئے بھی اُن کو اپنے منجھلے صاحبزادے جعفر عسکری سلمہ الموصوف بعون سلمہ سے ایک قلبی لگاؤ تھا۔ اس کی غالباً ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ

صاحبزادے دماغی عارضہ میں مبتلا ہیں ان کے علاج اور صحت مندی کی اُن کو ہر وقت فکر لگی رہتی تھی پھر بھی ایک مریض بچہ کے ساتھ جو ان کا طرزِ عمل تھا وہ بڑی حد تک غیر معمولی تھا۔ دماغی مریض کو کسی پریشانی میں مبتلا کرنا یا اس کو کسی فکر میں گرفتار کرا دینا دانشمندی کا تقاضا نہیں ہو سکتا بالخصوص ایسے دانشمند کا جو احتشام حسین کے ایسے تفکر و تعقل کا مادک ہو اپنے علیل فرزند کو دماغی الجھن میں مبتلا کرنا یقیناً تعجب خیز ہے مگر یہاں برابر یہی صورت حال رہی احتشام صاحب نے اپنے اس بیمار بچہ کو اپنا راز دار بنا رکھا تھا۔ اپنی ہر تکلیف اس سے کہہ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو درد دل کی تکلیف کا بھی جعفر عسکری سے تذکرہ کیا۔ اس طرزِ عمل کی غالباً یہ وجہ تھی کہ افراطِ محبت میں اپنا دکھ درد انھیں سے بیان کر دیا کرتے تھے کیونکہ اُن کی دماغی صلاحیت پر اتنا بھروسہ تھا کہ اُن کو ہر تکلیف کی اطلاع قابل برداشت ہی ثابت ہوگی۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ وہ عون کو بہت چاہتے تھے مگر رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ اُن کے کسی بچہ کو کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ وہ اس کو کم چاہتے ہیں۔ اُن کی محبت میں ظاہرداری قطعاً نہیں تھی اور نہ ان کے خلوص میں کبھی کوئی کمی ہوئی

آج کل ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس کے بارے میں حافظ شیرازی کا یہ قول حرف بحرف صحیح ہے

ہیچ رحمے نہ برادر بہ برادر دارد ہیچ شفقت نہ پدر را بہ پسر می بینم

احتشام صاحب کے بارے میں جس طرح دوسرا مصرعہ بے محل ہے اسی طرح پہلا مصرعہ بھی غیر متعلق ہے۔ اُن کا کردار دونوں مقامات پر اس قول کے برعکس تصویر پیش کرتا ہے۔ وہ حقیقتاً اپنی اولاد کے لیے شفقت مجسم تھے اور اُن کا رحم و کرم اپنے بھائیوں پر بے پایاں تھا۔ اُن کے بھائی بھی مرتبہ شناس تھے اور اپنے بڑے بھائی سے ویسی ہی محبت کرتے تھے جیسی بھائی کو بھائی کے ساتھ ہونا چاہئے۔ احتشام صاحب چار بھائی تھے۔ اُن سے چھوٹے سید وجاہت حسین

المعروف بہ مجن سلمہ ملازمت پیشہ رہے اور اپنے اہل وعیال سمیت علیحدہ ہی سکونت پذیر رہے۔ اُن سے چھوٹے سید انصار حسین سلمہ طبیعتاً کاروباری ہیں چنانچہ ایک مدت سے سرفراز پریس کی منیجری کا کام بحسن وخوبی چلا رہے ہیں۔ احتشام صاحب لکھنؤ ہی میں تھے اسی وقت سے انصار صاحب اس عہدہ پر مامور ہیں اور مع اہل وعیال لکھنؤ میں مستقل طور پر رہتے ہیں۔ ابتدا ہی سے علیحدہ مکان میں رہتے تھے۔ احتشام مرحوم الہ آباد میں ملازمت کے بعد جب بھی لکھنؤ آتے تھے اپنے انھیں بھائی کے یہاں قیام کیا کرتے تھے۔ سب سے چھوٹے سید اقتدار حسین عرف جنا سلمہ اپنے بڑے بھائی مرحوم کے ہمراہ رہے۔ فارغ التحصیل ہو کر برسر ملازمت دلی چلے گئے اور وہیں کی سکونت اختیار کر لی۔ لیکن دیکھنے والے جانتے ہیں کہ ان میں ہر بھائی احتشام صاحب کو جب "بھیا" کہتا تھا تو ہر ایک کے دل کی گہرائیوں سے ایک ایسی ہمک نکلتی تھی جو یگانگت میں ہم وزن ہوتی تھی اور کبھی یہ محسوس نہ ہوتا تھا کہ محبت میں کوئی ایک بھائی دوسرے پر سبقت رکھتا ہے۔ اسی طرح احتشام صاحب اپنے چھوٹے بھائیوں کو نام لے کر پکارتے تھے تو ہر ایک کے لیے ایک ہی جذبہ انکی آنکھوں میں چمک اٹھتا تھا۔ یگانگت اور موانست کی ایسی تصویریں بہت کم نظر آتی ہیں جس کی کشش کا اصل مرکز خود احتشام صاحب کا محبت بھرا دل تھا۔ پھر بھی جاننے والے یہ حقیقت فراموش نہیں کر سکتے کہ احتشام صاحب اپنے سب سے چھوٹے بھائی جنا سلمہ کو بہت چاہتے تھے ان کو مثل اولاد کے انھوں نے پالا تھا اور یہ چھوٹا بھائی بھی ہمیشہ اُن پر پروانہ وار فدا رہا۔ یہ صورت حال تعجب خیز نہیں ہے۔ البتہ حیرت خیز یہ مقام آتا ہے کہ ان کے دوسرے بھائیوں کو کبھی یہ شکایت نہیں ہوئی کہ بڑے بھائی جنا سلمہ کو بہت چاہتے ہیں اور ہم کو نہیں چاہتے۔ اپنے تعلقات، اپنے رکھ رکھاؤ اپنے برتاؤ یہاں تک کہ اپنے انداز گفتگو میں بھی انھوں نے کبھی کوئی ایسی تبدیلی نہیں آنے دی جس کی وجہ سے اُن کے کسی بھائی کو اُن سے شکایت ہوتی یا دوسرے بھائی کے ساتھ حسن سلوک کی فراوانی دیکھ رنج ہوتا۔ مثل مشہور ہے کہ جہاں چار برتن ہوتے ہیں وہاں کبھی نہ کبھی ٹکراؤ ضرور ہوتا ہے مگر احتشام صاحب ایسے چار بھائی تھے جن میں کبھی ٹکر

نہیں ہوئی۔ اس خوشگوار اور سازگار ماحول کے لیے ہم کو احتشام صاحب ہی کے متوازن اختلاط کو ذمہ دار قرار دینا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کم سنی میں یتیم ہو گئے تھے۔ احتشام صاحب کی زندگی ان لوگوں کے لیے شمع راہ بنی اور ان کی پرسکون طینت اور صلح پسند فطرت ہی کی یہ برکت تھی کہ یہ چاروں بھائی رشتۂ محبت میں برابر منسلک رہے

اپنے بچوں، اپنے بھائیوں اور اپنے اعزا و اقارب کے ساتھ رفق و مدارا اور خلوص و محبت سے پیش آنے والا یہ مجسمۂ اخلاق و اکرام اپنے دوستوں بلکہ ملاقات کے لیے ہر آنے والے میں ہر ایک سے بیحد موانست سے ملتا تھا۔ خاطر تواضع میں کبھی کسی کے ساتھ کمی نہیں کی۔ بات کرنے کا انداز بیحد دلکش تھا۔ خلاف مزاج بات سننے یا برتاؤ کے بعد بھی کبھی غصہ نہیں آتا تھا۔ تضیع اوقات افتاد مزاج کے خلاف تھی یہاں تک کہ جوش ملیح آبادی کے ایسے قدر داں دوست کی لہو و لعب والی نشستوں سے بصد ہزار اہتمام گریز کرتے تھے لیکن علم و ادب کا نام لے کر اگر کوئی آتا اور بیکار باتوں میں وقت برباد کرتا تو اس تکلیف کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتے اور بہت کم شکایت سے زبان آشنا ہوتی تھی بات میں بات نکالنے اور باریک بینی دلکش مشغلہ تھا۔ تفنن طبع میں دوسروں کی مہمل باتوں کو بھی اسی طرح مزاح میں ٹال دیتے تھے کہ سننے والے کو گراں نہ گزرتا اور اس کی مہملیت مذاق بن کر رہ جاتی تھی۔ بحث و مباحثہ کے دوران اصل موضوع سے ہٹ جانا ان کا شعار نہ تھا اور ساتھ ہی ساتھ ایسے مواقع پر موضوع کی افادیت ملحوظ رکھنے پر پوری توجہ مبذول رکھتے تھے۔ پڑھے لکھے لوگ جمع ہو جاتے تو ایسے مباحثے کافی دلچسپ اور افادیت کے مالک ہوا کرتے تھے۔ حافظہ بلا کا تھا۔ دوران کلام میں انگریزی، اردو اور فارسی کے اقوال بے تکلف اور برجستہ پیش کر دیتے تھے علم و ادب کے سلسلے میں ہر موضوع پر فی البدیہہ تبادلۂ خیالات کیا جا سکتا تھا۔ تحریر و تقریر دونوں پر کمال حاصل تھا اور ہر موقع پر معلومات کا سمندر لہریں مارنے لگتا تھا۔ لیکن اس تبحر علمی کے ساتھ محل شناسی اور مناسب و موزوں گفتگو کرنا ان کا طرۂ امتیاز تھا ہر بات کرنے والے سے اُن

کا انداز گفتگو ایک انفرادی شان رکھتا تھا۔ وہ کلموا الناس علیٰ قدر عقولھم کے اصول پر سختی سے کاربند رہے۔ دوستوں اور ملاقاتیوں کے منبع علم سے تو وہ کما حقہ واقف تھے لیکن ایک نئے آنے والے کی علمی صلاحیت کا اندازہ بھی چند منٹ کی گفتگو کے بعد لگا لیتے تھے اور اسی کی عقل کے مطابق اُس سے گفتگو کرتے تھے۔ ایسے آنے والے اگر کبھی اپنی بساط سے باہر گفتگو کرتے تو اُن کو ٹال دینے کا بھی ان میں زبردست ملکہ تھا اور وہ اس خوبصورتی کے ساتھ بات ٹال دیتے تھے کہ کسی کو برا بھی معلوم نہ ہوتا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ اپنی ذہانت کی اُس لطافت سے کام لیتے تھے جس کے پیکر میں طنز و مزاح کے جوہر جھلکتے نظر آتے تھے بے تکلف دوستوں کی صحبت میں رنگ محفل ہی دوسرا ہوتا تھا۔ ایک دوسرے پر طنز کرتا، جملہ کستا اور چٹکیاں لیتا تھا۔ احتشام صاحب بھی کسی سے پیچھے کبھی نہیں رہے۔ جتنے وہ سنجیدہ اور متین تھے ایسی صحبتوں میں وہ اتنے ہی شائستہ چابک دست بھی ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھی یہ شغل گھنٹوں چلتا اور گرمیٔ بزم کسی طرح سرد نہیں پڑتی تھی۔ ان مواقع پر شرکت کرنے والے یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ ہمارا یہ گراں قدر ادیب اور مایہ ناز نقاد ایک زاہد خام کی طرح "عبوساً قمطریرا" نہیں ہے۔ ان کے لکھنؤ کے دوران قیام میں نیز وہ جب یہاں آتے ایسی ہنگامہ آرائی دانش محل میں ہوا کرتی تھی۔ دانش محل کے مالک نسیم احمد صاحب اُن کے مخلص دوست تھے اور اُن کی دوکان کو وہ اپنا دارالقرار اور دارالفرار دونوں قرار دیے ہوئے تھے ایسی نشستیں برابر یہاں ہوا کرتی تھیں اور احتشام صاحب صدر محفل رہتے تھے۔

اسی سلسلے میں اُن کے بعض عادات و اطوار کا تذکرہ کر دینا بھی نامناسب نہ ہوگا اور ان عادات و اطوار میں ان کے لباس و طعام کا ذکر مقصود ہے۔ ابتداً وہ شیروانی اور پائجامہ پہنا کرتے تھے بعد میں بش شرٹ اور پتلون اختیار کر لیا سر پر کوئی ٹوپی نہیں پہنتے تھے۔ لباس کے بارے میں صرف صفائی پیش نظر رہتی تھی۔ گھر میں قمیص پائجامہ ہو یا باہر کوٹ پتلون ہر ملبوس کا صاف ستھرا ہونا ضروری تھا۔ جس کپڑے کا لباس بنتا تھا اس کے لیے سادگی نظر انتخاب کو مرغوب تھی۔

ان کو کبھی کسی نے قیمتی کپڑے پہنے نہیں دیکھا اور جہاں تک مجھے علم ہے اُن کے پاس کپڑوں کی بہتات تھی اُن کا مسلک یہ تھا کہ تن ڈھکنے کے لیے کپڑا ہونا چاہیے مگر صاف ستھرا ہو۔ کھانے کے بارے میں بھی سادگی پسند تھے۔ خوش ذائقہ و بدذائقہ کھانوں میں پورا پورا امتیاز کر لیتے تھے لیکن نہ خوش ذائقہ طعام کے یہ ہوسناکی تھی اور نہ بدذائقہ چیز کھا کر بے مزہ ہوتے تھے۔ آخر عمر میں دن کا کھانا ترک کر دیا تھا۔ پرانی پیچش کے مریض تھے سفر کے ضروریات برابر پیش آتے رہتے تھے ایسے مقامات پر میزبان جو کھلا دیتے کھا لیتے اور نقصان رسا غذا سے جو تکلیف ہوتی ایک وقت فاقہ کر کے اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کرتے بے نفسی ان کا جوہر حیات تھا اس لیے اپنے آرام و سکون کی طرف بے توجہی کرتے تھے اپنے دوا و علاج کی بھی بہت کم فکر رہتی تھی۔ اسی بےفکری کی بدولت صحت بد سے بدتر ہوتی گئی دوستوں اور عزیزوں کے اصرار کے باوجود اپنے فرائض اور اپنے جذبۂ ادب پرستی کو اپنی جان اور اپنی صحت پر برابر ترجیح دیتے رہے خوددار بہت تھے مگر خود پرستی نام کو بھی نہ تھی ہوا و ہوس میں کبھی اسیر نہیں ہوئے اور اپنے جذبات و احساسات پر ہمیشہ پورا پورا قابو رکھا اُن کی اسی خودداری اور جذبات پر قابو رکھنے کی بدولت اُن کے قریب ترین عزیزوں اور دوستوں کو بھی یہ پتہ نہیں چلا کہ ساٹھ برس کی زندگی میں اُن کے دل کے اندر کیا کیا تمنائیں ابھریں اُن میں کتنی پوری ہوئیں اور کتنی حسرتیں ان کے ساتھ دفن ہو گئیں۔ اتنا ضرور معلوم ہے کہ ملازمت سے سبکدوشی حاصل کرنے کے بعد ان کا ارادہ لکھنؤ ہی میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لینے کا تھا۔ انہوں نے اپنے لئے ایک مکان بھی خرید لیا تھا مگر اس مکان میں ایک روز بھی رہنا نصیب نہ ہوا اجل کی یہ شمع الہ آباد کی آندھیوں میں بجھ گئی اور ان کا جسد خاکی اسی سرزمین کا پیوند ہو گیا۔

مسعود صاحب

ہر انسان کی زندگی متانت و بردباری سے شروع نہیں ہوتی اور بہت کم لوگ عہد طفولیت میں اپنی توجہ حصولِ دولتِ علم کی طرف محدود رکھتے ہیں۔ مگر مسعود صاحب ان دونوں خصوصیات کے حامل تھے۔ مجھے وہ زمانہ یاد آرہا ہے جب ہم دونوں محلہ گولہ گنج میں واقع امامیہ لاج میں رہا کرتے تھے۔ میں نویں درجہ میں پڑھتا تھا اور وہ بی۔ اے کے طالبعلم تھے۔ ہم دونوں کی عمر و سن میں بھی اسی مطابقت سے فرق تھا۔ اس بورڈنگ ہاؤس میں کم و بیش چالیس پینتالیس طالب علم رہتے تھے۔ اُس زمانے میں طالب علموں کے طور طریقے آج کے حالات سے بہت مختلف تھے۔ ہمارے بچپن میں لڑکے شرارت کرتے تھے۔ مگر عام طور سے ان کی شرارتیں اذیت رساں یا مبتذل نہیں ہوتی تھیں۔ ہمارے بورڈنگ ہاؤس میں بھی کچھ ایسے ساتھی تھے جو خاص خاص اوقات اور بعض بعض مواقع پر آلاتِ تفریح بنائے جاتے اور ہمارے تفننِ طبع کا وسیلہ بن جاتے لیکن ایک تو ان کی تعداد بہت کم تھی دوسرے یہ کہ وہ لڑکے ایسے مواقع پر بھی آدابِ شرافت و شائستگی ملحوظ رکھتے تھے مسعود صاحب اس زمانہ میں بھی انتہائی خاموش، متین، کم گو اور تنہائی پسند تھے۔ جن لوگوں سے اُن کے روابط تھے اُن کے نام آسانی سے یاد رکھے جاسکتے اور پیش کئے جاسکتے ہیں۔ اُن کے اُس زمانہ کے دوستوں کی فہرست سید علی عباس حسینی، مرزا حامد حسین، سید علی اختر، سید علی حیدر کاظمی، سید اسحاق حسین، سید محمد مرتضیٰ، سید محمد حسین اور راقم تک محدود تھی۔

امامیہ لاج میں ہماری زندگی یا طالب علمی کے دن بڑی دلچسپی سے کٹتے تھے۔ ہم میں مختلف طبائع اور مختلف ذوق وشوق کے دوست شامل تھے اور ان سب میں اعتدال اور رابطۂ یگانگت پیدا کرنے والے مسعود صاحب تھے۔ ہم میں دلچسپی اور تفریح کے سامان بھی وہی سوچ سوچ کر نکالتے تھے اور ہم میں کتب بینی اور علم وادب کا ذوق وشوق بڑھانے کے بھی وہی محرک رہا کرتے تھے۔ وہ خود ایک چھوٹے کمرہ میں بالاخانہ پر رہتے تھے۔ اس وقت بھی بہت صاف وشفاف کپڑے پہننے کا شوق تھا۔ ان کا بستر بھی بہت ستھرا اور سلیقہ مندی سے بچھا رہتا تھا۔ کریچ کا جوتا پہنتے تھے مگر ہر دوسرے تیسرے دن سپیدی ہو جانا لازمی تھا۔ کتابیں بیحد احتیاط سے پڑھتے اور رکھتے تھے ہر کتاب کی جلد پر کاغذ چڑھا رہتا۔ ہلکا سا دھبا بھی پڑ جاتا تو وہ کاغذ بدل دیا جاتا تھا پڑھنے لکھنے کے علاوہ اور کوئی خاص شوق نہیں تھا۔ البتہ وہ اسی زمانہ سے بغیر تمباکو کا پان کھاتے تھے۔ پان کی شکل کی ایک بڑی تانبے کی ڈبیا تھی اسی میں پان کا سب سامان رہتا تھا۔ وہ خود اپنے کمرے سے نکل کر دوسروں کے یہاں بہت کم جاتے تھے البتہ ہمیں لوگ ان کے یہاں خالی اوقات میں دخیل رہتے تھے۔

ایک مرتبہ مسعود صاحب نے ہم سب کو آمادہ کر لیا کہ ہم لوگ آپس میں انگریزی زبان میں باتیں کیا کریں۔ یہ پروگرام پورے بورڈنگ ہاؤس میں رائج ہو گیا۔ مسعود صاحب حکم بنائے گئے۔ باقاعدہ یہ طے ہوا کہ جو خلاف ورزی کرے وہ ہر لفظ کے اوپر ایک عدد الائچی جرمانہ میں داخل کرے۔ اس جرمانہ کے عائد ہونے پر ہمارے جوش میں شدت اور شوق میں لذت بہت بڑھ گئی تھی۔ جرمانہ کی الائچیاں مسعود صاحب کی تحویل میں جمع ہوتی تھیں اور ہر اتوار کو ہماری مختصر پارٹی کے ارکان کو تقسیم ہو جاتی تھیں لیکن ہفتہ میں ۲۵ سے زیادہ غلطیاں کرنے والے کو کچھ نہیں ملتا تھا اس سلسلہ میں دو دوست ہمیشہ یاد رہیں گے۔ ایک علی عباس حسینی تھے جنھوں نے شاید ہی کبھی کوئی جرمانہ ادا کیا ہو اور ہمیشہ سب سے زیادہ الائچیاں وصول کی تھیں دوسرے اسحاق تھے جو یہاں ضلع ہردوئی کے رہنے والے

تھے۔ انھوں نے غالباً شاید ہی کوئی حصہ رسدی پایا ہو مگر ہم سب سے زیادہ جرمانہ ادا کیا کرتے تھے الائچیاں تقسیم کرنے کی تقریب کافی دیر تک ہر اتوار کو مسعود صاحب کے کمرہ میں زمین کے فرش پر ہوتی تھی۔

اس مقام پر اور اسی سلسلہ میں یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ گو کہ ہماری اس مختصر ٹولی میں سب ہی قریب قریب ہم عمر تھے، ایک دوسرے سے بے تکلف اور بے انتہا بے تکلف تھے اور زیادہ تر آپس میں نام کے بجائے عرفیت ہی سے ایک دوسرے کو مخاطب کرتے تھے اور "تم" کہکر بات کرتے تھے مگر مسعود صاحب کو ہم نے کبھی "مسعود" کہہ کر نہیں پکارا اور نہ کبھی ان سے "تم" کہہ کر بات کی تھی۔ اس خصوصی برتاؤ کی یہ وجہ نہیں تھی کی وہ ہم سے سن میں بہت زیادہ بڑے تھے یا یہ کہ وہ ہمارے مقابلہ میں کسی برتری یا فوقیت کے دعویدار تھے۔ ہمارے ساتھیوں میں دو دوست ایسے تھے جنھوں نے کبھی کبھی "تم" یا محض "مسعود" کہہ کر ان سے تخاطب کیا تھا۔ یہ لوگ حامد اور محمد حسین تھے۔ آخر الذکر امامیہ لاج سے متصل مکان میں مقیم اور زیادہ تر ہم لوگوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ہم مذاق تھے اور حامد سے نیز حسینی سے بہت گہری دوستی تھی محمد حسین اب بھی اسی جگہ سکونت پذیر ہیں اور ایک کامیاب وکیل ہیں۔ مسعود صاحب ان تینوں دوستوں سے بہت محبت کرتے تھے مگر وہ بھی بغیر "صاحب" کہے نہ ان دوستوں کو اور نہ کسی دوسرے ساتھی کو اس زمانہ میں بھی تخاطب کرتے تھے۔ ان میں خود نمائی یا خود ستائی کا کوئی شائبہ نہیں تھا لیکن اسی کے ساتھ بڑے عالموں، شاعروں اور ادیبوں سے مرعوب بھی نہیں ہوتے تھے مجھے وہ زمانہ یاد آرہا ہے جب ہم لوگوں کے شہر لکھنؤ کے بعض جلیل القدر مجتہدین عظام سے اختلافات رونما ہوئے تھے۔ ہمارا ایک وفد ان حضرات کی خدمت میں حاضر ہوا تھا جس کے سربراہ مسعود صاحب تھے۔ وفد میں شریک ہونے والے ہمارے ایسے ساتھی تھے جو بعد میں تحصیل علم سے فراغت کرکے بڑے بڑے مناصب پر فائز ہوئے اور نمایاں خدمات انجام دے گئے مگر اس موقع پر ہم سب خاموش بیٹھے رہے تھے حالانکہ ہم میں علی عباس حسینی اور حامد حسین کے ایسے مہذب، شائستہ، خوش

گفتار بھی شریک تھے۔ البتہ مسعود صاحب نے ہماری وکالت آتی سوچی سمجھی اور سلجھی ہلوئی زبان میں کی تھی کہ ہم سب مطمئن اور فاتحانہ انداز میں واپس ہوئے تھے۔

اُسی ضمن میں یہ بھی یاد آرہا ہے کہ اسی امامیہ لاج میں بیخود موہانی قریب ہر دوسرے تیسرے روز تشریف لایا کرتے تھے۔ یوں تو ثاقب مرحوم اور صفی مرحوم بھی راقم کی کبھی کبھی عزت افزائی فرماتے تھے۔ اور ان نشستوں میں مسعود صاحب بجد ذوق و شوق سے از ابتدا تا انتہا تشریف فرما رہتے تھے لیکن بیخود مرحوم کی نشستیں مخصوص ہوتی تھیں۔ اُن سے باوجود تفاوتِ عمر کے علی اختر مرحوم سے گہرے دوستانہ تعلقات اور بے تکلفی تھی۔ بیخود مرحوم خود بھی ایسی طبیعت کے مالک تھے کہ اُن کی خدمت میں گستاخ ہو جانا سہل تھا۔ ہم سب کی ان سے بے تکلفی ہو گئی تھی وہ گھنٹوں تشریف رکھتے اپنا کلام سناتے اور فارسی اساتذہ کے اشعار کا مطلب سمجھاتے تھے۔ ہم سب اکتساب فیض کرتے تھے مگر مسعود صاحب کی تنہا وہ شخصیت تھی کہ برابر ان سے تبادلۂ خیالات کرتے اور کبھی کبھی معنی و مطالب کے تفسیرات میں ان سے الجھ جایا کرتے تھے۔

طالب علمی کے دور کے ایسے بکثرت واقعات حافظہ کے افق پر تیزی کے ساتھ ابھر رہے ہیں لیکن مسعود صاحب کی وفات کا تازہ زخم فی الفور اس واقعہ کی یاد تازہ کر دیتا ہے جب ہماری اُس انجمن میں برہمی آئی تھی اور ہم سب ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تھے۔ یوں تو کچھ مدت قبل ہی سے ہم لوگ علیحدہ علیحدہ مقیم ہو گئے تھے۔ مگر ہماری ملاقاتوں، دلچسپیوں، دوستیوں اور ہم آہنگیوں میں اختلال نہیں واقع ہوا تھا۔ راقم، علی اختر، ان کے بھائی صفت حسین اور علی حیدر کاظمی امام باڑہ داد و غہ واجد علی واقع گولہ گنج میں رہتے تھے۔ حسینی صاحب جن کو اس زمانہ میں ہم لوگ اُن کے عرف "ممتاز" سے پکارا کرتے تھے اور حامد مرحوم اس امام باڑے سے متصل ایک مکان میں رہا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں لکھنؤ یونیورسٹی معرض وجود میں نہیں آئی تھی اور سب کو امتحان دینے کے لیے الہ آباد جانا پڑتا تھا۔ ہمارے سب ساتھی کچھ بی۔ اے اور کچھ ایم۔ اے کا امتحان دینے جا رہے تھے اور آخری رخصت کے لئے ایک دعوت قرار پائی جس میں

ہر ایک کو کچھ خود پکانا تھا۔ یہ دعوت علی عباس حسینی کے گھر میں تھی۔ کوٹھے پر کھانا پکنے کا انتظام تھا۔ ہر شخص اپنا اپنا سامان اور اپنے اپنے برتن لیکر وقت سے پہونچ گیا۔ علی عباس حسینی کے ہمراہ باورچی تھا۔ مگر کھانا ہم سب کو خود پکانا تھا چنانچہ اس کا پروگرام بن گیا۔ مسعود صاحب خالی ہاتھ آئے جس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ وہ کچھ بھی نہیں پکا سکتے۔ انکو چولہا جلانا بھی نہیں آتا لہذا وہ صرف تماشہ دیکھیں گے اور سب کے ساتھ کھائیں گے مگر جب کھانا پکنا شروع ہوا تو وہ ہم سب کے ساتھ باری باری اشتراک کرتے اور اپنا ہاتھ جلاتے رہے۔ اس دن کا کھانا پکانا بھی لطف سے خالی نہیں تھا اور کھانا کھانا تو خوشی اور غم دونوں کا ملا جلا مرقع تھا مسعود صاحب کے جلے ہوئے ہاتھوں اور اُن کے تکلیف کے ساتھ کھانا کھانے نے ان احساسات میں کچھ اور شدت پیدا کر دی تھی۔ یہ صحبت دن کے دس بجے سے رات کے گیارہ بجے تک گرم رہی تھی دوسرے روز علی الصبح ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے اور زندگی میں ان سب کا اجتماع ایک جگہ پر پھر کبھی نہیں ہو سکا۔ اس مقام پر امامیہ لاج میں پڑھائی کے طور طریقوں کا ذکر کر دینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مسعود صاحب کو ہمیشہ ٹھوس اور سنجیدہ کتابیں پڑھنے کا شوق رہا وہ رابرٹ لوئی اسٹیونسن کے اس زمانہ میں بہت دلدادہ تھے یا میکلن کا دقیق مطالعہ کرتے تھے۔ مگر کم پڑھتے اور غور زیادہ کرتے تھے۔ بیماری کی حد تک یہ جنون تھا کہ جو فقرے، جملے یا مضامین بہت پسند آتے وہ یاد کر لیتے تھے اور کبھی نہیں بھولتے تھے آخر عمر تک یہی حال رہا علی عباس اور حامد مرحوم بہترین مصنفین کی ناولیں پڑھتے اور بہت تیز پڑھنے کے شائق تھے انھیں دونوں نے مجھے بھی یہی شوق دلایا تھا ہم تینوں میں تیز پڑھنے کے مقابلے ہوا کرتے تھے اور ناول ختم ہو جانے کے بعد مسعود صاحب ہمارے ممتحن ہوا کرتے تھے یہ دیکھتے تھے کہ ہم نے تیزی سے ورق گردانی کر ڈالی ہے یا حقیقتاً پڑھا اور مصنف کا مطلب بھی سمجھا ہے۔ اس امتحان میں حسینی صاحب کے سر کامیابی کا ہمیشہ سہرا رہا کرتا تھا۔ میں زیادہ تر فیل ہوتا تھا اور حامد کبھی کبھی علی عباس سے ٹکر لے لیا کرتے تھے۔ اس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں ہم لوگوں کی دلچسپیوں

کا انکشاف ہو جائے نیز یہ ظاہر ہو جائے کہ مسعود صاحب میں اُس وقت بھی علمی مذاق کتنا بلند پایہ تھا۔ اسی مقام پر یہ بات بھی کہتے میں آتی ہے کہ ہم سب کو لیٹے لیٹے پڑھنے کی عادت تھی۔ حامد مرحوم دو دو شبانہ روز صرف حوائجِ ضروری سے فارغ ہونے کے لئے بستر چھوڑتے تھے اور جب ان کا رجحان تیز ہوتا تو دو دو دن اور رات مسلسل لیٹے لیٹے پڑھا کرتے تھے۔ کالج جانا بھی ختم ہو جاتا تھا۔ ان کے بعد علی عباس تھے جو کالج سے واپسی کے بعد پلنگ پر چلے جاتے اور وہی پلنگ ان کی کرسی میز، انکا دستر خوان، ان کا ڈرائنگ روم سب کچھ ہوتا تھا۔ ان دونوں کی یہ ادائیں مرتے دم تک کم سے کم مجھے ضرور یاد رہیں گی۔

وہ دور ختم ہوا، وہ انجمن برہم ہوئی، ہماری ہوائیاں اُڑیں اور ہم سب اپنے اپنے طور پر کسبِ معاش کی فکروں میں لگ گئے۔ اور دوسروں نے درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔ البتہ میں نے ہی اپنے لئے ایک علیحدہ راہ نکال کے وکالت شروع کی جو بہت جلد ختم ہو گئی۔ حسن اتفاق کہ کچھ برسوں کے بعد مسعود صاحب اور حسینی صاحب سے تعلقات بحال ہو گئے۔ حسینی صاحب جبلی کالج میں آ گئے اور مسعود صاحب لکھنؤ یونیورسٹی میں لکچرر کے عہدہ پر پہلے ہی مامور ہو چکے تھے مسعود صاحب جوہری محلہ میں مقیم تھے اور میرا قیام اور دفتر متصل ہی فرنگی محل کے پل پر تھا۔ ہماری ملاقاتیں برابر ہونے لگیں مسعود صاحب کا اس وقت بھی سارا طرزِ زندگی طالب علمی ہی کے دور کے ایسا تھا۔ یہ نہیں پتہ چلتا تھا کہ وہ مدرس ہیں یا ابھی تک تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ کتب بینی اور مضمون نگاری کے علاوہ اور کوئی شوق نہیں تھا۔ البتہ مالی اعتبار سے فراخی کے باعث کتابیں خرید کر ایک اچھا کتب خانہ فراہم کرنے کا ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ وہ زمانہ بھی ان کے لئے سازگار تھا لکھنؤ کی پرانی ثقافت دم توڑ چکی تھی، رؤسا و عمائدین کی جاگیریں اور املاکیں لٹ چکی تھیں، منقولہ جائدادوں کے فروخت کر دینے کا وقت آ چکا تھا، اسی ذیل میں محلوں اور محلسراؤں سے نکل کر بہترین مخطوطات اور نادر نسخے بھی بازاروں میں آ رہے تھے۔ میں تو اس کو ادبی خوش قسمتی ہی کہوں گا کہ یہ سرمایہ بڑی مقدار میں مسعود صاحب کو نصیب ہو گیا۔ ان کی زبان میں اثر تھا۔

انکھوں میں جذب تھا جس کتب فروش سے دو منٹ بات کرتے وہ مسحور ہو جاتا یہاں تک ہوا کہ امریکا کے دولت مندوں کو جو عجائبات کے متلاشی تھے محروم کرکے ہمارے لکھنؤ کے کتب فروشوں نے دیدہ و دانستہ وہی کتابیں برائے نام قیمت پر مسعود صاحب کے حوالے کردی تھیں۔ بہرحال انہوں نے اپنا یہ شوق پورا کیا اور جہاں جہاں سے ممکن ہو سکا بہترین ذخیرہ نادر کتابوں کا رفتہ رفتہ جمع کرلیا تھا جو جو کتابیں خریدتے اس کا کچھ کچھ مطالعہ ضرور کرلیتے تھے۔

اسی زمانہ میں وقتی طور پر کچھ سماجی معاملات میں بھی انھوں نے دلچسپی لی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب مرزا عابد حسین مرحوم آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے جنرل سکریٹری تھے اور راقم جوائنٹ سکریٹری تھا۔ اس کانفرنس کا وہ دور حقیقتاً بہت کامیاب تھا۔ جوبلی کالج میں حسینی صاحب کے علاوہ مولانا اختر علی تلہری، مولانا ثاقب حسین اور خواجہ اطہر حسین کے ایسے باکمال موجود تھے۔ ان چاروں دوستوں میں غیر معمولی خلوص اور یگانگت کے تعلقات تھے۔ ہم دونوں کے مراسم بھی ان سب سے شروع ہو کر بے تکلفانہ دوستی تک بڑھ گئے تھے۔ یہ سب صاحبان متذکرہ کانفرنس کی جماعت مرکزیہ کے ممبر ہو گئے تھے۔ اس کی کمیٹیوں میں بڑے گرما گرم مباحثے ہوتے اور بہت دلچسپیاں رہتی تھیں۔ اس لئے کہ ہم سب کا نظریہ تعمیری ہوتا تھا اور کسی کے ذاتی مقاصد ادارہ سے وابستہ نہیں تھے مسعود صاحب بھی ان مباحثوں میں حصہ لیتے تھے۔ لیکن ان کی تقریروں میں خطابت کم اور ٹھوس دلائل زیادہ رہتے تھے لیکن یہ سلسلہ بہت دنوں تک نہیں چل سکا۔ ۱۹۳۰ء میں مرزا عابد حسین سبکدوش ہوئے اور ۱۹۳۲ء میں راقم مستعفی ہوا۔ اس کے کچھ مدت بعد ہی ہمارے تمام شرکا دکار یکے بعد دیگرے علیحدہ ہو گئے۔ مسعود صاحب نے اس کے بعد کسی سیاسی یا سماجی تحریک میں قابل ذکر و لحاظ حصہ نہیں لیا اور اپنا تمام وقت اردو زبان کی خدمت کے لیے وقف کردیا۔ لیکن ان پرانے دوستوں سے جن سے طالب علمی کے زمانہ میں رابطہ قائم ہوا تھا۔ ان کا رشتہ بدستور قائم رہا۔ اور یہ رشتہ خلوص و محبت کی بنیادوں پر استوار رہا۔ جاننے والے جانتے

ہیں کہ حسینی صاحب اور اختر علی تلہری کے اٹھ جانے پر ان کو کتنا قلق تھا اور کس طرح وہ آنسوؤں سے روے تھے۔

اپنی ملازمت کے وقت اور اس کے برسوں بعد تک وہ نا کتخدا بلکہ صحیح معنوں میں تجرد رہے تھے۔ دوستوں کے اصرار پر بالخصوص میرے اور حسینی مرحوم کے اصرار پر کبھی کبھی رضامندی کا اظہار کر دیتے تھے مگر پھر بھی شادی کرنے میں ہچکچاہٹ تھی پہلی بار میری شادی کے موقع پر ان میں اس طرف قدم بڑھانے کی ہمت پڑی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُس روز وہ تقریباً ۱۸ گھنٹوں تک میرے ساتھ رہے تھے۔ بارات میں شمولیت، نکاح میں شرکت اور تمام رسم و رواج کے اختتام تک وہ موجود رہے تھے۔ دوسرے روز مجھ سے ان تمام واردات کی تفصیلات ہنس ہنس کر اور لطف لے لیکر دریافت کی تھیں۔ بالآخر خود ان کی کتخدائی کا وقت آیا ہم نے یہ محسوس کیا کہ ان کو اپنے لئے اس موقع پر ایک "ولی" کی ضرورت تھی جو حفاظت وحظانت کے فرائض انجام دے اور فرائض شوہری کے تکمیل میں ان کو بے تکلفی سے مشورہ دے سکے اس کام کے لئے ان کے دوستوں میں راقم اور حسینی صاحب ہی موزوں تھے۔ بالآخر میں ان کے ہمراہ گیا اور یہ فریضہ ان کی سسرال واقعہ ٹکاپور کانپور میں انجام دیا۔ پہلا مرحلہ مہر کا تھا۔ کانپور آئین میں تھا، قانون کے بموجب تمام مقررہ مہر ادا کرنا ضروری تھا۔ مسعود صاحب خود بھی متشرع تھے، وہ چاہتے تھے کہ اتنا ہی مہر باندھا جائے جو وہ ادا کر سکیں اور ادا کریں یہ معاملہ تو بخیر و خوبی طے ہو گیا مگر نکاح کے بعد رخصت رسم کی منزل بہت سخت تھی۔ مسعود صاحب چاہتے تھے کہ جلد از جلد رخصتی ہو جائے اور وہ فی الفور دلہن کو لے کر لکھنؤ واپس چلے آئیں۔ سسرال والے پوری طاقت سے یہ چاہتے تھے کہ کوئی رسم ایسی نہ رہ جائے جو ادا نہ ہو میرے لئے یہ وقت بہت سخت تھا کبھی مسعود صاحب کو سمجھاتا تو کبھی ان کی سسرال والوں کی خدمت میں التجا کرتا۔ کافی وقت اس مناقشہ کو فرو کرنے میں صرف ہو گیا۔ بالآخر مسعود صاحب ہی کو سمجھا بجھا کر رو کا مگر انہوں نے بھرائی ہوئی آواز اور مایوس لہجہ میں یہ کہا کہ کم سے کم یہ تو ہو جائے کہ" وہ فقرہ

جو آرسی مصحف کے وقت کہنا پڑتا ہے مجھے نہ کہنا پڑے"۔ اس کے بعد فوراً ذرا سخت لہجہ میں کہا کہ "وہ فقرہ میں ہرگز ہرگز زبان سے نہیں نکالوں گا"۔ رسم و رواج کے مطابق وہ فقرہ ہے "بیوی آنکھیں کھولو، میں تمہارا غلام ہوں" بہر حال اس سلسلے میں میری گزارش ان کی سسرال والوں نے قبول کرلی۔ یہ رسم ادھوری رہ گئی اور باقی تمام رسم و رواج کی سختیاں جھیل کر مسعود صاحب اپنی دلہن کو ہمراہ لے کر لکھنؤ واپس ہوئے ان کی شریک زندگی بھی ان کے مذاق کے موافق تھیں یا یہ کہ انہوں نے خود اپنی بیوی کو اپنے رنگ میں ڈبویا تھا۔ بہر حال دونوں میں قابل مثال یگانگت تھی۔ وہ بھی اپنے شوہر کی رفاقت میں زندگی کاٹ لے گئیں۔ سچ پوچھئے تو مسعود صاحب بھی اسی روز مر گئے جس دن مرحومہ کا انتقال ہوا تھا۔

مسعود صاحب کا مبتذل یا ناپسندیدہ الفاظ سے اجتناب کا یہ عالم تھا کہ وہ بھی صحبتوں اور بے تکلف دوستوں سے دوران گفتگو بھی زبان سے اس قسم کا کوئی لفظ نہیں نکالتے تھے۔ مزاحیہ اور بے انتہا بے تکلف مواقع ایسے بکثرت آتے تھے جب ہماری گالیوں کا موزوں جواب ان کو دینا پڑتا تھا۔ اس وقت وہ بھی مزاحاً ایسا لفظ استعمال کرتے جو اصل لفظ کا ہم قافیہ ہوتا۔ سننے والا مطلب سمجھ لیتا اور لطف اندوز ہو جاتا۔ فصیح و بلیغ تکلم میں صحت الفاظ اور محاوروں کے درست ہونے کا ہر وقت التزام رکھتے تھے۔ زبان کی خامی کو ان کے طرز گفتگو میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ حقیقی معنوں میں اردو زبان کے ایک ادیب بے بدل تھے جس کی اصل وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اپنی ساری زندگی اسی زبان کی خدمت کے لیے وقف کردی تھی۔ ان کی تحریروں پر تبصرہ کرنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔ میرا مقصد صرف اس قدر ہے کہ دوستانہ اور بے تکلفانہ گفتگو میں بھی جب وہ روا روی میں بات کرتے تھے اس وقت بھی ان کی زبان سے منجھے ہوئے الفاظ اور ترشے ہوئے فقرے نکلتے تھے زبان داں لوگ بھی ان سے بات کرنے میں لذت محسوس کرتے تھے اور صاحبانِ علم اپنی معلومات میں

اضافہ کر کے اُن کے پاس سے اٹھتے تھے مجھے وہ زمانہ یاد ہے جب وہ اپنی تصنیف "ہماری شاعری" کا مسودہ تیار کرنے میں غرق رہتے تھے۔ شام کو ہم لوگ جمع ہوتے اور اُن کی دن بھر کی محنت اُن کی زبان سے سنتے۔ تحریر تو بے مثل تھی ہی مگر اس کی وضاحت میں وہ جو کچھ کہہ دیتے وہ بھی اپنی آپ مثال ہوتا تھا۔

یہ کتاب انھوں نے جوہری محلہ کے دورانِ قیام میں اور اپنی شادی کے قبل لکھی تھی کتاب اسی زمانہ میں مکمل ہو گئی تھی مگر انہوں نے بار بار اضافوں کی ضرورت محسوس کی اور اس کا سلسلہ چلتا رہا۔ اُن کے دماغ میں ہر پسندیدہ اور پیشِ نظر موضوع پر اتنا مواد ابلتا رہتا تھا کہ ان کے لئے کوئی مضمون یا کتاب مکمل کر دینا سہل نہیں ہوتا تھا۔ ہر تصنیف و تالیف میں بارہا اضافے کرتے تھے اور تکمیل اس وقت ہوتی تھی جب ان کے مسودات چھپ جاتے تھے یا جہاں جانا ہوتے تھے وہاں چلے جاتے تھے۔ اُن کی تحریر کی یہ خصوصیت آخری عمر تک برقرار رہی۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کی متعدد تصنیفات ابھی تک طبع نہیں ہو سکی ہیں اور یہ صحیح بھی ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ ایسے بکثرت موضوعات ہوں گے جن پر انھوں نے چیدہ چیدہ اپنے نوٹ تیار کر لئے تھے مگر پھر ان کو ان پر مزید کاوش کا موقع ہی نہیں ملا وہ ایسی تیاری میں کافی وقت صرف کرتے تھے۔ مدتوں تک مخطوطات یا مطبوعات کی ورق گردانی کرتے تھے اور اپنے مطلب کا مواد جمع کرتے جاتے تھے۔ قلم اٹھا کر باضابطہ کتاب یا مضمون شروع کرنے کا وقت بہت دیر میں آتا تھا اور یہ بھی یقین ہے کہ اُن کی ایسی بہت سی تالیفات نا مکمل رہ گئی ہوں گی۔ آخر عمر تک تحقیق و تدوین کی طرف متوجہ رہے اور اُن کی وہ مسہری جس پر زندگی کے آخری دن گزارے۔ کتابوں، پرچوں، اوراق، یہاں تک کہ چھوٹی چھوٹی چٹوں تک سے بھری رہتی تھی۔ یاد آتا ہے کہ حامد مرحوم کا زمانہ طالب علمی میں بجنسہٖ یہی حال تھا۔ اُن کا تمام کتب خانہ ان کے ہمراہ پلنگ پر رہا کرتا تھا۔ جب کوئی دوست کچھ کہتا تو جواب دیتے تھے کہ "مریں گے ہم کتابوں پر ورق ہوں گے

کفن اپنا"، مگر مسعود صاحب نے صحیح معنوں میں کتابوں پر ہی دم توڑا تھا۔

شادی خانہ آدی کے بعد اپنا مکان بنانے کی فکر ہو گئی تھی خوبیٔ قسمت سے اپنی پسند کا مکان مل گیا اور اسے خرید لیا۔ پھر اپنی مرضی کے مطابق اس میں ترمیم و تنسیخ کر کے جوہری محلہ سے وہیں منتقل ہو گئے تھے جہاں آخری گھڑی تک قیام کیا۔ اس مکان میں منتقل ہونے کے بعد یا غالباً کچھ ہی دن قبل ایک واقعہ ایسا رونما ہوا جو بہت یاد آتا ہے۔ یونیورسٹی میں ان کی ترقی ہوئی اور وہ شعبۂ اردو و فارسی کے صدر مقرر ہوئے۔ اُن کے محکمہ میں ایک بزرگ اپنے کو اس عہدہ کا زیادہ مستحق سمجھتے تھے۔ اُس زمانہ میں پنڈت جگت نرائن ملا یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ اُن بزرگ نے یہ سمجھ لیا کہ پنڈت جی نے مسعود صاحب کی طرفداری کی ہے اور ایک مضمون روزنامہ "حقیقت" میں شائع کرا دیا۔ اتفاق سے میری نظر پڑ گئی۔ میں نے فی الفور اس کا جواب شائع کرایا چنانچہ میرے اور ان کے درمیان اچھا خاصہ مذاکرہ ہو گیا تب ایک روز مسعود صاحب میرے پاس آئے اور کہا کہ یہ بحث مناسب نہیں ہے: "اوّل تو میں اپنی تعریف کرانے کا قائل نہیں ہوں دوسرے یہ کہ ایسی بحثیں یا تو مذہب کے رنگ میں رنگ دی جاتی ہیں یا ذاتیات تک بڑھ جاتی ہیں"۔ مجھ سے انھوں نے بہت اصرار کیا کہ میں خاموش ہو جاؤں مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ وہ بحث اسی منزل تک جا کر ختم ہوئی جس کا اُن کو خدشہ تھا۔ مگر اُس کا صحیح معنوں میں اختتام اس طرح ہوا کہ اُنھیں بزرگ کا انتقال ہو گیا۔ مسعود صاحب بہر حال اتنی خاموش طبیعت کے انسان تھے کہ اپنی ذات سے متعلق کوئی تبصرہ خواہ اُن کی موافقت ہی میں کیوں نہ ہو وہ اخبارات یا کسی پبلک مظاہرہ میں پسند نہیں کرتے تھے۔ البتہ خاص ادبی بحثوں میں بہت دلیر تھے۔

مسعود صاحب نے بیاسی برس کی عمر پا کر انتقال کیا اور یہ بیاسی برس گوشہ نشینی میں نہیں گزارے تھے۔ یونیورسٹی میں افسروں، ماتحتوں، رفیقوں، طالب علموں سے ان کو نباہ

کرنا پڑا۔ دوست بہت کم تھے مگر جن سے تعلقات تھے مستقل تھے۔ راہ و رسم بھی بہت سے لوگوں سے تھا، شہر و بیرون شہر بیشمار لوگوں سے روابط تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کو لاتعداد مرتبہ خلافِ مزاج باتیں سننے کا موقع ملا ہوگا۔ بہت سے ایسے مواقع آئے ہوں گے جب دوسروں کے ہاتھوں اُنھیں اذیتیں اٹھانا پڑی ہوں گی لیکن آج غالباً کوئی ایسا شخص نہیں ملے گا جو یہ کہہ سکے کہ مسعود صاحب کی زبان سے کوئی کلمہ شکایت کا اس نے سنا ہو اور نہ کوئی دوست یا عزیز ایسا ہوگا جو یہ کہہ سکے کہ اُن کی ذات سے اُسے کوئی تکلیف پہونچی ہو۔ تنہائی اور یک گونہ گوشہ نشینی میں زندگی بسر کرنے والے تعلقات و مراسم کی الجھنوں سے ضرور محفوظ رہ سکتے ہیں لیکن دنیا میں رہ کر بے نیازانہ زندگی بسر کر لے جانا مشکل کام ہے۔ وہ اپنی زندگی کی بہت بڑی مدت تک شہر لکھنؤ میں رہے اور آخری تخمیناً پچاس برس اس شہر کے اُس علاقہ میں قیام پذیر رہے جو مسلمانوں کے دو فرقوں کے باہمی اختلافات کا اکھاڑہ ہے۔ وہ سارا دور جو زبردست خلفشار کا زمانہ تھا مسعود صاحب نے برابر انھیں محلوں میں گزارا تھا لیکن نہ کسی معاملہ میں دلچسپی لی اور نہ اپنے تعلقات کسی سے خراب ہونے دیے۔ مذہبی عصبیت تو درکنار ہر قسم کے مناقشہ سے علیٰحدگی اُن کی طبیعت کا خاصا تھا۔ ان کی زبان سے بھی کبھی کوئی ایسا کلمہ نہیں نکلا جو کسی کے لیے دل آزار ہو۔ سیاسیات کو انھوں نے ہمیشہ اختلافی موضوع سمجھا اس لیے سیاسیات سے ہمیشہ دور رہے۔ ادب، ادبیت اور ادبیات ان کی زندگی کا جزو لاینفک تھے۔

پرنس افسر الملوک بہادر
شاہانِ اودھ کی آخری یادگار

ناہنال اور دادھیال دونوں طرف سے شاہانِ اودھ سے منسلک ہونے کا شرف راقم کے خاندانوں کو حاصل تھا۔ میرے معرضِ وجود میں آنے سے قبل ہی انتزاعِ سلطنت ہو چکا تھا اس لیے ان جلیل المراتب اور گراں قدر بادشاہوں کی زیارت کا شرف مجھے حاصل نہیں ہوا البتہ بادشاہ اودھ کی آخری یادگار کی بارگاہ میں شرفِ حضوری کا موقع میری زندگی کا بہترین وقفہ تھا۔ جس کی یاد ہمیشہ برقرار رہے گی۔ میری مراد پرنس افسر الملوک مرزا محمد اکرم حسین بہادر سے ہے، جو جانِ عالم واجد علی شاہ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے اور صورت و سیرت میں اُن کے مشابہ تھے۔ مجھے خوش بختی سے ۱۹۳۶ء میں شرفِ زیارت و قدمبوسی کا سب سے پہلا موقع ملا تھا اور اس کے بعد ان کی وفات یعنی ۱۹۴۲ء تک تقریباً ہر سال کلکتہ جا کر ان کی ملاقات کی سعادت حاصل کیا کرتا تھا

آل انڈیا شیعہ پولیٹکل کانفرنس کے لکھنؤ میں مجوزہ اجلاس عام کا صدر تلاش کرنا بحیثیت جنرل سکریٹری کے میرا فریضہ تھا میں نے کوہاٹ پشاور، لاہور، دلی، پٹنہ اور مظفر پور کا مسلسل سفر کیا لیکن ہر جگہ ناکامی ہوئی ہماری کانفرنس کے مسلک کی بنیاد وطن پرور رجحانات اور انڈین نیشنل کانگرس کی حمایت پر استوار تھی وہ جداگانہ انتخاب کا زمانہ تھا اور عام انتخابات قریب تھے۔ اس لیے ہمارے سیاسی رجحانات کے حامل حضرات بھی ہم سے اتفاق نہیں کر سکتے تھے۔ بالآخر میں کلکتہ گیا اور ایک

مقدر بیرسٹر صاحب سے صدارت قبول کرنے کی استدعا کی جو انہوں نے مسترد کر دی۔ میری مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں کلکتہ میں بمقام میٹیا برج محب محترم نواب مرزا عابد حسین خاں کے یہاں فروکش تھا۔ انھیں کے ہمراہ میرے ایک دوسرے دوست نواب مرزا قاسم علی خاں المعروف بہ نواب آچھن صاحب مرحوم بھی رہا کرتے تھے نواب آچھن صاحب مرحوم نے مشورہ دیا کہ کلکتہ میں پرنس موصوف کی خدمت میں شرف باریابی حاصل کرنا چاہیئے۔ اس لیے کہ لکھنؤ کی مناسبت سے اور کوئی لکھنؤ کا صدر اُن سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ تجویز بہت اچھی تھی مگر میں اپنی ہمت کھو چکا تھا۔ بالآخر مقیں دونوں دوستوں کے اصرار پر میں نے فون پر وقت مانگا اور مجھے ان کے سکرٹری کیقباد مرزا نے فوراً طلب کیا۔

میں ہمت ہارے ہوئے تھا اور جائے قیام سے بالی گنج سرکلر روڈ کا جہاں پرنس موصوف کی کوٹھی تھی کافی فاصلہ تھا اس لیے میں نے اپنی رہنمائی کے لیے مرزا عابد حسین صاحب کو اپنا سہارا بنا لیا۔ مرزا صاحب ماشاء اللہ خوش گفتار اور سنجیدہ بزرگ ہیں اسی لیے ان کی معیت سود مند بھی تھی۔ چنانچہ ہم دونوں راستہ بھر یہی سوچتے اور غور کرتے رہے کہ عرض مدعا کس طرح کیا جائے مگر وہاں پہونچ کر ہم اپنے سارے منصوبے بھول گئے ان کے سکریٹری نے بالآخر پردے جا کر ان کے حضور ہم کو پیش کیا اور ہم دونوں اُن کا رونق افروز چہرہ دیکھتے ہی مسحور ہو گئے۔ وہ ایک لانبے مگر کم چوڑے تخت پر جس پر بہترین ایرانی قالین اور نفیس گاؤ تکیہ لگا تھا، رونق افروز تھے۔ دونوں طرف مخملی صوفے اور ہم رنگ وہم وضع کرسیاں تھیں انہوں نے رسمی صاحب سلامت کے بعد مجھ سے دریافت کیا کہ "فرمائیے کیسے زحمت کی" میں نے برجستہ جواب دیا کہ "سرکار! میرے آباؤ اجداد کی آپ کے بزرگوں نے عزت افزائی فرمائی تھی، میرا گوشت پوست اور حیثیت و نمود سب کچھ آپ کے اسلاف کا مرحمت کردہ ہے، اب میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اسی طرح میری عزت افزائی فرمائیں"۔ انہوں نے اتنا ہی سن کر کلمہ کی انگلی دانتوں میں رکھ کر فرمایا "ہا۔ آپ کیا فرما رہے ہیں مجھے شرمندہ نہ کیجیے کہئے تو! آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں کس قابل ہوں پھر بھی

میرے امکان میں ہوگا تو آپ کی بات رائیگاں نہ ہونے دوں گا۔ میں نے عرض کیا کہ میں آل انڈیا شیعہ پولٹیکل کانفرنس کا جنرل سکریٹری ہوں، آئندہ ماہ میں اس کا اجلاس عام بمقام لکھنؤ منعقد ہو رہا ہے اور ہماری ملت کے مقتدر حضرات میں کوئی بزرگ صدارت پر آمادہ نہیں ہوتے۔ انھوں نے پوچھا، "کیوں؟ آخر کیوں انکار ہے؟" میں نے جواب دیا کہ انتخابات سر پر ہیں ہمارا پلیٹ فارم کامیابی کے مواقع فراہم نہیں کرتا، ذاتی اغراض و مقاصد ان حضرات کو صدارت منظور کرنے میں مانع ہیں۔ انھوں نے فرمایا "یہ سچ ہے، مجھے نہ الکشن لڑنا ہے نہ میرے کچھ سیاسی اغراض ہیں۔ لیکن میں جاہل نہیں اجہل ہوں۔ آپ کسی اور کو جو مجھ سے بہتر ہو ایک بار اور تلاش کر لیجیے، کوئی نہ ملے تو میں حاضر ہوں۔" اس آخری فقرے نے میرے دل میں ایک ہمک پیدا کر دی اور میں نے بیتابانہ دست بستہ عرض کیا کہ "اب میں کہیں اور نہ جاؤں گا، سرکار ہی رضامندی مرحمت فرمادیں۔" پرنس موصوف نے ہنس کر فرمایا۔ "میری رضامندی آپ کے پاس ہے، اس کا مانگنا بیکار ہے۔" اس گفتگو کے تخمیناً دو گھنٹہ بعد تک ہمارا قیام ان کے حضور رہا۔ انھوں نے شہر لکھنؤ کے ایک ایک محلہ اور ایک ایک خاندان کا حال تفصیل سے دریافت کیا۔ اُن کی گفتگو سے پتہ چلتا تھا کہ ان کو لکھنؤ سے عشق ہے اور گو کہ ان کا اس شہر میں داخلہ ممنوع تھا اور اس ممانعت کے ختم ہو جانے کے بعد بھی وہ کبھی یہاں نہیں آئے تھے مگر یہاں کے جغرافیائی اور سماجی حالات کی ہو بہو تصویر ان کے پیش نظر تھی۔ رخصت ہونے کے قبل میں نے تحریری رضامندی کی درخواست کی جو انھوں نے فی الفور منظور فرمائی۔ میں نے جائے قیام پر آ کر تحریری درخواست ارسال خدمت کی اور اسی آدمی کی معرفت میرے حسب خواہش تحریری جواب آ گیا۔

آل انڈیا شیعہ پولٹیکل کانفرنس ایک بے بضاعت ادارہ تھا جس کے کارکن اس کو جان پر کھیل کر چلا رہے تھے۔ پرنس موصوف کو صدارت کے لیے آمادہ کر لیا تھا لیکن ان کے شایانِ شان استقبال اور ان کی تواضع کے مراحل بہت سخت تھے۔ مرحوم راجہ محمد امیر احمد خاں نے ان کی مہمان داری کی ذمہ داری از خود قبول فرمائی تھی۔ اور بٹلر پیلیس میں مناسب انتظامات شروع

کرادیئے تھے پھر بھی استقبال اور دوسرے لوازمات فراہم کرنے کی ذمہ داری میرے لیے بہت سخت تھی۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ ان کی تشریف آوری میں دس یا بارہ روز باقی تھے اس پریشان کن موقع پر میرے مرحوم دوست خواجہ اسد نے مشورہ دیا کہ بڑے بڑے پوسٹر کثیر تعداد میں چھپوا کر ہر ہر گلی، کوچہ اور سڑک پر لگوا دو لکھوا دے جانِ عالم واجد علی شاہ کی آخری یادگار کے استقبال کا انتظام خود ہی کریں گے۔ میں نے اس مشورہ پر عمل کیا اور دو روز میں شہر بھر کے اندر یہ پوسٹر چسپاں ہو گئے ہر پوسٹر کو پڑھنے کے لیے جگہ جگہ بلا تفریق مذہب و ملت لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ہمارے شہریوں کو ان پوسٹروں سے بھی اتنا قلبی لگاؤ تھا کہ ایک مدت تک ان کو کسی نے اپنے مقام سے جدا نہیں کیا۔ وہ چند دن گزرے جتنا جتنا وقت قریب آتا جاتا تھا یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہاں ہر دیوار اور یہاں کا ہر در اُن کو آغوش میں لے لینے کے لیے آمادہ ہے۔

پنجاب میل گیارہ بجکر کچھ منٹ کے بعد لکھنؤ پہونچتا تھا۔ میں نے انگلو انڈین اسٹیشن ماسٹر سے اپنے والنٹیروں کے بلا ٹکٹ داخلہ کی اجازت مانگی، پرنس موصوف کا ذکر کیا لیکن سیاسی کانفرنس کے ساتھ رعایت نہیں کی جا سکتی تھی اور صرف ایک درجن والنٹیروں کو داخلہ کی اجازت ملی اسی اثنا میں مجمع بڑھنے لگا اور پلیٹ فارم ٹکٹ فروخت ہونے لگے اور سارا اسٹاک ختم ہو گیا، پھر یہ ٹکٹ ہاتھ سے لکھے جانے لگے تھوڑی دیر بعد یہ بھی ناممکن ہو گیا رفتہ رفتہ پلیٹ فارم نمبر ایک اور بیرونی وسیع ہال استقبال کرنے والوں سے مملو ہو گیا۔ پھر پلیٹ فارم نمبر ایک سے دوسری طرف جانے والی سیڑھیاں بھی اس مجمع سے لبریز ہو گئیں۔ اس ہجوم کو دیکھ کر ریلوے افسران کو مجبوراً تمام پھاٹک کھول دینے پڑے عوام اور خواص جوق در جوق آ رہے تھے بعض اعلیٰ سرکاری افسران نے بھی اپنی کرسیاں خالی کر دی تھیں۔ انھیں مقتدر لوگوں میں چیف کورٹ کے بعض جج بھی شامل تھے۔ میل کے آنے تک زعمائے شہر اور مقتدر ترین افراد سے بھی تعارف کرانا محال ہو گیا تھا وہ تشریف لائے تو سب سے پہلے مرحوم راجہ صاحب محمود آباد نے نصف قد سے جھک کر سات تسلیمیں کیں

اور ہار پہنایا۔ چیف جج سر وزیر حسن، راجہ صاحب محمود آباد اور دوسرے گرامی قدر اور عالی مرتبت حضرات نے بڑی مشکل سے گھیرا ڈال کر ان کو موٹر پر سوار کیا۔ لیکن موٹر کا بڑھنا دشوار تھا اس لیے کہ آدمیوں کا ایک سمندر ہر طرف لہریں مار رہا تھا ہمارا کوئی ارادہ جلوس نکالنے کا نہ تھا مگر یہ جلوس نکل کر رہا۔ موٹر آہستہ آہستہ چلتی رہی اور محترم ترین ہستیاں خاموش کیا تھ اور گرد چلتی رہیں اتنا بڑا مجمع اور ایسا استقبال شہر لکھنؤ میں کبھی کسی کا نہیں ہوا۔ تعداد کے اعتبار سے عظیم الشان مجمع ضرور دیکھا گیا مگر شہر کے چوٹی کے باوقار اور جلیل القدر اصحاب بلا تفریق مذہب و ملت اتنی کثرت سے کبھی نہیں دیکھے گئے۔ وہ مجمع نہ تھا بلکہ محبت کا ایک پر خروش دریا تھا جو سیلاب پر آگیا تھا۔

پرنس موصوف کی روانگی کے بعد میں پلیٹ فارم پر پھر گیا تاکہ ان کے سکرٹری، ملازمین اور سامان کی روانگی کا انتظام کروں وہاں کوئی قلی نہیں ملا۔ ہم لوگ خود سامان لے کر باہر آئے تو کسی شکرم گاڑی، کسی تانگہ یہاں تک کہ کسی یکہ تک پر کوئی چلانے والا نہیں تھا سارے مسافر پریشان کھڑے تھے معلوم ہوا سب آدمی جلوس میں چلے گئے بالآخر محمود آباد ہاؤس قیصر باغ فون کر کے گاڑی منگوائی اور سب کو ساتھ لے کر لاٹوش روڈ کی طرف سے جاتے ہوئے دیکھا کہ وہ جلوس ہورٹ روڈ کی طرف سے آرہا ہے۔ میں نے وہ موٹر معہ ان کے ملازمین اور سامان کے ٹیلر پیلس روانہ کر دی اور خود جلوس میں شامل ہو گیا۔ یہ مجمع امین آباد پہنچا تو دکانداروں نے دکانیں چھوڑ کر جلوس میں شرکت کی۔ نظیر آباد سے قیصر باغ نظر آیا تو ایک کہرام مچ گیا زار و قطار لوگ رو رہے تھے اور ایک تہلکہ مچا ہوا تھا راجہ صاحب محمود آباد نے نہایت ہوشمندی کے ساتھ موٹر بڑھوائی اور قیصر باغ میں اُن کو اتار کر جلوس ختم کر دیا۔ مگر مجمع قابو میں نہ تھا دوڑتے ہوئے ہزاروں آدمی پہنچ گئے۔ پرنس بالاخانہ پر تھے اور نیچے سے آوازیں بلند ہو رہی تھیں "مہاراج ایک مرتبہ اور درشن کرا دو" وہ بالکنی پر آئے اور خالص لکھنوی زبان لہجہ اور طرز میں فرمایا "آپ کو بڑی زحمت ہو رہی ہے، اب آپ صاحبان زیادہ تکلیف نہ اٹھائیں" یہ کہہ کر بلا تاخیر کمرہ میں واپس چلے گئے۔

پرنس موصوف نے کمرہ میں داخل ہوتے ہی مجھے یاد کیا اور راجہ صاحب سے فرمایا کہ

مرزا جعفر حسین کہاں ہیں ان کو بلوائیے" کوٹھے سے مجھے پکارا گیا اور میں بیتابانہ پہونچا تو دیکھا کہ وہ خود ایک کرسی پر رونق افروز ہیں اور تمام رؤسا و عمائدین شہر فرش زمین پر بیٹھے ہیں شہر لکھنؤ کی یہ وہ تہذیب تھی جس پر آج بھی ہم کو ناز ہے بادشاہ ہو یا شہزادہ اس کے برابر کوئی رئیس یا عمائدین میں کوئی بھی نہیں بیٹھ سکتا تھا یہ شرف اور سعادت بخشی جاتی تھی کسی کو بھی حاصل نہیں تھی برابر بیٹھنا تو درکنار راجہ صاحب نے ان کی طرف کبھی پیٹھ نہیں کی ان کے دوران قیام میں وہ جب بھی تشریف لائے تو فرش ہی پر بیٹھے اور الٹے پاؤں واپس ہوئے مجھے معلوم ہوا کہ مرحوم مہاراجہ صاحب جب کبھی کلکتہ جاتے تو پرنس موصوف کی خدمت میں ضرور حاضری دیتے اور یہی آداب ملحوظ رکھتے تھے۔

اس وقت وہ سب کی نظر میں آخری تاجدار اودھ کے نمائندے تھے میں نے جن الفاظ میں عزت افزائی کی خواستگاری کی تھی وہ ان کو برابر یاد رہے اور ہر ہر موقع پر میری دلجوئی فرماتے رہے۔ چنانچہ میرے پہونچتے ہی انہوں نے ہاتھ پکڑ کے مجھے پہلو والی کرسی پر بٹھایا اور فرمایا مجھے آپ نے دل کھول کر پریشان کر دیا اب تو آپ خوش ہو گئے جہاں مجھے ٹھہرانا ہو وہاں پہونچا دیجئے" راجہ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور ہم سب نے انھیں بٹلر پیلس کے لیے رخصت کیا جتنے لوگ حاضر تھے زار و قطار رو رہے تھے سب کو مخاطب کر کے فرمایا "آپ لوگ میری طرف دیکھیے میں تو خوش ہوں آپ کیوں رو رہے ہیں سلطنت کبھی ایک خاندان میں نہیں رہتی کل ہمارے پاس تھی آج دوسروں کے پاس ہے اور کل پھر کسی اور کے پاس چلی جائے گی انہوں نے یہ فرمایا تو مگر ان کا سرخ و سفید چہرہ زرد تھا بٹلر پیلس پہونچ کر وہ فوراً آرام کے لیے لیٹ رہے۔ شام کو سبجکٹس کمیٹی کی میٹنگ تھی میں ان کو لینے گیا تو پتہ چلا کہ اس وقت سے برابر منہ ڈھانکے آرام فرما رہے ہیں نہ لنچ کھایا نہ شام کی چائے اور نہ غسل کی ضرورت کی طرف متوجہ ہوئے ملازمین اور سکریٹری بیحد پریشان تھے لیکن سوئے ادب مانع تھا کوئی جگانے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔ لہذا میں خود کمرے میں داخل ہوا اور لحاف کے اوپر سے آہستہ آہستہ ان کے پیر دبانے لگا وہ اٹھ کر بیٹھ گئے فرمایا کہ آپ کیا کر رہے ہیں اس طرح مجھے کانٹوں پر نہ گھسیٹیے میری استدعا پر اٹھے

نے بستر چھوڑا اور اپنے روزمرہ کی ضروریات کی طرف متوجہ ہوئے سبجکٹس کمیٹی کی صدارت کے لیے ان کو زحمت دینا اُن حالات میں مناسب نہ معلوم ہوا اس لیے دوسرے روز علی الصبح حاضر ہونے کی اجازت لے کر میں رخصت ہو گیا پرنس افسر الملوک نے تشریف آوری کے دوسرے اور تیسرے روز کانفرنس کے اجلاس ہائے عام کی پورے شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ صدارت فرمائی تھی۔ رفاہ عام میں اجلاس ہوتا اور دونوں جانب دالانوں اور کھلے ہوئے میدانوں میں شہریوں کا مجمع لگا رہتا تھا پہلے اجلاس میں صدارت کی تحریک کرتے ہوئے مرحوم مولانا سید احمد صاحب المعروف بہ علامہ ہندی نے فرمایا تھا کہ میرے مورثِ اعلیٰ بادشاہانِ اودھ کو تخت نشینی کے موقع پر تاج پہنایا کرتے تھے ہم فقیر ہیں ہمارے پاس کچھ باقی نہیں رہا ہے ایک کرسی صدارت ہے جو ہم آپ کو پیش کرتے ہیں۔ ان کا اشارہ اس رواج کی طرف تھا کہ شاہان اودھ کو تخت نشینی کے وقت خاندان اجتہاد کے جلیل القدر مجتہد ہی تاج پہناتے تھے۔ علامہ ہندی بھی اسی خاندان کی ایک فرد تھے اس تقریر نے حاضرین کو بہت متاثر کیا تھا۔ پرنس موصوف نے تمام صدارتی فرائض پوری سنجیدگی کے ساتھ انجام دیئے اور ان کی موجودگی کے سبب سے اختلافی مسائل میں بھی متانت و تہذیب کا دامن کسی کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔

جناب موصوف کا شہر لکھنؤ میں پانچ روز تک قیام رہا اور یہ پانچوں دن مصروفیت میں گزرے۔ اسی زمانے میں ایک عظیم الشان نمائش سرکاری اہتمام سے ہو رہی تھی۔ پرنس موصوف کو مدعو کیا گیا۔ سر جے پی سریواستو حکومت وقت کے رکن رکین تھے وہ خود بہ نفس نفیس تشریف لائے اور پورے عزت و احترام پرنس کو نمائش دکھانے کے لیے لے گئے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ جو صنعت و حرفت کے ایک کیمپ میں جہاں مجسمے نصب تھے، رونما ہوا۔ بہت نصیحت آموز تھا۔ پرنس کو صنعت و حرفت سے ذوق اور مجسموں سے دلچسپی تھی۔ انہوں نے لارڈ لنلتھگو کے مجسمہ کو غور سے ملاحظہ کیا اور وہاں کے ذمہ دار افسر سے کچھ گفتگو فرمائی جو صنعت کی باریکیوں سے متعلق تھی وہاں دو نوجوان بھی موجود تھے۔ انہوں نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کچھ رائے زنی کر دی

پرنس نے ان کی طرف دیکھا اور صرف "ماشاء اللہ" کہہ کر خاموش ہو گئے۔ پرانے لکھنؤ کی تہذیب میں نوجوان بالخصوص اجنبی نوجوانوں کا بزرگوں کی بات کاٹنا بالخصوص بات کاٹ کر اختلاف کرنا ایک گناہ عظیم تھا۔ اس گناہ کی سرزنش میں پرنس نے "ماشاء اللہ" فرمایا۔ یہ کلمہ اپنی جگہ پر طنز، سرزنش اور تہدید سب ہی کچھ تھا مگر دائرہ تہذیب کے اندر۔ لیکن زمانہ اتنا بدل چکا تھا کہ اس جامعیت کلام کو کوئی سمجھ نہیں سکا۔

شہر لکھنؤ نے ان کے اکرام و مرتبہ شناسی میں کوئی کمی نہیں کی۔ میونسپل بورڈ نے ایڈریس پیش کیا، انجمن وثیقہ داران نے استقبال کیا۔ شہزادگان اور خاندان شاہی کے ارکان نے سپاسنامہ حاضر کیا، حسین آباد مبارک کی جانب سے شاہی جلوس نکالا گیا۔ آگے آگے ماہی مراتب اس کے بعد عصا بردار چاندی کے طویل القامت عصا لیے ہوئے، پیچھے حسین آباد کے تینوں متولی اور شاہی ادارات کے تمام اہل کار اور ایک چتر زر کے سایہ میں وہ خود رونق افروز تھے۔ جلوس پکچر گیلری میں ختم ہوا اور ان کو زرنگار کرسی پر صدر محفل کی منزلت حاصل ہوئی رسمی کارروائی عمل میں آئی لیکن ہر موقع پر خلوص و مہر و وفا کے جذبات کارفرما رہے۔ لیکن جو بات راقم کبھی فراموش نہیں کر سکتا وہ ان کی میرے حال پر ذرہ نوازی تھی کسی مقام پر مجھ کو اپنے سے دور رہنے کی اجازت نہیں دی۔ یہ پاس داری یہ لحاظ اور یہ رکھ رکھاؤ ہمارے شہر لکھنؤ کے رؤسا و عمائدین بالخصوص شاہانِ اودھ کے اعلا کردار بلند اخلاق کی ایک گراں قدر عملی مثال تھی۔

ان تقریبوں اور اجتماعی نشستوں کے علاوہ ان کے کچھ ایسے پروگرام بھی رہے جن میں مجھے شرکت کا موقع نہیں ملا۔ وہ رات کو کھانا نوش کرنے کے بعد مجھ سے بعض محلوں کا پتہ دریافت کر کے صرف اپنے سکریٹری کے ہمراہ موٹر پر دو دو گھنٹے باہر رہتے تھے۔ اتنا پتہ چل سکا کہ وہ ان محلوں میں ٹہل کر لوگوں سے گفتگو کرتے۔ یہ وہ محلے تھے جو شاہی دور میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ دو مرتبہ دوپہر کو ان سے کچھ صاحبان ملنے بھی آئے اور انہوں نے تخلیہ

میں ملاقاتیں کیں یہ وہ زمانہ تھا جب شرفائے لکھنؤ پر پوری طرح فلاکت آ چکی تھی اس لیے اس نتیجہ تک پہنچنا سہل ہے کہ وہ رات کو حالات دریافت فرماتے اور دوسرے دن لوگوں کی حاجت روائی کرتے تھے انکے طور طریقے میں جو صورت حال بالکل واضح تھی وہ انکے رکھ رکھاؤ اور پاس دلحاظ تھا خصوصیت کے ساتھ انہوں نے حسب، نسب، شرافت و نجابت اور کبر سنی کے ساتھ برتا تھا انھیں آنیوالوں میں ایک سید النسب معمر بزرگ تھے جن کو انہوں نے دیر تک بٹھایا اور کرسی سے کھڑے ہو کر رخصت کیا تھا۔ ان غریب شرفا کے محلوں کے علاوہ ہر روز کسی نہ کسی طرح وقت نکال کے خواہ وہ چند منٹ ہی کے لیے کیوں نہ ہو۔ ماسٹر محمد احمد صاحب مرحوم کے یہاں ضرور جاتے تھے۔ ان بزرگ سے میری بھی دوستی تھی اور پرنس موصوف کے اس شہر میں واحد دوست تھے۔ محمد احمد صاحب میونسپلٹی کے وکیل تھے اور بے مثال خوبیوں کے حامل تھے۔ ہر سال سیر و تفریح کے لیے کلکتہ جاتے تھے۔ وہیں کی ملاقات اور پرنس سے بے تکلفانہ دوستی تھی۔ شہر لکھنؤ سے روانگی کے وقت انہوں نے سختی کے ساتھ حکم دے دیا تھا کہ اسٹیشن پر رخصت کرنے کوئی نہ جائے چنانچہ صرف ہم تین آدمیوں نے ان کو رخصت کیا تھا میرے علاوہ ماسٹر محمد احمد مرحوم اور نواب زادہ ہمایوں جاہ تھے جن سے ان کے عزیزدارانہ تعلقات اور خوردی و بزرگی کا رشتہ تھا۔

یادش بخیر اس زمانہ میں ہر سال اور کبھی کبھی دو بار یا اس سے بھی زیادہ کلکتہ جانا ہوتا تھا دلجمعی اور تفریحی مشاغل کے لیے وہی شہر میرا مرکز تھا۔ اس کے علاوہ اسی سرزمین پر مولانا آزاد مرحوم سے بھی ملاقاتیں ہوتی تھیں جن کی ذات گرامی سے ہر شعبہ حیات میں مجھے رشد و ہدایت حاصل کرنے کا فخر حاصل ہے۔ ۱۹۴۷ء میں یعنی متذکرہ بالا اجلاس کانفرنس کے بعد انتہائی عجلت میں صرف دو روز کے لیے کلکتہ جانے کا اتفاق ہوا اولاً مولانائے محترم کی خدمت میں حاضری دی اور اس کے فوراً بعد پرنس موصوف کے یہاں ہمہ تن اشتیاق بنا ہوا پہنچا ان دونوں بزرگوں کی کوٹھیاں ایک دوسرے سے بہت قریب تھیں پرنس موصوف اس وقت کہیں تشریف لے جانے کے لیے بالکل تیار تھے مگر مجھے اذن حضوری ملا چند منٹ

کی گفتگو کے بعد دوسرے روز شام کو کھانے پر مدعو کیا میں نے معذرت پیش کی اس لیے کہ اسی رات کو مجھے لکھنؤ واپس ہونا تھا مگر میری معذرت قبول نہ ہوئی۔ انھوں نے سرِ شام ہی حاضر ہونے کا حکم دیا۔ اور یہ وعدہ فرمایا کہ وہ اپنے یہاں سے براہِ راست اسٹیشن بھیجنے کا میرے لیے انتظام فرما دیں گے۔ تعمیلِ ارشاد میرا فریضہ تھا چنانچہ دوسرے روز میں پہنچا تو وہ خود میرا انتظار فرما رہے تھے۔ اس ملاقات میں انھوں نے اپنے قریبی اعزا بالخصوص اپنے بھتیجوں کے حالات بڑے دکھ بھرے لہجے میں سنائے اور مجھ سے لکھنؤ والوں کے معاملات بالخصوص ہماری تباہی و بربادی کے واقعات سنے اور محزون و مغموم ہو گئے۔ بالآخر کھانے کا وقت آگیا۔

پرنس کے کھانا کھانے کا کمرہ نہ وسیع تھا اور نہ کوئی خاص سامان آرائش و زیبائش کا تھا، صرف سادگی اور صفائی تھی۔ بہت اونچے اونچے اگالدان شائستہ طرز سے لکڑیوں میں نصب تھے اور ہاتھ دھونے کے لیے سلفچیاں بھی تھیں لیکن پرانے طرز کے دسترخوان اور زمین پر فرش کے بجائے کرسیاں اور میز کا انتظام تھا زیادہ سے زیادہ بارہ کرسیاں تھیں اور اس وقت صرف تین آدمی شریکِ طعام تھے تیسرے صاحب انھیں کے سکریٹری مسٹر کیقباد مرزا تھے۔ کمرہ میں داخل ہونے کے قبل ہی پوری میز انواع و اقسام کے کھانوں سے چن دی گئی تھی کئی قسم کا پلاؤ، کئی طرح کے میٹھے چاول، دو یا تین طرح کا قورمہ، چار اقسام کا قیمہ جن میں ایک قیمہ نخود اور دوسرے میں انگور یا سیب شامل تھے، کباب متعدد اقسام کے خشک اور شوربے دار تھے، پوریاں، پراٹھے اور لکھنؤ طرز کی چند چپاتیاں بھی موجود تھیں جن برتنوں میں کھانا لگایا گیا تھا نیز جن میں ہم نے کھایا وہ سب نفیس چینی کے قیمتی مگر سادہ اور خوش رنگ تھے۔ ہمارے بیٹھتے ہی اندر سے مخصوص چیزوں کا آنا شروع ہوا۔ ایک بڑی قاب میں شیرمالیں اور ایک بڑی پلیٹ میں کباب تھے۔ پرنس نے فرمایا کہ "یہ شیرمالیں اور کباب آپ کے لکھنؤ کے کھانے ہیں۔ والد مرحوم کے ہمراہ جو باورچی آئے تھے ان کی اولاد اب بھی موجود ہے اور

انھوں نے مٹیا برج میں دکانیں کھول لی ہیں۔ یہ چیزیں وہیں سے پکوائی ہیں"۔ حقیقتاً دونوں چیزیں بیحد لذیذ اور نفیس تھیں، اور ویسی شیرمالیں اور کباب اس وقت ہمارے شہر سے معدوم ہو چکے تھے۔ اسی اثنا میں دوسرا آدمی ایک ڈش میں مرغ کا قورمہ لایا جس کی دور ہی سے خوشبو فرح بخش تھی رنگ روغن، ذائقہ اور مسحور کر لینے والی نفاست ہو بہو وہی تھی جو لکھنؤ کے مشہور قورمہ کا طرۂ امتیاز تھا۔ انھیں غذاؤں سے سیری ہو چکی تھی لیکن آداب دسترخوان ملحوظ رکھتے ہوئے اِدھر اُدھر کی چیزوں سے دو دو لقمے کھانے پڑے۔ بالآخر وہ میٹھی چیزیں آئیں جس کا مثل و نظیر نہیں تھا۔ یعنی اناس کا مزعفر اور بالائی۔ دیسی بالائی ہمارے شہر سے رخصت ہو چکی تھی اور مزعفر ایسا تھا کہ میں اپنے خاندان کا مشہور و معروف مزعفر بھول گیا۔ اس کے بعد چاندی کے خاصدان میں نہایت خوشنما گلوریاں اور ایک چاندی کی ڈبیہ میں خانہ ساز قوام کا تمباکو پیش کیا گیا۔ ہر چیز شاہی تزک و اہتمام سے تیار ہوئی تھی اور پیش کی گئی تھی لہذا تعریف و توصیف عبث ہے۔ کھانے سے فراغت کر کے رخصت چاہی تو انھوں نے سکریٹری کی طرف اشارہ کیا ایک چاندی کی ڈھکی ہوئی کشتی آئی ان میں سے ایک کارچوبی امام ضامن نکال کر میرے داہنے بازو پر انھوں نے خود باندھا جس کے معنی تھے کہ میرے بخیریت گھر پہنچ جانے کے لیے حسب دستور قدیم یہ رسم ادا کی گئی تھی۔ شہر لکھنؤ میں غربا کے یہاں امام ضامن میں ایک پیسہ اور رؤسا کے یہاں عموماً ایک روپیہ اور ایک پیسہ ہوا کرتا تھا یہ رقم سفر ختم ہوتے ہی خیرات کر دی جاتی تھی پرنس نے جو امام ضامن باندھا تھا اس پر کارچوبی حروف میں فی امان اللہ لکھا تھا اور اس کے اندر ایک روپیہ اور ایک گنّی تھی۔

دوسرے برس یعنی ۱۹۳۶ء میں پھر کلکتہ جانا ہوا تو پرنس موصوف کی خدمت میں بازراہ اشتیاق حاضری دی۔ اس مرتبہ میرے بہت پرانے دوست اور عربی اسکول کے ہم درس ڈاکٹر سید اعجاز حسین جعفری مظفر پوری ہمراہ تھے ان کو بھی پرنس موصوف کی خدمت میں شرف باریابی کی بڑی تمنا تھی۔ ڈاکٹر صاحب اپنے سیاسی مسلک میں میرے ہی ہم عقیدہ تھے

اوران کو بات کرنے کا بھی بڑا ملکہ تھا۔ پرنس ان سے بیحد اخلاق سے ملے اور دونوں میں اچھی گفتگو ہوئی لیکن سیاسیات کے موضوع پر پرنس کوئی بات کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بالآخران دونوں کے درمیان ادبیات زیر بحث آئے اور امرا القیس اور متنبی پر تبادلہ خیالات ہونے لگا۔ اس وقت مجھے یہ محسوس ہوا کہ پرنس کی عربی دانی بھی بڑے پایہ کی ہے انگریزی بولنے اور لکھنے میں وہ کامل مہارت رکھتے تھے لیکن فارسی اور عربی ادب میں بھی پوری دستگاہ حاصل تھی۔ تخمیناً دو گھنٹوں کے بعد ہم لوگوں نے رخصت چاہی تو انہوں نے دوسرے روز صبح کو ناشتہ پر مدعو کر لیا۔ مجھ سے خصوصیت کیساتھ یہ فرمایا کہ کل صبح کو میں آپ کو اپنے ایک دوست مسٹر سی۔ اے محمد سے ملاؤں گا۔ یہ صاحب عربی النسل ہیں مگر لکھنؤ کے دسترخوان کے گرویدہ ہیں۔ میں ان کو بھی کبھی کچھ کھلا دیتا ہوں۔ یہ کہا اور مسکرائے۔ ہم لوگ رخصت ہوئے دوسرے روز وقت مقررہ پر ہم لوگ پہنچے تو مسٹر محمد وہاں موجود تھے۔ پرنس نے ہمارا ان سے تعارف کرایا۔ یہ بزرگ ایک بڑے تاجر اور صاحب حیثیت اور معتقد بزرگ تھے۔ بے حد کم گو تھے۔ اب ناشتہ کا وقت آچکا تھا۔ اس وقت کھانے کی میز پر شیرمال، خمیری روٹی، پسندے کے سیخ کباب اور شب دیگ ہمیں پیش کی گئی یہ شب دیگ طیور کے گوشت میں تیار ہوئی تھی جس میں تیتر اور بٹیر کا گوشت یقیناً تھا۔ اس کے علاوہ تیسرا گوشت کس طائر کا تھا اس کا پتہ ہم لوگ نہیں چلا سکے اور نہ دریافت کرنے کی جسارت ہوئی۔ شیرینی میں امرتیاں اور بالائی تھی۔ امرتیاں اتنی بڑی تھیں کہ پوری پلیٹ کی جسامت ایک ایک امرتی کے برابر تھی۔ دوران طعام میں گوشت کے کھانوں کا تذکرہ آیا۔ تو مسٹر محمد نے ہم دونوں دوستوں کو "لحم و لبن" پر مدعو کیا۔ اس غذا کا ہم نے نام بھی نہیں سنا تھا اور اس کے کھانے کا بیحد اشتیاق تھا۔ مگر اسی روز دوپہر کو مظفر پور میں ڈاکٹر جعفری کی اہلیہ کا دفعتاً انتقال ہو گیا۔ خبر ملتے ہی وہ بہار چلے گئے اور یہ دعوت رہ گئی۔

ڈاکٹر جعفری سے میرے گہرے روابط تھے اور برابر خط و کتابت رہتی تھی۔ ان

سے سال بھر تک پرنس کی شب دیگ اور مسٹر محمد علی موعودہ "لحم دلہن" والی دعوت پر مراسلت ہوتی رہی اور یہ طے ہوا کہ نومبر ۱۹۳۹ء میں "لحم دلہن" کھایا جائے گا اور پرنس سے دوبارہ شب دیگ کھلانے کی فرمائش کی جائے گی لیکن یہ سارے منصوبے ناکام ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب بعض الجھنوں میں پھنس کر کلکتہ نہیں جا سکے۔ مجھے ان کی معذوریوں کا علم وہاں پہنچ کر ہوا۔ پرنس کی خدمت میں حاضر ہوا لیکن ان کو دیکھ کر دل بجھ گیا۔ وہ علیل تھے لیکن اخلاقاً مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ اس مرتبہ میں بھی ان کا موضوع سخن لکھنؤ اور اہالیان لکھنؤ تھا۔ دیر تک باتیں ہو

میں برابر ان کی نقاہت کا اندازہ کر کے رخصت ہونے کی اجازت مانگتا رہا مگر وہ مجھے اٹھنے نہیں دیتے تھے اس ملاقات میں پہلی بار میں نے یہ محسوس کیا کہ ان کے پاس لاتعداد ملازم ہیں ہر کام کیلئے علیحدہ نوکر ہے لیکن تیمارداری یا مزاج پرسی کے لئے کوئی عزیز نظر نہیں آتا عورتوں کا وجود خصوصیت کے ساتھ مفقود تھا

اب مجھے یہ بھی یاد آیا کہ ان کے محل میں پہلے بھی میں نے کبھی کسی بچہ کو نہیں دیکھا تھا اور نہ کسی خواص یا کنیز کی کبھی آواز سنی تھی۔ حتی کہ محلدار بھی کوئی کبھی نہیں تھی۔ اتنی ملاقاتوں میں بہت کچھ گستاخ ہو چکا تو تھا اپنی دبی زبان سے دریافت ہی کر لیا کہ کیا زنانخانہ یہاں سے فاصلہ پر ہے؟ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا کہ میرے پاس صرف یہی ایک کوٹھی ہے میں نے ہمت کر کے پھر پوچھا کہ حضور کے محلات کہاں رہتے ہیں؟ برجستہ جواب ملا کہ "میں نے کوئی شادی نہیں کی۔" مجھ سے خاموش نہیں رہا گیا اور بے ساختہ کہہ گیا کہ اہل و عیال بڑی نعمت ہوتے ہیں بیماری میں انہیں سے دل بہلتا ہے انہوں نے ایک مخصوص طرز اور اپنے حزین لہجہ میں صرف اتنا فرمایا کہ "میں نے غلام پیدا کرنا پسند نہیں کیا" اور خاموش ہو گئے۔ میں ایک لفظ بھی زبان سے نہیں کہہ سکا لیکن ان کے اس فقرے کی معنویت ایک جانگداز مرثیہ بھی تھی جو اب بھی کلیجہ ہلا دینے کے لئے کافی ہے۔ میری ان سے وہ آخری ملاقات تھی۔ اسی بیماری میں انہوں نے انتقال فرمایا

تمت